حیات

امام احمد بن حنبلؒ

تالیف

محمد ابو زھرہ

پروفیسر لا کالج، فواد یونیورسٹی، مصر

ترجمہ

سید رئیس احمد جعفری

المکتبۃ السلفیۃ شیش محل روڈ لاہور

لنحیینہ حیوۃ طیبۃ

حیاتِ امام احمد بن حنبلؒ

1283

حضرت امام احمد بن محمد بن حنبلؒ کے حالات وسوانح،
امام صاحب کے زمانہ، ان کے افکار، اور فقہ اسلامی،
میں حنبلی فقہ کی امتیازی حیثیت کا تن

تالیف

محمد ابو زھرہ

پروفیسر قوانین اسلامی لا کالج، فؤاد یو

ترجمہ

سید رئیس احمد جعفری ندوی،

تعلیقات وحواشی

محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

ناشر

المکتبۃ السلفیۃ شیش محل روڈ - لاہور

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۸

مصنف .. .. محمد ابوزہرہ (مصر)

ترجمہ .. .. سید رئیس احمد جعفری ندوی

طابع .. .. عبدالرحمٰن گوہردی

مطبع .. .. اشرف پریس، لاہور

ناشر .. .. المکتبۃ السلفیہ، لاہور

مجلد .. .. [redacted] روپے

(جملہ حقوق نقل و ترجمہ محفوظ)

طبع اوّل .. .. اکتوبر ۱۹۵۶ء

طبع ثانی .. .. ستمبر ۱۹۵۷ء

طبع ثالث .. .. جولائی ۱۹۶۱ء

قال الامام الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ

احمد!
امامٌ فی ثمان خصال۔
امام فی الحدیث
امام فی الفقہ
امام فی اللغۃ
امام فی القرآن
امام فی الفقر
امام فی الزہد
امام فی الورع
امام فی السنۃ

(طبقات الحنابلہ لابن ابی یعلیٰ)

فہرست مضامین

سخنہائے گفتنی	۲۷	تاریخ ولادت و وفات	۴۹
پیش لفظ	۳۳	نسب	۵۰
افتتاحیہ	۳۷	قبیلۂ شیبان	〃
ـــــ حصہ اول ـــــ		حضرت امام کے والد اور دادا	۵۱
تمہید ۔ ۴۱ — ۴۸		خلافت عباسیہ اور حضرت امام کا خاندان	۵۲
علوم تربیت	۴۱	حضرت امام کا کردار بلند	〃
شخصیت کا اجمالی خاکہ	۴۲	ثمر فرس	۵۳
کیا امام احمدؒ فقیہ نہ تھے؟	۴۳	قسمات النبی	۵۴
اس رائے پر ایک نظر	۴۴	امام شافعیؒ سے مناسبت	۵۵
بجائے فقہ کے حدیث میں شہرت پانے کی وجہ	〃	خلق کریم اور مسلک کریم	〃
حضرت امام کی طرف بعض غلط انتساب	۴۶	فقر و قناعت	۵۶
فقہ حنبلی کی حیثیت	〃	امام صاحب کی تربیت	〃
(۱) ـ پہلا عنصر	〃	قابل رشک خصائص	۵۷
(۲) ـ عنصر ثانی	۴۷	ہیثم بن جمیل کا قول	〃
حیات امام احمد بن حنبلؒ ۴۹ — ۹۲		مسلک کا انتخاب	۵۸
مولد و منشأ	۴۹	فقہ کی دلیل حدیث سے	۵۹

بغداد کی علمی اہمیت ٦٠
حجازِ مقدس کا سفر ٦١
طلبِ حدیث کا کام "
سماعتِ حدیث ٦٢
ماں کی ماتا ٦٣
طلبِ علم میں دور دراز مقامات کے سفر "
مشکلات و مصائب ٦٥
قناعت اور خودداری ٦٦
امام شافعیؒ کا تعلقِ خاطر "
تحریر و تدوینِ احادیث ٦٩
حرف یادداشت میں غلطی کا امکان ہے "
نقدِ حدیث ٧٠
امام شافعیؒ کی عظمت ٧١
نقد و استنباط سے دلچسپی ٧٢
اصحابِ رائے سے اختلاف ٧٣
جامع نقد و حدیث "
امام احمدؒ اور علومِ عصری ٧٤
امام احمدؒ فارسی جانتے تھے ٧٥
بادیہ پیمائی اور جہاں گردی ٧٧
نقص اور اس کی تلافی "
سندِ تحدیث و افتاء ٧٨
حزم و احتیاط ٧٨
اتباعِ سنّت کی دھن "
آنحضرتؐ سے ایک مناسبت ٧٩
کتمانِ علم سے احتراز "
شہرتِ عام کے مدارج ٨٠
حلقۂ درس و افتاء ٨١
استفادہ کرنے والوں کی قسمیں "
درس و تحدیث کی دو مجلسیں ٨٢
درس و تحدیث کا وقت "
چند اہم خصوصیتیں ٨٣
تلاش و تحقیق "
امام صاحب کی مجلس کی کیفیت ٨٤
مسند کا املا "
امام ابو حاکم رازی کا بیان "
امام صاحب کا اندازِ روایتِ حدیث ٨٥
فتاویٰ فقہیہ اور امام احمدؒ ٨٦
پیرویٔ سلف ٨٧
عربی عناصر پر عجمیت کا غلبہ ٨٨
مامون و امین کی کشمکش کا نتیجہ ٨٩
تخریب پسند عناصر "
امام صاحب کا قطعِ تعلق ٩٠

علمِ کلام کی موشگافیاں ٩٠
منہاجِ سلف کی طرف دعوت ٩١
منتق کا ہے کے تھے، ملا کیا؟ "

—— عہدِ ابتلا ——

امام صاحبؒ کا دورِ ابتلا اس کے اسباب اور ادوار ٩٥
٩٥ —— ١٠٢
مامون الرشید اور خلقِ قرآن ٩٥
خالد بن عبداللہ القسری ٩٦
جہم بن صفوان "
بشر بن غیاث ٩٧
ہارون الرشید اور معتزلہ "
مامون الرشید کا عہدِ خلافت "
جبر و جور کا آغاز ٩٨
مردانِ راہِ حق ١٠٠
مامون کی وصیت ١٠١
معتصم باللہ کا دورِ حکومت ١٠٢
مامون کا پہلا فرمان، بغداد کے نائبِ حاکم
اسحٰق بن ابراہیم کے نام۔ ١٠٣
١٠٣ —— ١٠٦
مامون کا دوسرا خط ١٠٧ —— ١١٨ ١٠٧
مامون کا تیسرا خط ١١٩
١١٩ —— ١٣٩
امام احمدؒ کا مقامِ رفیع ١٢٣
پس منظر ١٢٦
ابن ابی دؤاد کی ذمہ داری "
محاکمہ ١٢٧
معتزلہ کا یہ طرز انتقامی تھا؟ ١٢٨
قرآن کو قدیم کہنے کے نتائج ١٣٣
معتصم باللہ کا دورِ حکومت ١٣٥
واثق باللہ کا عجیب حکم ١٣٦
دوسرے ستم رسیدہ اصحابِ علم ١٣٧
تقیہ کیوں نہیں کیا؟ ١٣٨
امام صاحب کی معیشت اور طرزِ بود و ماند ١٤٠
١٤٠ —— ١٤٧
خودداری اور خودنگری ١٤٠
امام صاحب کی جائداد اور اس کی آمدنی ١٤١
امام احمدؒ کے وسائلِ حیات ١٤٢
معیشت اور کسبِ رزق ١٤٦
خلفاء کی مالی امداد قبول کرنے سے انکار ١٤٨
١٤٨ —— ١٥٦
امام شافعیؒ کی پیش کش رد کردی ١٤٩

قناعت اور استغنا ۱۵۰
امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا فرق ۱۵۱
خلیفہ متوکل اور امام احمدؒ ۱۵۳
اولاد اور رشتہ داروں کا مقاطعہ ۱۵۵
امام احمد کا علم ۱۵۷
۱۵۷ — ۱۵۹
عوامل مؤثرہ ۱۵۹
امام احمد کے صفات ۱۶۰
۱۶۰ — ۱۷۵
قوت حفظ وضبط 〃
کمال علم ۱۶۱
دوسرا وصف صبر وضبط ۱۶۲
صبر جمیل ۱۶۴
صرف خدا پر بھروسہ ۱۶۵
زہادت نفس و ایمان ۱۶۶
گداز قلب کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ ۱۶۷
زہادت عقل و عقیدہ ۱۶۹
متکلمین سے اجتناب ۱۷۰
زہادت فقہ ۱۷۱
صفت اخلاص ۱۷۲
ہیبت اور جلالت شان ۱۷۳

امام احمدؒ کے شیوخ اور اساتذہ:
(حافظ ہشیمؒ — امام شافعیؒ) ۱۷۶
۱۷۶ — ۱۸۰
حافظ ہشیمؒ ۱۷۷
حضرت امام شافعیؒ رحمۃ اللہ علیہ ۱۷۹
امام احمدؒ کے خصوصی دراسات ۱۸۱
۱۸۱ — ۱۹۰
امام احمدؒ کے دو اور استاذ ۱۸۲
سفیان ثوریؒ 〃
امام عبداللہ بن المبارکؒ ۱۸۶
امام احمدؒ کے دوسرے اساتذہ ۱۸۹
امام احمدؒ کا زمانہ اور اس کی کارفرمائیاں ۱۹۱
۱۹۱ — ۲۰۳
تعمیر میں تخریب کا پہلو ۱۹۱
معتزلہ اور علمائے حق ۱۹۳
امام احمدؒ اور معتزلہ کا اختلاف ۱۹۳
تدوین فقہ و حدیث ۱۹۵
دیار مختلفہ کی متفرق احادیث ۱۹۷
اسناد حدیث کی جرح و تعدیل ۱۹۸
مناظروں کا دور ۲۰۰
امام شافعیؒ کی کتاب "الام" ۲۰۱

فرق اسلامیہ ۲۰۴
۲۰۴ — ۲۱۰
فرق شیعہ اور اس کی ذیلی شاخیں ۲۰۴
زیدیہ 〃
کیسانیہ ۲۰۵
امامیہ اثنا عشریہ 〃
امامیہ اسماعیلیہ ۲۰۶
سبئیہ 〃
غرابیہ 〃
خوارج اور ان کے ذیلی فرقے 〃
ازارقہ اور اباضیہ ۲۰۷
یزیدیہ اور میمونیہ 〃
اعتقادی فرقے ۲۰۸
مرجئہ 〃
جبریہ یا جہمیہ 〃
قدریہ ۲۰۹

حصہ دوم

امام احمدؒ کے افکار و آراء ۲۱۳
۲۱۳ — ۲۱۴
امام احمدؒ کا مسلک صحابہ کرام کے بارے میں ۲۱۴
بعض عقائد سے متعلق امام احمدؒ کی رائے ۲۱۵
۲۱۵ — ۲۳۷
۱۔ ایمان ۲۱۶
مسئلہ ایمان میں امام احمدؒ کا مسلک ۲۱۷
۲۔ کبیرہ گناہوں کے مرتکب کا حکم ۲۱۸
۳۔ مسئلہ قدر اور افعال انسانی ۲۲۰
۴۔ صفات الٰہی اور مسئلہ خلق قرآن ۲۲۳
قرأت قرآن کو مخلوق کہنے کا غلو ۲۲۴
قرآن مجید کے متعلق دو نقطہ نظر ۲۲۵
امام احمدؒ کی رائے اور اس کی تحقیق 〃
ابن تیمیہؒ کا اختلاف ۲۲۶
امام احمدؒ کا فیصلہ کن تاریخی مکتوب ۲۲۷
سلف صالح کی پیروی ۲۳۰
اہل علم کے تین طبقے ۲۳۱
شیخ محمد عبدہ کی رائے ۲۳۳
۵۔ قیامت کے دن خدا کا دیدار ۲۳۵
امام احمد اور سیاست ملی ۲۳۸
۲۳۸ — ۲۴۸
صحابہ کا احترام ۲۳۹
حضرت علیؓ سے عقیدت ۲۴۲
مشاجرات صحابہؓ ۲۴۳

ایک ہاشمی کے سوال کا جواب ۲۴۳
خلیفہ کا انتخاب؟ ۲۴۴
خروج اور بغاوت سے اختلاف ۲۴۵
امام احمدؒ کا سلبی موقف ۲۴۶
خلافت اور قریش ۲۴۷
امام احمدؒ محدث اور فقیہ کی حیثیت سے ۲۴۹
۲۴۹ —— ۲۵۴
امام احمدؒ اور کتابتِ فقہ ۲۴۹
نقل و روایت کی اجازت ۲۵۱
اجازت کی وجہ ۲۵۳
خلاصۂ کلام ۲۵۴
"المسند" ۲۵۵
۲۵۵ —— ۲۶۷
ایک سوال اور اس کا جواب ″
جمع حدیث کا کام ۲۵۶
ایک سوال اور اس کا جواب ۲۵۷
امام عبداللہ بن احمد کی شخصیت اور حیثیت ″
مسند کی ترتیب ۲۵۹
مسند اور دوسری کتب حدیث کا فرق ۲۶۰
امام احمدؒ کا طرزِ روایت ۲۶۱
مسند میں کس طرح کی حدیثیں ہیں؟ ۲۶۲

حدیث صحیح کی تعریف ۲۶۳
حدیث حسن کی تعریف ″
حدیث غریب کی تعریف ″
مسند کی ضعیف حدیثیں ۲۶۴
کیا مسند میں موضوع حدیثیں ہیں؟ ″
خاتمۂ کلام ۲۶۷
فقہ احمدؒ کی نقل اور اس کا شیوع ۲۶۸
۲۶۸ —— ۲۷۴
حضرت امام کی تصانیف ″
فقہ امام احمدؒ پر ایک نظر ۲۶۹
اصل حقیقت کیا ہے؟ ۲۷۱
دو اور نکتے ۲۷۲
اختلاف اقوال و روایات ۲۷۳
فقہ احمدؒ کی نقل و نشر کا کام کن لوگوں نے کیا؟ ۲۷۵
۲۷۵ —— ۲۷۶
فقہ حنبلی کے راوی ۲۷۶
فقہ احمدؒ کے چند ناقلین ۲۷۷
۲۷۷ —— ۲۹۱
۱۔ صالح بن احمد بن حنبل ۲۷۷
امام احمدؒ کا طرزِ تربیت ۲۷۸
منصبِ قضا کا فائدہ ″

۲۔ امام عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ ۲۷۹
۳۔ ابوبکر احمد بن محمد بن ہانی الاثرم ″
۴۔ عبدالملک بن عبدالحمید بن مہران المیمونی ۲۸۱
۵۔ احمد بن محمد بن الحجاج ابوبکر المروذی ″
۶۔ حرب بن اسماعیل الحنظلی الکرمانی ۲۸۲
علم ضروریاتِ زندگی سے ہے ۲۸۳
۷۔ ابراہیم بن اسحاق الحربی ″
احمد بن محمد بن ہارون ابوبکر الخلال ۲۸۴
حافظ ابن قیم کا بیان ۲۸۵
فقہ حنبلی کا جامع ۲۸۶
دو اہم شخصیتیں ۲۸۷
۱۔ عمر بن الحسین الخرقی ″
خرقی کی کتاب "المختصر" ۲۸۸
۲۔ عبدالعزیز بن جعفر غلام الخلال ۲۸۹
کثرتِ اقوال و روایات ۲۹۲
۲۹۲ —— ۳۰۱
اقوال و روایات میں ترجیح و تطبیق کے طریقے ۲۹۳
ناسخ اور منسوخ کا قاعدہ ۲۹۵
فہم عبارت اور استنباط کا طریقہ ۲۹۷
"اکرہ" سے امام احمد کیا مراد لیتے ہیں؟ ″
"لا یعجبنی" کا مفہوم کیا ہے؟ ۲۹۸

ابن مفلح کی رائے ۲۹۹
امام احمدؒ کے افعال کی فقہی حیثیت ۳۰۰
امام احمدؒ اگر صحابہؓ سے دو قول ذکر کریں؟ ۳۰۱
فقہ حنبلی کے اوصاف عمومی ۳۰۲
۳۰۲ —— ۳۰۷
فقہ احمد کا نمایاں اور امتیازی پہلو ۳۰۳
ذرائع و وسائل ۳۰۷
فقہ حنبلی کے اصولِ استنباط ۳۰۸
۳۰۸ —— ۳۱۱
۱۔ نصوص ″
۲۔ صحابہ کے فتاوے ۳۰۹
۳۔ اختلافِ صحابہ کا فیصلہ ″
۴۔ حدیث مرسل اور حدیث ضعیف ″
۵۔ قیاس ۳۱۰
اضافہ شدہ اصول ″
(۱) الکتاب ۳۱۲
۳۱۲ —— ۳۲۵
حدیث کا مرتبہ ۳۱۳
کتاب اور سنت میں تعارض ممکن نہیں ۳۱۵
امور سہ گانہ ۳۱۶
فقہا کے دو گروہ ۳۲۱

امام مالکؒ اور فقہائے عراق ۳۲۳
احادیث آحاد اور ائمہ فقہ ۳۲۳
(۲) السنۃ ۳۲۶
۳۲۶ — ۳۴۸
قرآن اور حدیث کا فرق ۳۲۷
حدیث کے بغیر چارہ نہیں 〃
احادیث کے مراتب ۳۲۹
احادیث متواترہ 〃
متواتر اور مشہور کا فرق ۳۳۱
آحاد اور مشہور میں فرق 〃
عقیدہ اور عمل دونوں میں خبر آحاد کی حیثیت مساوی ہے ۳۳۲
حدیث مرسل کی کئی صورتیں ۳۳۳
حدیث مرسل اور امام مالکؒ و امام ابوحنیفہؒ ۳۳۴
امام شافعیؒ کے شرائط ۳۳۵
امام احمدؒ کا مسلک مرسل کے بارے میں ۳۳۶
مرسل حدیث کے رد و قبول کا زمانی و تدریجی ارتقاء ۳۳۷
رواۃ کے بارے میں امام احمدؒ کے شرائط ۳۳۸
محدثین کے نزدیک مراتب حدیث کی کیفیت ۳۴۰
صحیح 〃
حسن ۳۴۰
ضعیف ۳۴۱
ترمذی کی حسن کی اصطلاح 〃
حدیث ضعیف پر عمل کے بارے میں تین مسلک ۳۴۲
فضائل و مناقب کے سلسلہ میں کیا ضعیف حدیث قبول کرلی جائیگی؟ ۳۴۳
اگر صحیح اور حسن سے تعارض نہ ہو تو ضعیف حدیث قبول کرلی جائیگی؟ ۳۴۴
حدیث پر عمل کے شرائط 〃
فتوائے صحابی کو حدیث ضعیف پر ترجیح ۳۴۵
مُسند کی ضعیف حدیثیں 〃
حدیث ضعیف کی تقسیم: متروک اور غیر متروک ۳۴۶
قیاس اور حدیث صحیح ۳۴۸
۳- صحابہ کے فتاویٰ اور مسالک ائمہ اربعہ ۳۴۹
۳۴۹ — ۳۶۴
دین کی اصل کتاب و سنت ۳۵۱
اقوال صحابہؓ میں ترجیح کا اصول ۳۵۲
ایک ادعا اور اس کی تردید ۳۵۴
تابعی اور صحابی کی مرسل حدیث میں فرق ۳۵۶
صحابی کا فتویٰ اجتہاد ہے یا سنت سے ماخوذ؟ 〃
حجیت اقوال صحابہ جمہور علماء کا مسلک ہے ۳۵۹

صحابی کے فتوے سے استدلال ناگزیر ہے ۳۶۱
تابعی کا فتویٰ ۳۶۳
کبار تابعین کا فتویٰ قابل قبول ہے ۳۶۳
(۴) الاجماع: ۳۶۵ — ۳۷۵
امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک اجماع کی تعریف ۳۶۵
امام شافعیؒ کے نزدیک اجماعی مسائل کا دائرہ تنگ ہے ۳۶۸
"اجماع کا دعویٰ کرنے والا کاذب ہے" ۳۶۹
امام احمدؒ وجود اجماع کی مطلق نفی نہیں کرتے ۳۷۰
مسئلہ پر امر واقع کی حیثیت سے غور ۳۷۱
اجماع صرف صحابہ کا مانا جاسکتا ہے ۳۷۲
اجماع کے دو درجے ۳۷۳
حافظ ابن قیمؒ کی پیش کردہ مثالیں 〃
غیر صحابہ کا اجماع غیر ممکن العلم ہے! ۳۷۴
(۵) قیاس! ۳۷۶ — ۳۹۴
قیاس کی حقیقت ۳۷۷
امام احمدؒ کا مسلک قیاس کے بارے میں ۳۷۸
صحابہ کرام اور قیاس ۳۷۹
حنابلہ کے ہاں قیاس کی اہمیت ۳۸۰
امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے نتائج فکر ۳۸۱
قیاس صحیح اور قیاس فاسد 〃
نصوص موافق قیاس ہیں ۳۸۳
کیا کوئی حدیث مخالف قیاس بھی ہے؟ حنفیہ پر امام ابن تیمیہؒ کی تنقید ۳۸۵
(۱) حوالہ حقوق 〃
(۲) مضاربت، مزارعت، مساقاۃ ۳۸۷
(۳) شفعہ ۳۸۹
(۴) بیع سلم ۳۹۰
گروی چیز سے منفعت ۳۹۲
حدیث مصراۃ قیاس کے مطابق ہے ۳۹۳
قیاس کا استعمال اور اس سے استفادہ ۳۹۴
(۶) استصحاب ۳۹۵ — ۴۰۲
استصحاب کی حقیقت ۳۹۵
ایجابی اور سلبی پہلو ۳۹۷
۱- ایجابی حیثیت ۳۹۸
۲- سلبی 〃
استصحاب کی چند مثالیں 〃
۱- ذبائح کی اصل تحریم ہے ۳۹۹
۲- پانی طاہر اور مطہر ہے 〃
۳- شک ناقض وضو نہیں 〃
۴- ثبوت رضاعت سے نکاح باطل ہوجائیگا 〃
۵- شک کی صورت میں طلاق رجعی مانی جائیگی ۴۰۰
چند اور صورتیں 〃

استصحاب کے بارے میں فقہاء کا مسلک ۴۰۱
(۷) مصالح ۴۰۳ — ۴۱۱
مصالح مرسلہ کی مثالیں ۴۰۴
۱۔ قرآن کا مصحف کی صورت میں جمع کرنا "
۲۔ شرابی کی حد "
۳۔ کاریگروں سے تاوان وصول کرنا مصلحت عامہ کا تابع ہے ۴۰۵
۴۔ خیانت سے متہم حکام کو مالی جرمانہ "
۵۔ ایک آدمی کے قتل کے جرم میں کئی آدمیوں کی جماعت کو قتل کر دینا "
۶۔ مصلحت عامہ کے لیے جلا وطنی جائز ہے ۴۰۶
۷۔ امہات اولاد (لونڈیوں) کی بیع کی ممانعت "
صحابہ مصالح سے کام لیتے تھے "
۱۔ سیاست شرعیہ اور مصلحت عامہ ۴۰۷
۲۔ شافعیؒ اور حنبلی کا مناظرہ "
۳۔ اقامت شریعت کا انحصار مصلحت پر ہے ۴۰۸
۴۔ ضرورتمند لوگ رہائش کے لیے مکان جبراً دلوایا جا سکتا ہے ۴۰۹
۵۔ مناسب اجرت دیکر مزدور سے جبری کام لیا جا سکتا ہے "
۶۔ کسی چیز کی زیادہ سے زیادہ قیمت مقرر کی جا سکتی ہے ۴۱۰
مصلحت کو قیود شرعیہ کا تابع ہونا چاہیے ۴۱۱
مصلحت کو روح شریعت سے ہم آہنگ ہونا چاہیے "
وہ مصلحت وجوہ عقلی پر مبنی ہونی چاہیے "
وہ مصلحت رفع حرج کا سبب ہو "

نصوص اور مصالح ۴۱۲ — ۴۲۴
فقہاء کے تین گروہ ۴۱۲
نصوص اور مصلحت مرسلہ "
تیسرا گروہ ۴۱۳
ضروری تشریح "
طوفی کا مسلک ۴۱۴
طوفی کے کلام پر تنقید ۴۱۶
طوفی کے دلائل کی حقیقت ۴۱۸
طوفی کے کلام کا تجزیہ ۴۲۰
اس مسلک سے امام احمدؒ کا کوئی تعلق نہیں "
طوفی کی زندگی پر ایک نظر ۴۲۲
طوفی شیعہ تھے "
طوفی امام احمدؒ کے مخالف تھے ۴۲۳
ذرائع ۴۲۵ — ۴۳۴
مواردِ شرعیہ کی قسمیں ۴۲۶
سمجھنے کی ضروری بات "
وسائل کی دو حیثیتیں ۴۲۸
نیت اور نتیجہ ۴۲۹
اصل چیز نتائج اور ثمرات ہیں ۴۳۰
حافظ ابن قیم کی تقسیم ۴۳۱
چند اور صورتیں ۴۳۲

ذرائع کی چند مثالیں ۴۳۲
(۱) نیت کی کمی بیشی "
(۲) اسلحہ جنگ کی فروخت ۴۳۳
(۳) مرتد زندیق کی توبہ نامقبول "
تأمل و تجزیہ پر نظر ۴۳۴
امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے فکر و نظر کا موازنہ ۴۳۵
۴۳۵ — ۴۳۹
ذرائع کے بارے میں اختلافی پہلو ۴۳۵
امام شافعیؒ ظاہر کو دیکھتے ہیں نتائج کو نہیں ۴۳۶
امام شافعیؒ کے نزدیک نیت مؤثر نہیں ۴۳۹
خاتمۂ بحث: ۴۴۰ — ۴۴۱
فقہ امام احمدؒ کے چند خاص پہلو: ۴۴۲
۴۴۲ — ۴۵۴
حریت تعاقد اور طے شدہ شروط "
حنابلہ کا اختلاف ۴۴۳
عقود کے مقتضیات اور آثار ۴۴۵
چند اہم مثالیں ۴۴۷
۱۔ نکاح میں عورت علاوہ مہر کے لیے شرط خیار جائز ہے ۴۴۷
۲۔ عورت کی طرف سے پیش کردہ شرطوں واجب الوفا ہیں "
۳۔ بیع میں شرط کا جواز ۴۴۸
۴۔ غلام کی آزادی میں خدمت کی پابندی "

چند اور مثالیں ۴۴۸
ملکیت مشروط ہو سکتی ہے ۴۴۹
بعض دلائل "
۱۔ ہر عہد واجب الوفاء ہے "
۲۔ عقود کا شمار عادات میں ہے نہ کہ عبادات میں ۴۵۰
۳۔ معاملاتِ مالیہ کی اصل حلت ہے "
۴۔ شرط کا التزام نذر کے التزام کی طرح ہے ۴۵۱
تعلیق، امام احمدؒ کی نظر میں "
نرخ معین کیے بغیر سودا ہو سکتا ہے ۴۵۲
امام احمدؒ کے ہاں شروط کا احترام ۴۵۳
حنبلیت ۴۵۵ — ۴۶۴
ہر تشدد پسند حنبلی کہلانے لگا ۴۵۶
۱۔ کتے اور سؤر کا جھوٹا کیسے پاک کیا جائے "
۲۔ دوسرے فقہاء سے اختلاف ۴۵۸
۳۔ مشکوک پانی کی موجودگی میں تیمم ہو سکتا ہے؟ ۴۵۹
۴۔ مشرکوں کے برتن پاک ہیں یا نہیں؟ ۴۶۰
۵۔ نیند سے اٹھتے وقت ہاتھ دھونے ضروری ہیں ۴۶۱
۶۔ مضمضہ اور استنشاق واجب ہے یا سنت؟ "
۷۔ اونٹ کا گوشت ناقض وضو ہے؟ ۴۶۲
امام احمدؒ کے مذہب کا نمو اور فروغ ۴۶۵
۴۶۵ — ۴۷۴

امام صاحب صرف محدث نہ تھے فقیہ بھی تھے	۴۶۷	مذہب حنبلی کی دو قسمیں	۴۸۹
مدارکِ فتویٰ میں وسعت اور کشادگی	〃	۳۔ علمائے مذہب حنبلی کے علمی اور اصولی کارنامے	
فقہ حنبلی میں نمو کی صلاحیت	۴۶۸	۴۹۰ —— ۴۹۸	
"عرف" اور مذہب حنبلی	۴۷۰	"ترجیح" کی اصطلاح	۴۹۰
مذہب حنبلی کے نمو کی ایک اور وجہ	۴۷۱	قیاس کی وسعت	۴۹۱
اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے یا بند؟	〃	فقہی اقوال کی کثرت کا اچھا پہلو	۴۹۲
۱۔ فقہ حنبلی کے نمو میں اس کے اصولوں کا حصہ	۴۷۵	تصحیح، ترجیح، تخریج	۴۹۳
۴۷۵ —— ۴۷۹		امت پر امام ابن تیمیہؒ کا احسان	〃
مذہب حنبلی کے عوامل نمو	۴۷۵	علمائے حنابلہ کی گرامی قدر خدمات	۴۹۵
احادیث و اخبار کا علم جامع	۴۷۶	حافظ ابن رجب کی معرکہ آرا کتاب	〃
امام احمدؒ کے فقہی کارنامے	۴۷۸	حنابلہ نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہونے دیا	۴۹۷
۲۔ فتویٰ، اجتہاد اور تخریج ۴۸۰ — ۴۸۹		مذہب حنبلی کا فروغ و ذیوع	۴۹۹
(امام احمدؒ کی فقہ میں ان اصولوں کی حیثیت و اہمیت)	۴۸۰	۴۹۹ —— ۵۰۸	
مجتہد فی المذہب	۴۸۳	قلت تعداد کیوں؟	〃
اصحاب وجوہ	۴۸۴	ابن خلدون کی رائے غلط ہے	۵۰۱
تقلیدِ محض	۴۸۵	ایک اور سبب	۵۰۲
مفتیوں کی چار قسمیں	〃	تاریخ کامل ابن اثیر کی شہادت	۵۰۳
ابن حمدان کی تقسیم	۴۸۷	حنبلی مذہب کے پیچھے رہنے کا ایک اور سبب	۵۰۵
فتویٰ، تخریج، نقل۔	〃	امام احمدؒ کے شاگردوں کے عظیم کارنامے	〃
علامہ ابن قیم کی رائے	۴۸۸	مذہب حنبلی کہاں کہاں پہنچا؟	〃
مذہب حنبلی کے معنوی نشو و نما کی وجہ	〃	ماضی کی محرومی کی تلافی ہوگئی	۵۰۷

"ایک مدت تک امام صاحب کے سفرِ سیاحت کا سلسلہ جاری رہا، تاکہ وہ ائمہ حدیث کے منہ سے نکلے ہوئے بولوں کو براہِ راست سنیں اور ان کو ضبطِ تحریر میں لائیں۔

بصرہ کا سفر آپ نے پانچ مرتبہ کیا اور بعض دفعہ وہاں کئی کئی ماہ تک قیام فرمایا، جہاں وہ بعض شیوخ سے کسبِ فیض کرتے، کبھی کم مدت تک، کبھی زیادہ عرصہ تک، جیسا موقع کا تقاضا ہوا۔ حجازِ مقدس کا سفر بھی آپ نے پانچ مرتبہ کیا، سب سے پہلے ۱۸۷ھ میں، اسی سفر میں امام شافعیؒ سے ملاقات ہوئی، اور سفر کا جو اصل مقصد تھا وہ پورا کیا، یعنی حدیث ابی عیینہ کا حاصل کرنا، نیز فقہ شافعیؒ، اس کے اصول، قرآن کے ناسخ اور منسوخ کا بیان، یہ سب چیزیں معلوم کیں، اس کے بعد امام شافعیؒ سے ان کی ملاقات بغداد میں ہوئی جب وہ وہاں تشریف لائے تھے، ان کے کشکول میں ان کی فقہ اور اصولِ فقہ کے اوراق موجود تھے، اگرچہ کچھ عرصہ بعد مصر میں ان کے فقہ و اصول نے تنقیح کے مدارج طے کیے، لیکن امام احمدؒ اس فن میں پختہ ہو چکے تھے، چنانچہ معرفتِ حدیث میں امام شافعیؒ، ان کی رائے اور فکر کو مدارِ اعتماد قرار دیتے اور کبھی کبھی فرماتے،

"اگر آپ کے پاس کوئی صحیح حدیث پہنچ جایا کرے تو مجھے بھی اس سے باخبر کر دیا کیجیے۔ خواہ وہ کسی حجازی سے پہنچی ہو یا شامی سے، یا عراقی سے یا یمنی سے"

(ص ۶۴)

"ہمارا ایک پڑوسی تھا، وہ ہمارے پاس ایک خط لے کر آیا، اور کہنے لگا کیا تم اس سوادِ خط کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا، یہ تو احمد بن حنبلؒ کا خط ہے، تمہیں انہوں نے کیوں لکھا تھا؟ کہنے لگا، ہم مکہ میں سفیان بن عیینہ کے ہاں مقیم تھے، احمد بھی ہمارے ساتھ تھے، ایک مرتبہ کئی دن تک وہ لاپتہ رہے، آخر ایک دن خود ہی ان کے ہاں آئے، تو دروازہ بند تھا۔

میں نے پوچھا،

"کیا بات ہے، کیوں غائب رہے؟"

کہنے لگے،

"میرے کپڑے چوری ہو گئے ہیں!"

مَیں نے کہا

"میرے پاس کافی دینار ہیں، چاہو لیں ہی لے لو، خواہ قرض کے طور پر!" لیکن انہوں نے نہ یونہی لینا پسند کیا، نہ قرض کے طور پر۔ تو مَیں نے کہا

"اجرت پر میرے لیے کچھ لکھ دو گے؟"

اس پر راضی ہو گئے، مَیں نے انہیں ایک دینار دیا، کہنے لگے، میرے لیے اس رقم کا کپڑا خرید لاؤ اور اس کے دو ٹکڑے کر دو، ایک تہ بند، ایک چادر، اور ایک ورق کاغذ لا دو۔ میں نے کپڑا لا دیا اور کاغذ لا کر دے دیا، تو انہوں نے یہ لکھ دیا —"

(ص ۱۴۴)

"امام شافعیؒ جب دوسری مرتبہ بغداد تشریف لائے، اور وہاں قیام فرما ہوئے اور اپنے نظریات اور مسلک کی نشر و تبلیغ میں معروف ہوئے تو امام احمدؒ بھی بغداد میں موجود تھے اور امام شافعیؒ کی مجلس میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے، یہ حاضری انہوں نے کبھی ناغہ نہیں کی، سوا کوئی سفر پیش آ جانے کے سبب سے، یا حدیث ہی کے سلسلہ میں کسی اور معروفیت کے باعث۔

امام شافعیؒ نے دیکھا کہ احمدؒ، عبدالرزاق بن ہمام سے طلب حدیث کے سلسلہ میں یمن جا رہے ہیں، جیسا کہ ہم یہ واقعہ اس سے قبل بیان کر چکے ہیں، امام شافعیؒ کو یہ بھی معلوم تھا کہ احمدؒ پیسے کی کمی کے باعث کیسی کیسی مشقت اور تکلیف پر مجبور ہو ہو جاتے ہیں، اسی زمانہ میں امین نے امام شافعیؒ کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ یمن کے لیے کسی قاضی کا انتخاب کریں، انہوں نے محسوس کیا اگر احمدؒ کو یمن کا قاضی بنا دیا جائے تو ان کی یہ دشواری ختم ہو جائے گی، بغیر کسی زحمت اور مصیبت سے دوچار ہوئے وہ عبدالرزاق بن ہمام سے حدیث کی سماعت کر سکیں گے، یہ سوچ کر انہوں نے احمدؒ کو اس منصب کی پیش کش کی، لیکن انہوں نے انکار کر دیا، دوبارہ پھر اصرار کے ساتھ یہ پیش کش دوہرائی، اس کے جواب میں امام صاحب نے امام شافعیؒ سے جو ان کے استاذ اور شیخ تھے اور جن کا وہ بے حد اجلال و احترام کرتے تھے، کہا

"اے ابو عبداللہ!

اگر اس پیش کش کی بات میں نے آپ سے دوبارہ سنی تو پھر آپ مجھے کبھی اپنے حضور میں حاضر ہوتے نہیں دیکھیں گے"

(ص ۱۴۹)

"ایک مرتبہ اپنے دورِ ابتلا میں وہ کسی سلسلہ میں خلیفہ کے پاس گئے، وہاں انہیں مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی گئی؛ تاکہ وہ بھی وہی کہنے لگیں جو خلیفہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کی مرضی تھی، یعنی قرآن کے مخلوق ہونے کا اعتراف و اقرار، چنانچہ ان کی موجودگی میں ان کی نظر کے سامنے دو آدمیوں کی گردن قلم کر دی گئی، لیکن وہ اس لرزہ خیز منظر کے دوران میں بھی اتنے مستقل مزاج رہے کہ جب ان کی نظر امام شافعیؒ کے ایک شاگرد پر پڑ گئی تو اس سے دریافت کیا:

"موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں امام شافعیؒ کا کوئی قول آپ کو یاد ہے؟"

اس دہشت ناک منظر میں اطمینان اور بے پروائی کی یہ بات سن کر امام احمدؒ کے بدترین مخالف اور دشمن، احمد بن ابی دؤاد نے تعجب کے ساتھ کہا:

"اس شخص کو دیکھو جو ضربِ شمشیر سے آشنا ترین ہے، پھر بھی فقہی مسائل میں الجھا ہوا ہے۔"

(ص ۱۶۴)

"میں ایک مرتبہ ابو عبداللہ (احمد بن حنبلؒ) کے پاس گیا اور ان سے سوال کیا کہ

"گدازِ قلب کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟"

یہ سن کر آپ نے اپنے اصحاب کی طرف دیکھا، پھر تھوڑی دیر تک سر جھکائے رکھا، پھر اٹھایا اور فرمایا:

"بیٹا، گدازِ قلب صرف اکلِ حلال سے پیدا ہو سکتا ہے!"

اس کے بعد ابو النصر بشر بن حارث کے پاس گیا، ان سے بھی میں نے وہی سوال دریافت کیا، انہوں نے کہا:

"اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد) (دیکھو! خدا کے ذکر ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں!)

میں نے عرض کیا، ابھی ابھی میں ابو عبداللہ کے پاس سے آ رہا ہوں، فرمایا، تو بتاؤ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کیا کہا؟ میں نے کہا وہ تو فرماتے ہیں، گدازِ قلب اکلِ حلال سے پیدا ہوتا ہے، کہنے لگے بڑے پتہ کی بات کہی۔

پھر میں عبدالوہاب بن ابی الحسن کے پاس گیا، ان سے بھی میں نے وہی سوال کیا، جواب میں انہوں نے کہا، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

(ص ۱۶۸)

"امام احمد رحمۃ اللہ علیہ چھنے ہوئے ثقہ راویوں سے روایت کیا کرتے تھے، انہوں نے کسی ایسے شخص سے روایت نہیں کی جسے ضعیف سمجھتے ہوں، یا ان کی نظر میں جو شخص ضبط و فہم پر پوری دسترس نہ رکھتا ہو۔ آپ کو جب کسی کے بارے میں یقین ہو جاتا تھا کہ یہ ثقہ ہے تو بے تامل اس کی روایت قبول کر لیتے، اور اس کے مرویات کو قید کتابت میں لے آتے تھے، اپنے شاگردوں سے اسے املا کراتے تھے، اور اگر روایت قبول کر لینے کے بعد یہ معلوم ہو جاتا کہ جس راوی سے انہوں نے روایت قبول کرنے میں دھوکا کھایا ہے یا سند میں ایسے شخص کا ذکر آ گیا ہے جو ثقہ نہیں ہے تو وہ اس کی حدیث ساقط کر دیتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے احادیث کا جو مجموعہ جمع کیا تھا، اس میں برابر حذف و تغیر کا سلسلہ جاری رہتا تھا، یہاں تک کہ جب اپنی اولاد، اور مخصوص لوگوں کو وہ مسند املا کرا چکے اس کے بعد بھی حذف و تغیر کرتے رہے۔"

(ص ۲۶۱)

"جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث رد کرتا ہے وہ ہلاکت کے کنارے کھڑا ہے!"

وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث نہیں لکھی جس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش نہ کی ہو!"

اور جب کبھی ایسی مشکل پیش آئی کہ حدیث یا سنت نہ ملتی تو تخریج مسائل کے سلسلہ میں وہ اجتہاد سے کام لیتے تھے، لیکن یہ اجتہاد منہاج سلف پر ہوتا تھا، بدعت سے بری اور تغیر راہ سے الگ، وہ ایسے اجتہاد سے رکتے تھے، جس کے بارے میں سابق میں کہیں کوئی قول نہ ملتا ہو، یا اسلاف میں سے کسی کا نقش قدم نظر نہ آتا ہو، چنانچہ وہ اپنے شاگردان رشید سے فرمایا کرتے تھے:

"خبردار، کسی ایسے مسئلہ میں سخن طرازی نہ کرنے لگنا جس میں تمہارا کوئی امام اور رہبر نہ ہو!"

(ص ۱۶۲)

"اصحابِ امام احمدؒ کا ایک فتویٰ یہ ہے کہ اگر مالک مکان کے گھر میں گنجائش ہو تو اسے اس امر پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ بے خانماں لوگوں کو اپنے گھر میں رہنے دے۔
اس سلسلہ میں حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:
"اگر لوگ کسی کے گھر میں داگر گنجائش ہو) بے گھر ہونے کے باعث سکونت پر یا کسی سرائے میں ٹھہرنے پر مجبور ہو جائیں تو مالک مکان یا سرائے پر واجب ہے کہ بغیر جھگڑے ٹنٹے کے انہیں رہنے دے لیکن یہ سوال کہ وہ کرایہ لے گا یا نہیں؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں۔ جو لوگ کرایہ کو جائز قرار دیتے ہیں، وہ بھی ان کو حرام سمجھتے ہیں کہ عام طور پر جو شرح کرایہ ہے اس سے زیادہ لیا جائے :
اور کوئی شبہ نہیں کہ اس فتوے کی بنیاد مصلحتِ عمومی، اور دفعِ مضرت ہے، اس لیے کہ اگر پریشان حال لوگ، مالک مکان کو ضرر پہنچائے بغیر سکونت پر مجبور ہوں، تو ضروری ہے کہ کرایہ کی شرح نہ بڑھنے دی جائے اور یہ کوئی ظلم نہیں ہے۔ (ص۲۰۹)

"امام احمدؒ اس مسلک پر بڑی سختی کے ساتھ قائم ہیں کہ سنتِ نبویہ، قرآن کریم کی مفسر ہے، وہ اسے بھی فرض نہیں کرتے کہ ظاہر قرآن اور سنت میں تعارض واقع ہو سکتا ہے، اس لیے کہ ظاہر قرآن اسی چیز پر محمول کیا جائے گا جس جانب سنت رہنمائی کر رہی ہے، کیونکہ سنت قرآن کا بیان ہے، اور قرآن کے احکام و فقہ کی مفسر ہے، امام احمدؒ نے ایک کتاب ان لوگوں کے رد میں لکھی ہے جو ظاہر قرآن کو لے لیتے ہیں اور سنت کو ترک کر دیتے ہیں:" (ص۲۱۵)

"امام احمدؒ کی تحریروں، جوابوں، اور بیانوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اعتقاد کے بارے میں بھی حدیثِ آحاد کو وہی درجہ دیتے تھے جو عمل کے بارے میں، مثلاً عذابِ قبر پر ایمان لانا، منکر نکیر کا ایمان رکھنا، حوضِ کوثر، اور شفاعت کو جزوِ ایمان سمجھنا، اور اس بات پر ایمان رکھنا کہ موحد امتحان کے بعد جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔ یہ سب باتیں احادیثِ آحاد ہی سے ثابت ہیں اور امام احمدؒ ان سب کو تسلیم کرتے تھے۔" (ص۲۳۲)

"صحابہ کا دیا ہوا فتویٰ چھ صورتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔

(۱) ——— یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہو،

(۲) ——— اس صحابی سے سنا ہو، جس نے آپ سے سنا ہو

(۳) ——— کتاب الٰہی کا جو نکتہ ہماری نظر سے پوشیدہ رہ گیا، اس پر پوری اطلاع،

(۴) ——— ہماری طرف وہی قول منتقل کیا، جو ان کے ہاں متفق بہ تھا۔

(۵) ——— لغت، دلالت لفظ، قرائن حالیہ، یا مجموعی طور پر وہ وجدان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت مسلسل، آپ کے افعال و احوال کے مشاہدات، سیرت اور سماع کلام، علم مقاصد، شہود تنزیل وحی اور مشاہدۂ تاویل پر مبنی ہو لہٰذا صحابی کا فہم، ہمارے فہم سے بالا اور برتر ہوگا۔

اور ان پانچوں وجوہ کی بنیاد پر، صحابی کا فتویٰ ہمارے اوپر حجت ہوگا، اور اس کی اتباع لازم۔

(۶) ——— اور اگر فہم صحابی، غیر روایت، یا غلط فہمی پر مبنی ہو تو اس تقدیر پر اس کا قول حجت نہیں ہوگا، (اور اس کی پیروی بھی لازم نہیں ہوگی) لیکن یہ قطعی بات ہے کہ پہلی پانچ صورتیں اغلبی ہیں اور چھٹی نادر اور شاذ۔ بنابریں ظن غالب یہی ہے کہ صحابی کا فتویٰ منشائے شریعت کے مطابق اور درست ہے، لہٰذا اس پر عمل متعین ہونا چاہیے۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت امام احمد بن محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات، ان کے مسلک اور ان کی فقہ پر مشتمل زیر نظر کتاب منصۂ شہود پر آنے سے ایک بندۂ عاجز کی دیرینہ آرزو بر آئی وللہ الامر من قبل ومن بعد۔ یہ کتاب مصر کے ایک جدید تعلیم سے آراستہ عالم کی تالیف "ابن حنبل" کا اردو قالب ہے اور بلاشبہ اپنے موضوع پر جامع۔ حضرت امام کا شمار امت کی مقبول ترین اور مسلمہ ہستیوں میں ہے۔ اہل سنت کے ایک مکتب فکر ہی کے آپ امام نہیں بلکہ بعض وجوہ سے سب ہی نے آپ کو اپنا امام تسلیم کیا ہے۔

رجال و سیر کی قریباً سب کتابوں میں آپ کے سوانح حیات مذکور ہیں، جو رواۃ حدیث، محدثین کرام، صوفیائے عظام اور فقہاء، و اعیان امت کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں، بلکہ بعض ائمہ حدیث و فقہ نے آپ پر مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مناقب الامام احمد للامام احمد بن الحسین البیہقی، المتوفی ۴۵۸ھ

مناقب الامام احمد للامام عبد اللہ بن محمد الہروی المتوفی ۴۸۱ھ

مناقب الامام احمد للحافظ ابی زکریا یحییٰ بن عبد الوہاب ابن مندہ، المتوفی ۵۱۲ھ۔

مناقب الامام احمد للعلامہ عبد الرحمٰن ابن الجوزی، المتوفی ۵۹۷ھ۔

تعجب ہے اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں تھی، حالانکہ جہاں تک ہمارے دور کا تعلق ہے، اس میں امام احمدؒ کے سوانح زندگی سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ہم بھی آج اسی نوعیت کی گمراہیوں سے دوچار ہیں جس قسم کی بدعات عقائد و اعمال نے عباسیوں کے مامونی عہد میں بال و پر نکالے تھے، اور ان کا ازالہ کرنے کے لیے حضرت امام احمدؒ نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔

کچھ مدت ہوئی کہ بوساطت محترم دوست مولانا عبد القادر صاحب ندوی لائل پوری، مدرسہ

تعلیم الاسلام اوڈانوالہ ضلع لائل پور سے مصر کے پروفیسر محمد ابوزہرہ کی کتاب "ابن حنبل" ہاتھ لگ گئی، مطالعہ کے بعد خیال ہوا کہ کتاب اپنے موضوع پر کافی حد تک جامع ہے، اس کو اردو کا جامہ پہنا دیا جائے تو بہتر رہے گا۔ چنانچہ مشہور مصنف جناب مولانا سید رئیس احمد صاحب جعفری کی خدمت میں احقر نے کتاب مذکورہ کے ترجمہ کے لیے درخواست کی تو انہوں نے بلا تأمل اور بڑی خوشی سے منظور فرمایا، اور اپنی کثیر مصروفیات کے باوجود چند ماہ میں ابن حنبلؒ کا اردو ایڈیشن تیار کر دیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء!

حضرت امام احمدؒ نے کن حالات میں حفاظتِ دین و صیانتِ سنت کی خدمت سرانجام دی؟ اور کہاں تک آپ کو کامیابی ہوئی؟ اس کی تفصیل آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے تاہم بعض وجوہ کی بنا پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے امام صاحب کے دور اور اس کے مقتضیات کے مطابق آپ کی جدوجہد کا جو تذکرہ کیا ہے اس کے جستہ جستہ مقامات یہاں پیش کر دیئے جائیں۔

"تیسری صدی (ہجری) کے اوائل میں جب فتنۂ اعتزال و تعمق فی الدین اور بدعتِ مسئلۂ تکلم بالفلسفہ و انحراف از اعتصام بالسنۃ نے سر اٹھایا اور صرف ایک ہی نہیں، بلکہ لگاتار تین عظیم الشان فرماں رواؤں یعنی مامون، معتصم، اور واثق باللہ کی شمشیرِ استبداد و قہرِ حکومت نے اس فتنہ کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ بقول علی بن المدینیؒ کے فتنۂ ارتداد و منع زکوٰۃ (العہد حضرت ابوبکرؓ) کے بعد یہ دوسرا فتنۂ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا۔"

"عزیمتِ دعوت و کمالِ مرتبۂ وراثتِ نبوت، و قیامِ حق و ہدایت فی الارض والامۃ کا وہ جو ایک مخصوص مقام تھا، صرف ایک ہی قائم بامر اللہ کے حصہ میں آیا، یعنی سید المجددین و امام المصلحین حضرت امام احمد بن حنبلؒ۔"

"یہ وہ وقت تھا، کہ قیامِ سنت و دینِ خالص کا قیامت تک کے لیے فیصلہ ہونے والا تھا، اور مامون و معتصم کے جبر و قہر اور بشر مریسی اور قاضی ابن ابی دؤاد جیسے جبابرۂ معتزلہ کے تسلط و حکومت نے علمائے حق کے لیے صرف دو ہی راستے باز رکھے تھے، یا اصحابِ بدعت

کہ شریعت میں صرف اتنا ہی نہیں ہے، جو رسول بتلا گیا، بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جا سکتا ہے، اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے، ہر رائے اس پر قاضی و آمر ہے، ہر فلسفہ اس کا مالک و حاکم ہے! اور یا پھر قید خانے میں رہنا اور ہر روز کوڑوں سے پیٹا جانا قبول کریں۔"

"فی الحقیقت حضرت امام موصوف کی نسبتِ محمدی اور کمالِ مرتبۂ تأسی باسوۂ نبوت کی یہی وہ شان و جلالت ہے جس نے ان کو تمام ائمہ و مجددینِ امت کی صفوفِ مراتبِ کمال سے بلند کر کے ایک دوسرے ہی مقام پر پہنچا دیا ہے۔ حتیٰ کہ تمام ائمۂ اسلام میں یہ فضل مخصوص صرف انہی کے حصے میں آیا کہ ان کی محبت و پیروی اہلِ حق و سنت ہونے کی دلیل ٹھہری اور ان سے انحراف بدعتی ہونے کی سب سے بڑی پہچان! اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا فی السنۃ ہونے کا وہ مرتبہ عطا فرمایا کہ کمالِ استغراق و تفانی کی وجہ سے خود ان کی ذاتِ گرامی ہی یکسر سنت و اتباعِ سنت کا پیکر و مجسمہ بن گئی، بجدیکہ:

تو لاں ترا و جان را ہم امتیاز کردن!

جو اس امام کے قدم بقدم چلا، اس نے سنت کو پایا اور جس نے اس کی راہ چھوڑی اس نے سنتِ رسول و منہجِ اصحابِ رسول سے انحراف کیا۔ یہ کیا تھا کہ بڑے بڑے ائمۂ عصر کو اعتراف کرنا پڑا "اذا رأیت الرجل یحب احمد بن حنبل فاعلم انہ صاحب سنۃ" اگر کسی کو دیکھو کہ امام احمدؒ سے محبت رکھتا ہے تو بس جان لو کہ صاحبِ سنت ہے، خطیب نے تاریخ میں ہمدانی کا قول نقل کیا ہے "یعرف بہ المسلم من الزندیق" اسی کسوٹی پر مسلم کو زندیق سے پرکھا جائیگا۔ دورقی نے کہا "من سمعتموہ یذکر احمد بن حنبل بسوء فاتھموہ علی الاسلام"!

انا من اھوی، ومن اھوی، انا	نحن روحان حللنا بدنا
فاذا ابصرتنی، ابصرتہ	واذا ابصرتہ، ابصرتنا

ویقرب من ھذا ما قیل بالفارسیۃ:

جذبۂ وصل بحدیست میان من و تو

امام موصوف کے متعلق اسی حقیقت کو مزاحم الخاقانی نے ایک قطعہ میں نظم کیا تھا:

لقد صار فی الآفاق احمد محنۃ — وامر الوری فیھا فلیس بمشکل

تری ذا الھوی جھلا لاحمد مبغضا — وتعرف ذا التقوی یحب ابن حنبل

اور یہ بالکل حق ہے۔ آج بھی دیکھ لو۔ ارباب بدعت کو کبھی امام موصوف کا مسلک خوش نہ آئے گا۔ ان کی محبت سے ان کا دل بالکل کورا ہو گا۔ بلکہ کہیں گے کہ ان کا طریقہ تاویل ورائے کی عقلمندی سے خالی اور محض ظاہر پرستی اور بے دانشی وبے علمی کا مجموعہ ہے۔ حتیٰ کہ الرحمٰن علی العرش استویٰ اور یہ وعلو ونزول کے دقیق وفلسفیانہ معانی بھی ان کو معلوم نہ تھے اور تجسم وجہت کے اعتقاد میں مبتلا! برخلاف اس کے عصابہ صالحہ کتاب وسنت وطائفہ منصورہ ما انا علیہ واصحابی کہ جمیع طرق ومذاہب بدعیہ سے یکسر دامن کشاں ہیں، اور متبدعین وارباب ہوا کے تمام شبرہ ہائے تیرہ ودوش ہائے نا فرجام سے بکلی پناہ ڈھونڈتے ہیں اگرچہ اس کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے نزدیک مبغوض ومردود ہو جائیں۔ تو ان کا حال یہ ہے کہ اس امام اہل السنۃ کی محبت وپیروی کو اپنے ایمان کی زینت اور اپنے عقائد کی خوب روئی وزیبائی سمجھتے ہیں۔ اور ان کے مسلک سنت وحکمت اور طریق محمدیہ خالص بے مزاج، بدعت قیاس ورائے کے عشق وشغف سے اپنے قلب وروح کو ہمیشہ معمور وآباد رکھتے ہیں۔ ورحمۃ اللہ علی القائل وھو ابن اعین رکما نقل الخطیب فی التاریخ) اذ یقول:

اضحی ابن حنبل محنۃ مامونۃ — وبحب احمد یعرف المتنسک

واذا رأیت لاحمد متنقصا — فاعلم بان ستورہ ستھتک[1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت امام کو اس جہاد میں کامیاب فرمایا، اور اس مقابلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتنہ اعتزال بالآخر ختم ہو کر رہا۔ اور آپ کے مسلک اتباع ظواہر قرآن وحدیث نے فتح پائی۔ انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد (حم السجدہ)

---

[1] ۔۔۔ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فتنۂ اعتزال کا حاصل یہی تھا کہ قرآن حکیم کا تعلق حق تعالیٰ سے منقطع

کرکے مخلوق سطح کی ایک کتاب بنے دیا جائے اور اس کے سمجھنے کے لیے محض عقل پر اعتماد کیا جائے اور جس ہستی پر قرآن کا نزول ہوا اور جس ماحول اور جن مقدس لوگوں میں ہوا ان کی وساطت ختم کر دی جائے۔ حال آج بھی ایک ٹولے کا یہی ہے۔ وہ قرآن کو بس ایک کتاب سمجھتے ہیں۔ ڈکشنری ہاتھ میں لی اور اس کی تفسیر کرنے بیٹھ گئے۔ حدیث کی ضرورت نہ اقوال وتعامل صحابہ کی! ——— حدیث اگر آڑے آتی ہے تو "آحاد" کہکر مسترد کر دیا۔ یا پھر "قانون فطرت" اور "مشاہدات سائنس" کے ڈائنامیٹ سے اس کو اڑا دیا! اور بڑی نوازش ہو تو درایت سے صحیح احادیث میں شک پیدا کر دیجیے اور من مانی کارروائی کے لیے اطمینان کا سانس لیجیے۔ رہے صحابہ تو اس کے لیے نحن رجال وھم رجال ہی کافی ہے ——— !

یہ لوگ ہیں بقول مولانا ابوالکلام آزاد "معتزلہ جدید اور ان کے چھوٹے بھائی"

"اور یہ جو کہا معتزلہ جدید اور ان کے چھوٹے بھائی! تو ان لوگوں کا کچھ عجیب حال ہے ان کو دیکھکر بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے کہ اللہ نباش اول پر رحم کرے! معتزلہ قدیم علم وعمل دونوں کے اعتبار سے بدرجہا ان سے بہتر تھے۔ اور پھر اپنی ایک راہ رکھتے تھے۔

گر نہ پڑھیے نماز کیجیے نیاز — آدمی چاہیے کرے کچھ تو!

یہ عجائب المخلوقات تو کسی مرض کی دوا نہیں اور عملی زندگی سے یک قلم کورے۔ ولھم اعمال من دون ذلک ھم لھا عاملون" (تذکرہ ص ۱۳۳ طبع اول)

کتاب میں آپ دیکھیں گے کہ ان سب مسائل سے امام صاحب اور محدثین کو سابقہ پڑا، کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو اب نیا پیدا ہوا ہو۔ اور الحمد للہ محدثین نے دلائل سے اپنے مسلک کی حقانیت ثابت کی اور مخالفین کے شبہات کو توڑا۔

ایک عام شبہ یہ پھیلا دیا گیا ہے کہ موجودہ دور کے مسائل ایسے ہیں جن کے حل سے شریعت اسلامیہ قاصر اور اسلامی فقہ عقیم ہے۔ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اسلامی قانون میں غیر اسلامی قانون کا پیوند لگائے بغیر چارہ نہیں لیکن استاذ محمد ابو زہرہ صاحب نے فقہ حنبلی اور اس کے اصول استنباط پر جس انداز اور جس تفصیل سے بحث کی ہے اس سے یہ حقیقت واشگاف طور پر سامنے آجاتی ہے کہ یہ عامۃ الورود مغالطہ قرآن وسنت وتعامل واقوال صحابہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اگر صحیح اصولوں کی روشنی میں آج بھی کتاب وسنت سے مسائل زندگی کو حل کرنے کی کوشش کی جائے تو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مسلمانوں کو اپنے مذہب سے شغف ہے، اپنے اکابر رجال پر فخر ہے۔ اپنے اسلاف کرام پر ناز ہے، اپنے بزرگوں کے کارنامے سن کر اور پڑھ کر وہ وجد میں آجاتے ہیں۔ لیکن جذبات سے ہٹ کر عمل کی دنیا میں آیئے تو معلوم ہوگا کہ فخر و مباہات، اور ناز و افتخار کی یہ نمائش صرف قول کی دنیا تک محدود ہے، عمل کا میدان یکسر خالی ہے۔

پاکستان دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے، پاکستان کی زبان —— اُردو —— دنیا کی ترقی یافتہ اور ہمہ گیر زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ پاکستان میں ارباب علم و فضل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن حیرت اور حسرت کا مقام ہے کہ ہم اب تک اپنے اکابر کے سوانح تک، تفصیل اور تکمیل کے ساتھ نہیں مرتب کر سکے، کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے باخبر نہ ہو، حال اور مستقبل کے درمیان کوئی ربط نہیں قائم رہ سکتا، اگر حال اور ماضی کے مابین رابطہ نہیں قائم ہے۔

علامہ شبلی مغفور، اور بعض دوسرے ارباب علم اور اصحاب قلم نے ہیروزان اسلام یعنی نامورانِ اسلام کی سوانح عمریاں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن قوم کی قدر دانی کے باعث یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا، اور جو سکوت ان حضرات کی تصنیفات سے پہلے قائم تھا، وہ پھر قائم ہوگیا۔

عالم اسلام میں مصر جس طرح مالی اعتبار سے ممتاز ہے، اسی طرح وہ ذہنی، علمی اور تحقیقی اعتبار سے بھی یگانہ ہے۔ وہاں سے ہر سال درجنوں ایسی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن کا معیار تحقیق کسی بڑے سے بڑے "ریسرچ اسکالر" کے لیے بھی شمع راہ کا کام دے سکتا ہے۔ مصر کے مصنفین جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس موضوع کو اپنا لیتے ہیں، کوئی گوشہ نہیں چھوڑتے، موضوع سے متعلق جتنا مواد بھی دستیاب ہو سکتا ہے ...

خصوصیت کے ساتھ اس قسم کا مواد موجود ہے —— اور یہ اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ——

اس سلسلہ میں اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ کتاب میں "مصالح" کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے فقہ حنبلی کی جس "وسعت" کا ذکر کیا ہے، اس کا مطلب شریعت اور قانون اسلامی کو کھیل بنانا نہیں بلکہ فقہ حنبلی میں "مصالح" اور "سد ذرائع" دونوں اصول ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور درحقیقت دونوں ہی کو ضابطے کے طور پر نافذ کرنے سے اعتدال قائم رہتا اور شریعت کا مقصود قیام امن و عدل و انصاف پورا ہوتا ہے۔

"حیات امام احمد بن حنبلؒ" —— جو "ابن حنبلؒ" کا اردو نام ہے —— کے متعلق ایک ضروری بات یہ عرض کرنی ہے کہ بہت سے محاسن کے باوجود اس میں بعض جگہ مصنف سے فاش غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ چنانچہ امام احمدؒ اور محدثین کے بنیادی مسلک کے خلاف بعض مسائل میں انہوں نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ مثلاً یہ کہ بسلسلہ مسئلہ خلق قرآن "حق بجانب معتزلہ تھا" یا یہ کہ "نزاع لفظی تھا حقیقی نہ تھا" اسی طرح کی اور بھی بعض خامیاں ہیں۔

احقر راقم نے دیانتہً ضروری سمجھا کہ ایسے مقامات کی حواشی میں نشان دہی کر دی جائے، اور مدلل طور پر ثابت کیا جائے کہ مسلک امام احمدؒ اور محدثین کا ہی حق تھا۔ اور معتزلہ کا سراسر باطل۔ علاوہ ازیں بعض جگہ توضیحی حواشی کی بھی ضرورت محسوس کی گئی۔ واللہ ولی التوفیق۔

آخر میں احقر جعفری صاحب موصوف کا ممنون شکریہ ادا کرتا ہے، کہ انہوں نے اردو داں طبقے کو اس کتاب کے استفادہ کا موقع دیا۔ اس کے بعد اپنے محترم دوست مولانا عبدالقادر صاحب ندوی کا بھی —— کیونکہ "ابن حنبل" ان کے سوا یہاں کہیں سے نہیں مل سکتی تھی، ان کی نوازش سے ہمیں حضرت امام احمدؒ اور ان کے مسلک کی خدمت کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی بطور تشکر ضروری ہے کہ یہ اہم کام شاید اتنی جلدی سرانجام نہ پاسکتا اگر عزیزم مولوی حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی سلمہ مہتمم المکتبۃ السلفیۃ لاہور جان فشانی سے دن رات محنت نہ کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی عمدہ شان سے اس کتاب کی اشاعت کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ دعا ہے کہ حق جل شانہ ہم سب کو ... اور احقر کو بھی ... سے سرفراز فرمائے اور اپنے مقبول بندے سے متعلقہ کتاب کو شرف قبولیت سے نوازے ...

... ۱۳۷۶ھ

کام ہے کہ اسے مرتب کرتے ہیں، ترتیب دیتے ہیں، تہذیب وتدوین کے فرائض سے عہدہ برآ ہوتے ہیں، اور پھر کتاب تیار کرتے ہیں، کوئی شبہ نہیں، ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر تیاری کس طرح کی جاتی ہے؟ اور کتنی تیاریوں کے بعد قلم اٹھایا جاتا ہے؟

پیش نظر کتاب اپنے موضوع پر ایک بے مثل کتاب ہے، بدقسمتی سے اُردو زبان میں امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر مواد موجود نہیں ہے، یہ کتاب اس کمی کو بوجہ احسن پورا کردیتی ہے، اور امام صاحب سے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم کردیتی ہے۔

کتاب خاصی طویل ہے، لیکن جیسا کہ عربی مصنفین کا عام قاعدہ ہے، وہ ایک بات کو کئی طرح سے کہتے ہیں۔ یہ خوبی یا نقص اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ میں نے ترجمہ میں اس بات کا اہتمام ملحوظ رکھا ہے کہ کوئی قابلِ ذکر بات چھوٹنے نہ پائے، لیکن عبارت آرائی یا تکرارِ کلام کا ترجمہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ ترجمہ بڑی حد تک لفظی ہے، لیکن میں نے اصول یہ پیشِ نظر رکھا ہے کہ لفظ پر عبارت قربان نہ ہونے پائے، صاحبِ کتاب کے مفہوم کو اور پیش کردہ معلومات کو میں نے اپنی زبان میں، شستگی اور روانی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

جو بات غیر ضروری طور پر طویل ہو گئی ہے اُس کا مغز لے لیا ہے، اور باقی باتیں جو موضوع سے طولِ کلام کے باعث غیر متعلق ہو گئی تھیں، چھوڑ دی ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ، کوئی تحقیق اور کوئی عنوان چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ میں نے اپنے طور پر فاضل مصنف کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کا احساس ہے۔ اسی لیے ایسے بڑے اور اہم کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ہچکچاتا ہوں، لیکن جب قوم کے اکابر، اصاغر کو حکم دیں تو ان کا فرض یہی ہوتا ہے کہ بے چون وچرا تعمیل کر دیں۔ مجھے مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے حکم دیا کہ میں اس کتاب کا ترجمہ کروں، اور میں اس حکم سے سرتابی نہیں کر سکا۔ بے انتہا گراں بار مصروفیتوں کے باوجود خاص طور پر وقت نکال کر مجھے یہ فریضہ انجام دینا پڑا۔

آخر میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ناچیز کوشش کو کامیاب فرمائے، لوگ امت کے اس جلیل القدر انسان کی سیرت، شخصیت، کردار، اور خصائص سے واقف ہوں، اور انہیں اپنانے کی کوشش کریں ؎

مرے قافلہ میں لٹا دے اسے
لٹا دے۔ ٹھکانے لگا دے اسے

رئیس احمد جعفری
۸۹۔ ٹیگور پارک۔ لاہور
۶ر جنوری ۱۹۵۶ء

اِفتتاحیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ ربّ العٰلمین، وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہٖ وسلّم۔

لا کالج (مصر) کے میرے ان لیکچرز کا عنوان تھا "امام احمد بن حنبل — امام دار السلام"۔ پیش نظر کتاب کو ان ہی کا خلاصہ سمجھنا چاہیے۔

اس میں سب سے پہلے مَیں نے امام صاحب کی زندگی اور حالات و سوانح پیش کیے ہیں، پھر ان آفات و مصائب کا ذکر کیا ہے جو راہِ حق میں امام صاحب کو برداشت کرنے پڑے، پھر مَیں نے امام صاحب کے عہد پر ایک نظر ڈالی ہے، اور امام صاحب کے معاصرین پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے ان آراء و افکار کا تجزیہ کیا ہے۔ جو اس زمانہ میں عام طور پر رائج تھے، بعد ازاں مَیں نے بتایا ہے کہ امام صاحب نے اصولِ دین، قیامِ سنّتِ نبویہ اور تاسیسِ فقہ حنبلی کے سلسلہ میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد مَیں نے وضاحت کے ساتھ اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ امام صاحب نے ترویجِ سنّتِ نبوی کے لیے کس طرح اپنی ساری زندگی وقف کر دی، کس طرح انہوں نے احادیث کا مجموعہ مرتب کیا۔ اور اس مجموعے نے امت کو کتنی بڑی سعادت سے ہمکنار کیا، پھر مَیں نے امام صاحب کی فقہ کو لیا ہے، اور بتایا ہے کہ فقہ حنبلی کا اصول کیا ہے؛ اس کی اساس و بنیاد کیا ہے؛ اس کا اصول اور ضابطہ کیا ہے؛ پھر مَیں نے ثابت کیا ہے کہ یہ سب کچھ ثمرہ تھا سنتِ نبوی کی وراثت اور تتبع کا، انہوں نے ہر ہر قدم پر حدیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)، آثارِ صحابہؓ، اور تابعین کرام کے فتاویٰ کو پیشِ نظر رکھا۔ اور اسی بنیاد پر اپنی فقہ کی عمارت تعمیر کی۔ پھر آخر میں ان اصولِ فقہیہ کا ذکر کیا ہے جن پر فقہ حنبلی مبنی ہے، ان ادوار کا ذکر کیا ہے جن سے یہ مذہب

کہ یہ مذہب ایک زندہ اور پائندہ، مذہب بن گیا۔ جس میں صلاح بھی تھی اور اصلاح بھی!
اگر خدا کا فضل اور اس کی توفیق و اعانت نہ شامل ہوتی، تو یہ کام انجام تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

انه نعم المولیٰ و نعم النصیر

محمد ابو زہرہ
(صفر ۱۳۶۷ھ۔ دسمبر ۱۹۴۸ء)

حصہ اوّل

تمہید

حضرت امام کے بارے میں ابوثورؒ کہتے ہیں :-

" اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ احمد ابن حنبل اہل جنت میں سے تھے تو وہ ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا، بلکہ ایک سچی بات کہتا ہے ۔ اگر کوئی شخص خراسان اور اس کے مضافات کا چکر لگائے تو اسے لوگ یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ احمد ابن حنبل ایک مرد صالح تھے ۔ اسی طرح اگر کوئی شخص شام اور اس کے اطراف، عراق اور اس کے آس پاس کا چکر لگائے تو سب کو یہی کہتے ہوئے پائے گا کہ احمد ابن حنبل رجل صالح" (احمد اچھے آدمی ہیں) ۔ لہٰذا اس امر پر ایک طرح کا اجماع ہے ۔ اور اگر اس قول سے انکار کیا جائے تو گویا اجماع باطل ہو جاتا ہے ۔[۱]

یہ قول ایک فقیہ اور محدث کا ہے جو حضرت امام کا ہم عصر تھا، اس کا مطلب صرف اپنے نزدیک ہی امام احمد کے علو مرتبت کا بیان کرنا نہیں، بلکہ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت امام کی قدر و منزلت ان کے تمام معاصرین کے دلوں میں گھر کر چکی تھی ۔ عالم اسلام کا اس امر پر اجماع تھا کہ وہ مرد صالح ہیں، ان کا تقویٰ، زہد و ورع، قوت ایمانی، یہ سب چیزیں ہر شخص کی زبان پر تھیں ۔ اگر اجماع حجت ہے تو بلاشبہ حضرت امام کے صلاح و تقویٰ پر یہ حجت قائم ہو چکی ہے ۔ نہ اس پر کوئی شبہ وارد کیا جا سکتا ہے نہ شک کی گنجائش ہے ۔

علو مرتبت

حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام نے دور ابتلا دیکھا، اسے خوبی کے ساتھ نباہا ۔ اپنے نفس کو پاک اور صاف کر لیا، آفات و مصائب کے فتنہ میں مبتلا ہوئے اور اس سے اس طرح نکلے جیسے بھٹی سے تپ کر سونا نکلتا ہے ۔ اور اپنے آپ کو ہر طرح کے میل کچیل اور خرابی سے پاک و صاف کر لیا ۔ احمد کی دنیا اور اس کی زینت کے بارے میں آزمائش کی گئی تھی، اس دام سے بھی وہ صحیح سلامت

نکل گئے۔ اگر ان کا نفس حریص ہوتا تو وہ طیبات حیات پر راغب ہوتے لیکن ان چیزوں کو انہوں نے ٹھکرا دیا۔ دنیاوی آسائش کے پھندوں کو انہوں نے کاٹا اور توڑا۔ ہر وہ چیز ترک کر دی جو مشکوک تھی اور وہ چیز اختیار کر لی جو شک و شبہ سے ماوراتھی۔ جاہ و منصب نے انہیں بلایا لیکن یہ دعوت انہوں نے رد کر دی۔ زندگی کی آسائش و فراخی کی کسی چیز میں بھی اپنا دل نہ اٹکایا جس طرح صیقل زدہ اور صاف شفاف جسم پر میل نہیں ٹکتا۔ احمد کی آزمائش تنگدستی، فقر و فاقہ اور غربت و فلاکت سے بھی کی گئی لیکن تنگدستی نے ان کے قلب پر چھاپہ نہ مارا اور فقر و فلاکت نے ان کی عقل کو فتنہ میں مبتلا نہیں کیا۔ چار خلفاء نے یکے بعد دیگرے احمد کو آزمائش کی امتحان گاہ میں گھسیٹا لیکن اس میدان سے وہ ایک مرد پاکباز اور پاک سرشت کی حیثیت سے برآمد ہوئے۔ اختیار و آزمائش کے طریقے متنوع تھے۔ مامون نے انہیں قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا کیا۔ وہ زندان خانے کی طرف اس طرح بڑھے کہ بیڑیوں کا بوجھ اور ہتھکڑی کی جھنکار حرکت و جنبش میں مانع تھی۔ معتصم نے انہیں سزائے قید دی اور کوڑوں سے پٹوایا۔ واثق نے ان پر بندشیں عائد کیں اور زندگی تنگ کر دی لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی ان میں تزلزل پیدا نہ کر سکی۔ ان آزمائشوں کے بعد ایک بہت بڑی بلکہ سب بڑی آزمائش سے دو چار ہونا پڑا۔ متوکل نے سونے اور چاندی کے ڈھیر ان کے گرد جمع کر دیئے مگر انہوں نے پورے استغنا کے ساتھ سیم و زر کے انبار کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے ایوان نعمت سے بھرے ہوئے دسترخوان اس وقت ٹھکرائے جب وہ بھوک سے نڈھال ہو رہے تھے۔ انہوں نے سوز ریا نی کی تھیلیاں اس وقت واپس کیں جب ان کی جیب خالی تھی۔ انہوں نے حریر و پرنیاں کی پوشاکوں پر اس وقت بھی نگاہ غلط انداز نہیں ڈالی جب بوسیدہ اور کہنہ لباس ان کے جسم کی زینت تھا۔ انہوں نے کسی ایسی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا جو مشکوک یا شان تقویٰ کے خلاف ہو۔

شخصیت کا اجمالی خاکہ

حضرت امام کو اس کے بعد ایک اور خوفناک اور مہلک آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ تھی عوام کی مقبولیت اور عوام میں ہر دلعزیزی۔ جب وہ تمام آزمائشوں سے کامیاب ہو گئے تو اس مہلک آزمائش نے انہیں اپنے دام میں اسیر کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے بھی بچ گئے۔ مقبولیت اور محبت نے نہ ان میں خود پسندی پیدا کی نہ نخوت، بلکہ ان کی زندگی ایسے مرد مومن کی زندگی رہی جو خود اپنا محتسب ہوتا ہے۔ جلال خداوندی کے سامنے سرنگوں رہتا ہے۔ تواضع اور خاکساری کی زندگی بسر کرتا ہے۔ مدح و ثنا کے الفاظ اسے راہ صواب سے نہیں ہٹاتے۔ احمد

میں بھی ان پر نہ پیلا اور عیش و نعم کے گرداب میں بھی وہ انہیں گرفتار نہ کر سکا۔ مدح و ثنا کا طوفان بھی ان میں خود پسندی، تکبر اور غرور کے جذبات نہ پیدا کر سکا۔ احمدؒ نے شیطان کے پیدا کیے ہوئے ہر روزن کو بند کیا اور جادۂ استقامت پر گامزن رہے۔ حمد و ثنا سے نہ صرف یہ کہ متاثر نہیں ہوئے بلکہ متنفر رہے۔ یہ جان کر اس سے بھاگتے رہے کہ یہ سب سے بڑی مصیبت ہے۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، فرماتے تھے :۔

"اگر مجھے راستہ ملے تو میں کہیں کسی نامعلوم مقام کی طرف بھاگ جاؤں، یہاں تک کہ میرے ذکر کا سلسلہ ہی بند ہو جائے۔ جی چاہتا ہے مکہ کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں چھپ رہوں یہاں تک کہ کوئی مجھے یاد نہ کرے۔ میں شہرت کی آزمائش میں مبتلا کیا گیا۔ اس سے بچنے کے لیے صبح و شام موت کی آرزو کرتا رہتا ہوں۔"[1]

کیا امام احمد فقیہ نہ تھے؟ "احمد مرد صالح تھے"۔ یہ وہ سچی بات ہے جو ممالک اسلامیہ میں ہر جگہ ان کی زندگی ہی میں تسلیم کر لی گئی تھی۔ پھر دور گزرتے رہے اور تاریخ کے صفحات الٹتے رہے لیکن احمدؒ کے خدوخال اسی طرح تابناک اور درخشاں رہے۔ وہ بہت بڑے محدث تھے اور یہ ان کے صلاح و تقویٰ کا تقاضا تھا، وہ ایسے فقیہ تھے کہ ان کی نیکی ان کے تفقہ پر حاوی تھی۔ ان کے صلاح و تقویٰ کا اقتضا یہ تھا کہ وہ فقہ کے میدان میں بہت دور تک آگے نہ جائیں۔ وہاں وہ ٹھٹک جاتے تھے جہاں سے دوسرے اپنا سفر شروع کرتے تھے۔ ان پر تردد اور تامل کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جب دوسرے جزم اور عزم کی وادی میں رہروی کر رہے ہوتے تھے۔ وہ معنیٰ کی معنویت پر خاموشی اختیار کرتے تھے جب دوسرے نطق و کلام کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ فتویٰ دینے سے گریز کرتے تھے جبکہ دوسرے جلد بازی سے کام لیتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ ان کی فقہ پر ان کی حدیث دانی غالب تھی۔ وہ آثارِ رسولؐ و صحابہ کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض علماء سابقین یہ خیال کرنے لگے کہ وہ محدث تھے فقیہ نہ تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن جریر طبری نے اپنی کتاب اختلاف الفقہاء میں امام احمدؒ کے مسلک کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کا قول تھا کہ وہ محدث تھے، فقیہ نہ تھے۔ چنانچہ حنابلہ کی طرف سے ان کو تکلیف بھی دی گئی۔ بعض دوسرے فقہاء جو خلافیات کے مسائل

[1] ترجمۃ الامام ... من تاریخ الاسلام للذہبی ... طبع المعارف ... فی مقدمۃ المسند ...

میں بحث کرتے ہیں ان کا ذکر نہیں کرتے۔ مثلاً طحاوی، دبوسی، نسفی، اصیلی، مالکی اور غزالی وغیرہ نے اختلافی مسائل میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ابن قتیبہ نے اپنی کتاب المعارف میں فقہاء میں ان کا شمار نہیں کیا ہے۔ مقدسی نے اپنی کتاب احسن التقاسیم میں انہیں اصحاب حدیث میں شمار کیا ہے۔

قاضی عیاض اپنی کتاب مدارک میں کہتے ہیں "احمدؒ امام فقہ نہ تھے نہ فقہی ماخذوں پر جودتِ نظر کے حامل تھے"[1]

اس رائے پر ایک نظر جو لوگ اس بات کے منکر ہیں کہ احمدؒ فقیہ تھے وہ ثبوت یہ دیتے ہیں کہ فقہ میں ان کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ نہ مسند میں اس کا کوئی اثر پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں تدوینِ فقہ کا کام بڑی حد تک مکمل ہو چکا تھا۔ محمد بن حسن نے فقہ عراق کو جمع کر لیا تھا۔ ابو یوسف (عراقی) نے فقہ میں متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ امام شافعی اپنے مسلک اور کتابوں کا املا کر چکے تھے۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس سلسلے میں امام احمدؒ کے ہاں کوئی چیز نہیں ملتی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ محدث تھے فقیہ نہ تھے۔ یا کم از کم یہ کہ ان کی فقہ پر حدیث غالب تھی۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ جو محدثین فقہی مسائل میں صاحب رائے تھے جیسے بخاری اور مسلم، انہیں زمرۂ محدثین سے خارج کر کے فقہاء کے گروہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ اعتبار غلبۂ منہاج کا کیا جاتا ہے، جس پر تحدیث غالب ہوگی وہ اسی میں مخصوص مانا جائے گا اور محدث قرار دیا جائے گا۔ جس کے فتوے زیادہ ہوں اور تفقہ کا غلبہ ہو وہ فقیہ مانا جائے گا۔ ہاں! جس شخص میں دونوں چیزیں متوازن طور پر جمع ہیں وہ صرف امام مالکؒ ہیں۔

بجائے فقہ کے حدیث میں شہرت پانے کی وجہ اس اعتبار سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ امام احمدؒ محدث ہونے کے باوجود فقیہ بھی تھے۔ اور اگرچہ ہم اس کا

[1] تاریخ الفقہ للحجوی ص ۲۲ ج ۲۔

[2] امام احمدؒ کے معاصرین بلکہ ان کے بعض اساتذہ نے بھی ان کے فقیہ ہونے کی تصریح کی ہے۔ ترجمۃ الامام من تاریخ الاسلام للذہبی طبع المعارف فی مقدمۃ المسند میں امام شافعی، امام عبدالرزاق، امام نسائی، احمد بن سعید رازی، امام اسحاق بن راہویہ، ابن ابی حاتم وغیرہم سے ایسی تصریحات موجود ہیں (ص ۶۴-۶۵-۶۸-۶۹ وغیرہ) شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں (ص ۱۴۹-۱۶۱ ج ۱) اہل الحدیث اور اہل الرائے کے مسالک کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ اہل حدیث کا ذکر فرماتے ہوئے

اعتراف کرتے ہیں کہ ان پر حدیث غالب تھی اور یہ بھی مانتے ہیں کہ انہوں نے فقہ میں اپنا کوئی اثر مدوّن اور مرتب صورت میں نہیں چھوڑا اور اس کے برعکس حدیث میں اپنی عظیم و جلیل کتاب مسند یادگار چھوڑی، لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ فقہی مسائل کی جمع و تدوین کا کام انہوں نے اپنے شاگردوں پر چھوڑ رکھا تھا۔ جو ان کے اقوال و فتاوی اور افکار و آراء کی جمع و تدوین کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سے وہ فقہی مجموعہ تیار ہو گیا جو ان کی طرف منسوب ہے اور ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس مجموعہ کو جسے علمائے عصر قبول کر چکے ہیں، صرف اس لیے نظر انداز کر دیں کہ وہ فقیہ کے بجائے محدث مشہور تھے، اور انہوں نے فقہ میں کوئی کتاب مدوّن نہیں کی۔ حالانکہ ان کے زمانے میں تدوینِ فقہ کا کام زور شور سے ہو رہا تھا۔ اور جن لوگوں نے یہ کام کیا تھا اُس میں اُن کے لیے اُسوۂ حسنہ موجود تھا۔

اس بات پر علامہ ابن قیمؒ نے بھی گفتگو کی ہے۔ وہ اپنی کتاب اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں:-

"امام احمد نے فقہ میں کوئی کتاب اس لیے مدوّن نہیں کی کہ حدیث کے علاوہ کسی اور موضوع پر وہ تصنیفِ کتب کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اُن کے حسنِ نیت سے واقف تھا لہٰذا ان کے تلامذہ نے اُن کے کلام اور فتویٰ کی تدوین کی طرف پوری پوری توجہ کی۔"

علامہ ابن قیمؒ اس مسئلے پر بحث و نظر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

"احمد کے نصوص جامع کبیر میں خلاّل نے بیس جلدوں میں جمع کیے ہیں۔ ان کے فتوے اور مسائل لوگوں میں ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں ملتے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اہل سنت کے امام و رہنما بن گئے۔ یہاں تک کہ ان کے مسلک کے مخالف مجتہد، اور مقلدین مذاہب بھی ان کے اجتہاد کے آگے سر جھکانے لگے۔ اور ان کے نصوص و فتاوی کی عظمت کے اعتراف پر مجبور ہو گئے اور یہ ماننے لگے کہ ان کے افکار و آراء کتاب و سنت اور صحابہ کے فتووں سے بہت قریب تھے جو شخص امام احمد کے فتووں اور صحابہ کے فتاوی پر نظر ڈالے گا وہ دونوں کو ایک دوسرے سے مطابق پائے گا اور ان کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوگا کہ یہ سب ایک ہی چراغ

۲۔ بن حنبل الخ یعنی امام احمد عظمتِ شان، وسعتِ روایت، مراتبِ حدیث کی پہچان، اور فقہی گہرائی میں سب سے اونچے تھے۔ اس کے بعد جن فقہائے محدثین کا ذکر کیا ہے ان میں امام اسحاق بن راہویہ، امام بخاری، امام مسلم، امام

کی مختلف کرنیں ہیں۔

امام احمدؒ نے فقہ میں اگرچہ کوئی کتاب نہیں لکھی بلکہ وہ اس کام سے منع کیا کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو فقہ کی کتب مدوّنہ کے مطالعے سے بھی روکتے تھے۔ اس اندیشہ کے پیشِ نظر کہ مبادا لوگ حدیث سے بے نیازی برتیں۔ تاہم ان کے فقہی مسائل ان کے اصحاب کی روایت سے مدوّن ہوئے ہیں۔ انہوں نے نصوص و فتاوی کی بڑی تعداد مبسوط و ضخیم کتابوں میں نقل کی، اس نقل میں کہیں کہیں اختلاف بھی ہو گیا۔ اس لیے کہ روایت کی بنیاد نقل پر ہے اور حضرت امام نے اپنی فقہ کے لکھنے پر کبھی توجہ نہیں کی لہٰذا ضروری اور ناگزیر تھا کہ نقل کرنے والوں میں کہیں کہیں اختلاف بھی ہو اور جب نقل میں اختلاف ہو تو ترجیح کا موقف اختیار کیا جائے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طبقات کی کتابوں میں بعض اصحاب کے نقل کے بارے میں گفتگو موجود ہے چنانچہ ابن فراء اپنی طبقات میں ابوبکر مروزی اور اثرم اور مسدد اور حرب وغیرہ سے فقہ حنبلی کا کثیر حصہ نقل کرتے ہیں اور اس کی نسبت امام جلیل احمد ابن حنبل کی طرف کرتے ہیں۔

حضرت امام کی طرف بعض غلط انتساب

یاد رہے کہ علم حدیث کے مؤرخین نے یہ بھی کہا ہے، کہ "دو نیک آدمی، بُرے ساتھیوں کی آفت میں مبتلا ہوئے، یعنی جعفر بن محمد اور احمد بن حنبل"۔ جعفر بن محمد سے مراد حضرت جعفر صادق بن حضرت باقر ہیں جو ائمہ شیعہ میں سے تھے۔ فقہ امامیہ کی کتابوں میں بہت سے اقوال ان کی طرف غلط طور پر منسوب ہیں اسی طرح امام احمد کا معاملہ ہے بعض حنابلہ نے عقائد سے متعلق بعض افکار و آراء ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ مشکوک ہیں، اس لیے کہ جب راوی کے صدق میں شک ہو تو مروی کی صحت بھی طعن سے خالی نہیں ہوتی۔

فقہ حنبلی کی حیثیت

جب ہم فقہ حنبلی کی طرف تحقیقِ نسبت کے بعد اور ان شکوک کے ازالہ کرنے کے بعد اس طرف قدم بڑھاتے ہیں تو فقہ حنبلی کو ایک زندہ، قوی اور پائندہ فقہ پاتے ہیں جس میں دو عنصر خاص طور پر نمایاں اور درخشاں ہیں۔

(۱)۔ پہلا عنصر

فقہ احمد یعنی فقہ حنبلی وہ فقہ ہے جسے اگر "فقہ اثری" کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کی آراء کو دی گئی ہے اور اگر صحابہ میں دو رائیں ہوں تو ان میں سے کوئی بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو اس کا حق نہیں دیتے تھے کہ صحابہ کے اختلاف کی صورت میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں۔ کیونکہ ایک کی ترجیح دوسرے کے نقص کی متقاضی ہے اور وہ یہ رتبہ اپنے آپ کو بغیر نص کے نہیں دیتے تھے اور نہ ہی یہ مرتبہ وہ کسی اور کو دینے پر تیار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ طریق سلف اور آثار صحابہ کی پیروی میں وہ بہت زیادہ سخت تھے۔ ان کے اجتہادی مسائل مسلک صحابہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگرچہ صراحتہً اس کا ذکر نہ بھی کریں۔

(۲)۔ عنصر ثانی | شریعت کے جس حصہ کا تعلق "معاملات" سے ہے، ان میں ان کا اصول یہ ہے کہ اگر نص موجود نہ ہو اور آثار رسول، صحابہ بھی علم میں نہ ہوں اور کتاب و سنت پر قیاس کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ ہو تو پھر مسئلہ کی اصل اباحت قرار دی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے فقہ حنبلی عقود (خرید و فروخت، نکاح وغیرہ) اور شروط میں آسانی، نرمی اور تیسیر کے لحاظ سے وسیع ترین فقہ ہے، اس لیے کہ شروط و عقود کو اس نے اس وقت تک صحیح ٹھہرایا ہے۔ جب تک بطلان کی کوئی واضح دلیل موجود نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ "صحت" کا جہاں تک تعلق ہے وہ کوئی دلیل طلب نہیں کرتی جیسا کہ عام فقہائے مسلمین کا مسلک ہے۔ یعنی وہ دلیل بطلان میں طلب کرتی ہے نہ کہ صحت میں، آگے چل کر اس پہلو اور اس زندہ مسلک اور اس کے خصائص پر ہم تفصیل سے گفتگو کرینگے انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس مذہب جلیل پر اگر ہمیں بحث و گفتگو اور غور و خوض کرنا ہے تو دو چیزیں بہر حال ہمیں پیش نظر رکھنی ہونگی۔

پہلی چیز یہ کہ وہ کون سے اصول ہیں جن پر اس مذہب کا استنباط قائم ہے اور فروع کا اخراج ان سے کیوں کر ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ فروع کے لیے کون سے قواعد و ضوابط مقرر ہیں۔

اب ہم اگلے صفحات میں مذہب حنبلی کے نشو و نما اور طریق تخریج پر بحث و گفتگو کریں گے۔

جیساکہ [illegible]

نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

حیات احمد بن حنبلؒ

۱۶۴ھ ——— ۲۴۱ھ

مولد و منشا مشہور و معروف روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل ربیع الاول ۱۶۴ھ میں تولّد ہوئے۔ آپ کے صاحبزادگان صالح اور عبداللہ کے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ عبداللہ کہتے ہیں۔

"میں نے اپنے والد سے سُنا، وہ فرماتے تھے کہ میں ۱۶۴ھ کے ربیع الاول میں پیدا ہُوا"

جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے، امام صاحب کے زمانۂ ولادت کے بارے میں روایات کے اندر کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے، جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی تاریخ ولادت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی تاریخ ولادت خود امام احمد کو معلوم ہے، اور وہ اس کی روایت کرتے ہیں، ظاہر ہے ان کی رائے اس معاملہ میں بالکل آخری اور قطعی حیثیت رکھتی ہے، اب راویوں کے لیے ظن و قیاس کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی، نہ مؤرخین کے لیے نکتہ سنجی اور دقیقہ آفرینی کی کوئی گنجائش ہے، کیونکہ اپنی ولادت کے بارے میں خود آپ کا بیان ہر شک اور ظن کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے۔

تاریخ ولادت و وفات جس طرح آپ کی ولادت کی تاریخ معروف و معلوم اور غیر مشکوک ہے۔ اسی طرح آپ کی تاریخ وفات بھی یقینی اور قطعی طور پر معلوم ہے کہ ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ میں آپ نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا، جمعہ کے دن آپ کا جنازہ اٹھا، اور تدفین و تکفین عمل میں آئی۔ آپ کی تاریخِ وفات کا تعین کے ساتھ معلوم ہونا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بغداد کی تاریخ میں یہ تاریخ خاص طور پر اہمیت کی حامل اس واقعہ کے سبب

بن چکی ہے کہ تمام ممالک اسلامیہ میں یہ تاریخ یادگار دن کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ آپ کے جنازہ میں ایک ہجوم عظیم نے شرکت کی، جس کی تعداد آٹھ لاکھ افراد سے کسی طرح کم نہیں تھی، کیونکہ جب آپ کی وفات ہوئی تو آپ کی شہرت حدود عراق سے نکل کر عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکی تھی، آپ کی وفات ایک ایسا حادثہ کبیرہ تھا جسے ہر قسم کے لوگوں نے یاد رکھا، اور بغیر کسی شک و ریب کے یہ خبر صحیح تسلیم کی گئی۔

امام احمد کی ولادت بغداد میں ہوئی۔ آپ کی ماں جب مرو سے جہاں آپ کے والد مقیم تھے، بغداد آئیں، تو آپ شکم مادر میں تھے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ مرو میں پیدا ہوئے، لیکن صحیح یہ ہے کہ آپ نے بغداد ہی میں جنم لیا۔

نسب آپ کا نسب عربی ہے، باپ اور ماں کی طرف سے آپ شیبانی ہیں۔ نہ آپ عجمی تھے، نہ آپ کے حسب نسب میں کچھ کھوٹ تھا، نہ کسی طرح کی ملاوٹ تھی۔ آپ خالص عرب تھے۔ شیبان بھی عدنانی قبیلہ کا نام ہے، جو نزار بن معد ابن عدنان کے واسطہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر مل جاتا ہے۔ یہ قبیلہ اپنی دلیری، شجاعت، حمیت اور غیرت کے اعتبار سے خاص طور پر ممتاز رہا ہے۔ مثنیٰ بن حارثہ اس قبیلہ کا ایک فرد تھا جس نے عہد ابوبکر صدیق میں دلیری اور شجاعت کے ساتھ جنگ عراق میں نمایاں حصہ لیا۔ بلکہ عراق کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے صدیق اکبرؓ کو آمادہ بھی اسی نے کیا تھا۔ یہ قبیلہ جس طرح اسلام میں نامور ثابت ہوا، اسی طرح عہد جاہلیت میں بھی، یعنی اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی اپنے ان خصائص کی بنا پر معزز اور ممتاز تھا، چنانچہ ربیعہ قبائل میں یہ چوٹی کا قبیلہ مانا جانے لگا۔ انہیں قبائل میں، قبیلہ شیبان تعداد کے اعتبار سے بھی ہمیشہ غالب رہا۔ عہد اسلام میں بھی، اور عہد جاہلیت میں بھی! یہ قبیلہ نہ صرف تعداد کے اعتبار سے زیادہ رہا، بلکہ وقار اور تاثر کے لحاظ سے بھی اس کی عظمت تسلیم کی جاتی رہی۔

قبیلۂ شیبان بصرہ اور اس کے بادیہ میں شیبان کے پڑاؤ تھے، عہد جاہلیت میں یہ لوگ عراق سے بہت قریب آباد تھے۔ پھر جب حضرت عمرؓ بن خطاب نے بصرہ بسایا تاکہ وہاں عرب آبادیاں قائم کریں تو شیبان نے اس سرسبز صحرائی علاقہ میں آکر بود و باش اختیار کرلی اور [illegible] سے بھی [illegible] رابطہ و تعلق قائم رکھا۔

حضرت امام احمد کا خاندان (باپ اور ماں دونوں طرف سے) اس شہر میں آکر بس گیا، آپ کے دادا عبدالملک بن سوادہ بن ہند کا شمار بنو شیبان کے سربرآوردہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ عرب قبائل ان کے پاس آکر ٹھہرتے تھے، اور وہ بڑی سیرچشمی اور اولوالعزمی سے فرائض میزبانی انجام دیتے تھے۔

چونکہ آپ کا خاندان بصرہ میں رہنے لگا تھا، لہٰذا البصری کہلائے جانے لگا[1]۔ روایت ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ جب بصرہ تشریف لاتے تھے تو دینی شیبان کی ایک شاخ، مازن کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ حضرت امام سے اس بارے میں سوال ہوا تو فرمایا یہ میری آبائی مسجد ہے۔

حضرت امام کے والد اور دادا یہ تو معلوم ہو چکا کہ احمد بنو شیبان کے ایک فرد تھے۔ اور اس قبیلے کے لوگ بصرہ میں بود و باش رکھتے تھے، اب ہم آپ کے والد اور دادا کے متعلق تحقیقی طور پر چند کلمات عرض کریں گے۔ آپ کے والد محمد بن حنبل تھے اور دادا حنبل بن ہلال۔ آپ کا خاندان مستقل طور پر بصرہ میں مقیم نہیں رہا، بلکہ نقل مکانی کرتا رہا، چنانچہ آپ کے دادا خراسان منتقل ہو گئے تھے، اور اموئیوں کے عہد میں سرخس کے گورنر ہو گئے، پھر جب عباسی دعوت اُبھری، تو انہوں نے اس کی امداد و اعانت کی، اور ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو گئے جو انقلاب حکومت چاہتے تھے۔ چنانچہ اس راستہ میں انہیں ایذائیں اور تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑیں[2]۔

آپ کے والد، محمد ایک سپاہی تھے۔ لیکن ابن جوزی اصمعی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فوج کی کمان کرتے تھے۔ ابوبکر ابن بھی اصمعی سے اس طرح کی روایت کرتے ہیں کہ "ابو عبداللہ احمد ابن حنبل کے والد فوج میں کماندار تھے[3]۔" ابن جوزی کہتے ہیں "آپ کے والد مجاہدوں کے لباس میں ملبوس رہتے تھے[4]۔"

بہرحال وہ مناقب کی روایت کے مطابق کماندار ہوں، یا ابن جوزی کی روایت کے مطابق غازی۔ قدر مشترک بہرحال یہ ہے کہ وہ سپاہی تھے جو اس زمانہ میں عربوں کی ایک عام عادت تھی۔ وہ لوگ کاشتکاری اور مزدوری کو مایۂ فضیلت نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں اگر فخر و ناز تھا تو بہادری اور شجاعت پر۔ جنگ جوئی،

[1] المناقب لابن جوزی ص ۱۰۳
[2] تاریخ بغداد ص ۱۴ ج ۴۔
[3] المناقب ص ۱۴
[4] المسعد ابن الجوزی [illegible]

اور سپہ گری پر۔ آپ کے دادا تو بڑے عالی منصب تک پہنچ گئے۔ سرخس کی گورنری پر وہ مدت تک فائز رہے پھر دعوتِ عباسیہ کے ایک سرگرم کارکن بن گئے، اور اس کے راستہ میں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں بھی جھیلیں۔

خلافتِ عباسیہ اور حضرت امام کا خاندان

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ امام صاحب کا خاندان جب بغداد منتقل ہوا تو خلافتِ عباسیہ کے قیام و دوام کے لیے سرگرم کار ہو گیا۔ اس تحریک سے اس کا تعلق کبھی منقطع نہیں ہوا۔ اگرچہ عباسیوں کے دورِ حکومت میں اس خاندان کے کسی فرد کو، گورنری کا منصب نہیں ملا۔ پھر بھی مان دان قائم رہی۔ چنانچہ روایت ہے کہ امام احمد کے چچا بغداد کے حالات سے، جب خلیفہ باہر ہوتا تھا اس کے بعض حکام کو مطلع کرتے رہتے تھے، تاکہ وہ امیر المومنین تک یہ احوال پہنچا دیں۔ امام احمد بچپن ہی سے ایسے کاموں میں شرکت سے اجتناب کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک روایت کے مطابق کسی والی نے ایک بار کہا:

"بغداد کی خبریں مجھے ملنے میں تاخیر ہوئی، میں احمد بن حنبل کے چچا کی جانب متوجہ ہوا، اور کہا "آج کی خبریں ہمیں نہیں ملیں، حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ انہیں امیر المومنین کی خدمت میں لکھ بھیجوں ــ"!

امام احمد کے چچا نے یہ سن کر کہا:

"خبریں تو میں نے اپنے بھتیجے احمد کے ہاتھ آپ کو روانہ کر دی تھیں!"

حضرت امام کا کردار بلند

اب امام احمد والی کی خدمت میں حاضر کیے گئے۔ وہ ابھی بالکل نوعمر اور کم سن تھے۔

چچا نے کہا:

"کیا میں نے تمہارے ہاتھ خبریں نہیں بھیجی تھیں کہ والی تک پہنچا دو؟"

امام احمد نے جواب دیا:

"ہاں! دی تو تھیں!"

احمد نے فوراً کہا

"میں نے انہیں پانی میں پھینک دیا!"

والی یہ سن کر افسوس کرنے لگا۔ اس نے کہا۔

"یہ صاحبِ ورع لڑکا ہے۔ ہم اس کے ساتھ کوئی سختی نہیں کر سکتے!"

اس قصہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام احمد کے خاندان کا تعلق خلافتِ اسلامیہ، اس کے حکام، اور گورنروں سے برابر قائم رہا، لیکن امام احمد اس روش کو نوعمری اور کم سنی ہی کے زمانہ سے اپنے طبعی زہد و ورع کے باعث پسند نہیں کرتے تھے۔

امام احمد کے نانا کا شمار بنو شیبان کے سرداروں اور سربرآوردہ اصحاب میں ہوتا تھا۔ وہ کریم، سخی اور فراخ حوصلہ انسان تھے، عربوں کے لیے ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ عرب قبائل ان کے گھر پر مہمان کی حیثیت سے آکر اترا کرتے تھے۔ اور وہ بڑی خوشی اور عالی حوصلگی کے ساتھ ان کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے دادا تھے جو گورنری کے منصب پر فائز تھے۔ پھر ان کے کانوں میں ایک ایسی دعوت ــــ دعوتِ عباسیہ ــــ کی آواز پڑی جسے وہ حق سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسے سنا، لبیک کہا اور اس کی امداد و اعانت پر سرگرمی کے ساتھ عامل ہو گئے۔ اس امداد و اعانت کے سلسلہ میں انہیں آفات و مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑا، تو کسی جھجک اور خوف کے بغیر ان آفات و مصائب کو انہوں نے خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کیا۔ ہر مصیبت کو انہوں نے صبر کے ساتھ انگیز کیا۔ اسی طرح ان کے والد کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سراپا غیرت و حمیت فرد تھے۔ مجاہدوں کے لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ ان کے جذبۂ جہاد و پیکار کا یہ عالم تھا کہ اسی حالت میں انہوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

ثمرِ نورس

امام احمد انہی دونوں بزرگوں (باپ اور دادا) کے ثمرِ نورس تھے۔ ان کی رگوں میں ایک شریف، بہادر اور پُرجوش باپ کا خون گردش کر رہا تھا۔ عزتِ نفس، قوت و عزم، صبر و تحمل، مکارہ اور مصائب کو انگیز کرنے کی عادت انہیں اپنے خاندان سے وراثت میں ملی تھی۔ ان کا ایمان راسخ اور قوی تھا۔ جب بھی آفات و ابتلا کا نزول ہوتا تھا، ان کے یہ خصوصیات اور زیادہ ابھر جاتے تھے، ان میں اور زیادہ چمک دمک پیدا ہو جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب بھی مہیا کر دیئے تھے کہ یہ موروثی خصائل و ملکات نشوونما پائیں، ترقی کریں، اُبھریں اور بڑھیں۔

اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امام نے ابتدا ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ وہ تنہا ہیں، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اور ماں کی شفقت بھری گود سے محروم ہو گئے۔ باپ کا جس وقت انتقال ہوا، وہ بالکل بچے تھے، وہ کہا کرتے تھے،

"نہ میں نے اپنے باپ کو دیکھا ہے نہ دادا کو"!

بلکہ مشہور یہ قول ہے کہ والد کی وفات ان کی ولادت کے بعد ہی واقع ہو گئی تھی جبکہ وہ تیس سال کے ابھی جوان عمر تھے۔ ظاہر ہے اس وقت وہ صغیر سن تھے، نہ کسی چیز کا احساس تھا نہ شعور۔ باپ کے بعد ماں نے مہر مادری کے زیر سایہ ان کی پرورش شروع کی۔ باپ نے جو ترکہ چھوڑا تھا وہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ صرف بغداد میں ایک گھر تھا یا اتنی زمین جس سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی اور گھر کا کام چل جاتا تھا۔ فراغت اور عیش و نعم کے ساتھ نہیں بلکہ تنگی اور ترشی کے ساتھ۔ اگرچہ اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ آپ دوسروں کی امداد سے مستغنی رہے اور کسی کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلانا پڑا۔

نعماتِ الٰہی | حضرت امام کو اللہ تعالیٰ نے یہ پانچ چیزیں ایسی عطا فرمائی تھیں جنہوں نے ان کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر میں ان کی بہت مدد کی۔

(۱) حسب و نسب کا شرف

(۲) یتیمی ——— جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں اعتمادِ نفس پیدا ہوا، اور وہ اپنے اوپر بچپن سے بھروسہ کے خوگر ہو گئے۔

(۳) فقر و فلاکت ——— مگر ایسا فقر اور ایسی فلاکت جس نے انہیں گو عیش و نعم سے لذت اندوز نہیں کیا، لیکن ذلتِ نفس بھی نہیں پیدا ہونے دی۔

(۴) قناعت ——— جس نے ان کے اندر علوِ فکر و نظر پیدا کیا۔

(۵) تقویٰ ——— جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور قوت کے سامنے انہوں نے سر نہیں جھکایا۔

انہوں نے اپنی بصیرت کے مطابق پورا پورا کام لیا۔

امام شافعی سے مناسبت | اس معاملہ میں ان کی مثال بالکل امام شافعی کی سی ہے۔ نسب رفیع، یتیمی، اور فقر و مفلوک الحالی، ہمتِ عالی، نفس خود شناس و خود نگر، اور ذہن رسا یہ سب چیزیں ان دونوں ——— اُستاد اور شاگرد ——— میں مشترک تھیں۔ ان دونوں کو ان کی ماؤں نے بامِ بلند تک اپنے حسنِ تربیت سے پہنچایا، اور سربلندی کی صلاحیت پیدا کی۔

خلقِ قویم اور مسلکِ کریم | ایک عالی نسب شخص غربت کی زندگی میں بھی اپنے خصائص سے محروم نہیں ہوتا، بلکہ یہ چیز اس کی علوِ مرتبت میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ وہ خلقِ قویم اور مسلکِ کریم کا حامل بن جاتا ہے، انسان کا علوِ نسب ابتدا ہی سے اسے معالی امور کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس میں رکاکت اور پست ہمتی نہیں پیدا ہونے دیتا۔ اسے دنی اور چھوری باتوں سے بلند رکھتا ہے۔ اس طرح انسان ہمت اور حوصلے کے ساتھ مجد و شرف کی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ اس کی نکری تہی مائیگی بلندی سے بدل جاتی ہے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے ——— شرفِ نسب کے احساس کے ساتھ غربت و فلاکت کی زندگی، لوگوں کے احوال و مقامات کا انسان کو رمز شناس بنا دیتی ہے۔ وہ ان کے احساس و میلان کو جان لیتا ہے۔ ان کے نفوس کی پنہاں، اور چھپی ہوئی چیزوں کو پہچان لیتا ہے۔ ان کے شعور کا اندازہ کر لیتا ہے۔ سوسائٹی کے حالات و مؤثرات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جو سوسائٹی کے معاملات سے وابستہ ہو، اس کی تنظیمِ احوال اور توثیقِ علائق سے متعلق ہو، اس کے لیے ضروری اور بسا ضروری ہے کہ وہ شریعت کی تفسیر، استخراجِ حقائق، کشفِ موازین و مقائیس اور متعلقہ امور و مباحث سے بہرۂ وافر رکھتا ہو۔ روایت ہے کہ محمد بن الحسن، جو امام ابو حنیفہ کے اجل تلامذہ میں تھے، رنگریزوں کے پاس جایا کرتے تھے۔ ان کے معاملات و حالات سے متعلق پوچھ گچھ کیا کرتے تھے، ان کا یہ طرزِ عمل صرف اس امر پر مبنی تھا کہ وہ ان مسائل سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتے تھے جو لوگوں کے احوال و عادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے احوال و عادات جو شرع کے احکام و اصول سے معارض نہ ہوں، چنانچہ شرفِ نسب کے ساتھ، غربت کی زندگی میں نشوونما پانا، انسان کو تہذیبِ کامل کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ چیز جہاں انسان کے علوِ نسب کا سبب بنتی ہے، وہاں اس کے نفس میں پاکیزگی اور شائستگی بھی پیدا کرتی ہے۔

فقر و قناعت

یہی وجہ تھی کہ امام احمد بن حنبل کے نسب اور فقر نے ان پر بڑا اہم اثر ڈالا۔ جب دنیا ان کی طرف بڑھی، انہوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ اپنے قدموں سے دور کر دیا۔ اپنے نفس پاک اور قلب نقی کو اس سے علیحدہ رکھا۔ متوکل نے ان کی خدمت میں مال و زر سے بھری ہوئی تھیلیاں ہدیہ اور نذر کے طور پر بھیجیں، انہوں نے کمال استغنا، اور قناعت کے ساتھ یہ ہدیہ واپس کر دیا۔ وہ نفس مطمئنہ کے مالک تھے۔ لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کرتے تھے، اپنے شرفِ نسب کے سبب دوسروں کو ہیچ اور نیچ نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے عربی نسب پر فخر نازاں والے کے مرتکب نہیں ہوتے تھے۔ ان کی سیرت کا یہ پہلو خاص طور پر توجہ طلب ہے جو ان کے سیرت نگار لکھتے ہیں کہ کسی فلاکت زدہ شخص کو کہیں اس عزت اور عفت کا حامل نہیں دیکھا گیا جو احمد کی مجلس میں اسے حاصل ہوتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ خصائلِ رذیلہ اسی شخص کو حاصل ہو سکتے تھے جس کے شرفِ نسب میں قناعت و فقر گھل مل گئے تھے۔

امام صاحب کی تربیت

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی نشو و نما بغداد میں ہوئی۔ یہیں انہوں نے تربیت کے مدارج طے کیے۔

اس وقت کا بغداد ہر اعتبار سے فرد اور یگانہ تھا۔ ہر رنگ ہر وضع اور ہر منہاج کے لوگ وہاں موجود تھے اور ان کے الگ الگ حلقے قائم تھے، اس وقت کا بغداد معارف اور فنون کا مرکز تھا۔ وہاں قاری اور محدث تھے۔ صوفیہ اور علماء تھے۔ ماہرین فضلائے لغت تھے، حکماء اور فلاسفر تھے۔ غرض ہر گروہ، ہر طبقہ، اور ہر حلقہ، مسلک کے تنوع، راستوں کے تعدد، مشرب کے اختلاف اور علوم کی رنگا رنگی کے باوجود موجود تھا۔

حضرت امام کا خاندان انہیں بچپن ہی سے جامع علوم و فنون بنانے پر تلا ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایسے شخص بن جائیں جو علوم و معارفِ مختلفہ و متنوعہ کا گنجینہ ہو۔ لوگ اس کی طرف بڑھیں، اس سے استفادہ کریں، اس سے سند پکڑیں۔ وہ چاہتے تھے کہ احمد علم لغت، حدیث، قرآن، آثارِ صحابہ و تابعین، احوال و سیرتِ رسولؐ و سیرتِ اولیاء کا رمز شناس بن جائے۔ وہ ان لوگوں کے احوال و کوائف کا عالم ہو جو اپنے تدبر، تفقہ، فراست، یقین و ایمان، اور علم و عرفان کے اعتبار سے امتیازِ خاص کے حامل ہوں۔

[illegible] حفظ کر لیا اور

اس سعادت کے باعث، امانت اور تقوے کا جوہر ان میں پیدا ہو گیا۔ اور یہ چیز بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک پوری شانِ جمال و کمال کے ساتھ قائم رہی، اسلام کے راستے میں آپ نے بڑی سے بڑی مصیبت کا ہمت اور حوصلہ کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ جو عقیدہ قائم کر لیا، اس پر چٹان کی طرح جم گئے۔ اور ہر طرح کے مکارہ اور مصائب و نوائب بہادری کے ساتھ برداشت کیے۔

حفظِ قرآن کریم اور تحصیل علم لغت سے فارغ ہو کر احمد نے تحریر و کتابت کے فن کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:۔

"میں ابھی بالکل بچہ ہی تھا کہ حفظِ قرآن سے فارغ ہو گیا۔ چودہ سال کا تھا کہ تحریر و کتابت کی مشق و تحصیل میں منہمک ہو گیا۔"[1]

قابلِ رشک خصائص

امام صاحب ابھی نو عمر ہی تھے کہ وہ ثقاہت اور امانت کے درجہ پر پہنچ گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ رشید، رقہ میں اپنی فوج کے ساتھ مقیم تھا، لشکر کے سپاہی اپنی بیویوں کو خطوط لکھا کرتے تھے۔ یہ عورتیں احمد ہی سے یہ خطوط پڑھوایا اور ان کے جوابات لکھوایا کرتی تھیں، لیکن جواب لکھنے میں انہوں نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں لکھی۔

حضرت امام کی نجابت اور استقامت۔ دیانت اور ثقاہت، سعادت اور معقولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ہم نشینوں کے لیے موجبِ تقلید اور ان کے آبا کے لیے باعثِ رشک بن گئے تھے۔ یہ لوگ اپنے بچوں کے لیے احمد کو نمونہ اور ماڈل سمجھتے تھے۔ یہ لوگ کہا کرتے تھے:۔

"میں نے اپنے لڑکے پر اتنا اتنا خرچ کیا۔ اسے اتنے استادوں کے حوالے کیا کہ اسے ادب اور تمیز سکھائیں، لیکن کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ اور اسے دیکھو احمد بن حنبل کو، یہ یتیم لڑکا اپنے ادب اور حسن طرق کے باعث کیسے پسندیدہ اطوار اور قابلِ رشک خصائص کا حامل بن گیا ہے"؛

ہیثم بن جمیل کا قول

احمد اپنے اقران و اماثل میں، اپنے تقویٰ، پاکیزگیٔ کردار، حسن عمل، صبر و شکر اور ناگوار باتوں کو گوارا کرنے کے اعتبار سے اختصاص اور امتیاز حاصل کر چکے

[1] المناقب لابن جوزی، ص ۲۱

تھے، عمر اور سن کے اعتبار سے اگرچہ وہ بچّہ تھے، لیکن فہم و فراست اور ذکاوت و ذہانت کے اعتبار سے وہ مردِ کامل تھے، چنانچہ ہیثم بن جمیل کا یہ قول ان کے لیے مشہور و معروف ہے کہ :

"یہ لڑکا اگر زندہ رہا تو اپنے اہلِ زمانہ کے لیے حجت ثابت ہوگا"

اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ اندازہ آگے چل کر بالکل صحیح اور راست ثابت ہوا۔ یہ لڑکا زندہ رہا اور مردِ کامل بنا۔ ۷۷ سال تک اس نے زندگی کی بہار دیکھی اور اپنے علم و عمل، خُلق و ورع، صبر و قوتِ برداشت کے اعتبار سے دنیا کے لیے چراغِ ہدایت ثابت ہوا۔ اپنے اعتقاد کی خاطر وہ کونسی تکلیف تھی، جو اس نے استقلال اور استقامت کے ساتھ نہیں جھیلی ؟

مسلک کا انتخاب

بغداد علوم مختلفہ و متنوعہ کا مرکز و منبع بنا ہوا تھا۔ علوم دین کے علاوہ علمِ لغت، ریاضی، فلسفہ، تصوف، غرض ہر علم و فن کے زاویے کھلے ہوئے تھے۔ مدارس اور مکاتب موجود تھے، حلقہ ہائے درس و تعلیم قائم تھے۔ ناگزیر تھا کہ امام احمد ان ثمراتِ مختلفہ و متنوعہ کی گل چینی کرتے۔ جو چیز پسند آتے اس کی طرف ہاتھ بڑھائیں اور درخت سے توڑ لیں۔ لیکن اپنی طبعی مناسبت اور تربیتی اثر کی وجہ سے انہوں نے علوم دین کی طرف توجہ کی اور ان علوم کی تکمیل و درستی کے لیے لغت اور زبان بھی حاصل کی۔

پھر علوم شرعیہ میں اجتہاد اور انتخاب کا سوال پیدا ہوا۔ علوم شرعیہ کا بھی کئی قسمیں تھیں، ان میں کسے لیں اور کسے چھوڑیں؛ کس کی طرف پوری توجہ مرکوز کریں، اور کسے سرسری طور پر اپنی توجہ کا محور بنائیں۔ چنانچہ فکر و تأمل کے بعد انہوں نے دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کر لی۔ ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ مسلکِ فقہاء اختیار کریں، یا رواۃِ حدیث میں سے ایک راوی بن جائیں۔ اور اپنے آپ کو حفاظِ حدیث میں منسوب کرائیں؟

آپ کے زمانہ میں دو طریقے تھے، جو اس سلسلہ میں محلِ غور و تأمل مانے جاتے تھے۔ ایک تو علمِ فقہ، اور اس کے ساتھ استخراجِ فتاویٰ و اقضیہ، اور دوسرے علمِ روایت اور راویوں کی چھانٹ جو فقہاء کے لیے مواد اور مسالہ فراہم کرتا تھا۔ جیسے ایک طبیب طبی مواد اور مسالہ فراہم ہونے کے بعد ہی دوا سازی کا کام کر سکتا ہے۔ اس طرح کی مثال اعمش محدث نے امام ابو حنیفہ فقیہ کے

بارے میں بیان کی تھی۔ عراق میں دو مسلک زوروں پر تھے۔ ایک فقہ، دوسرے حدیث۔ دونوں ہی صاف، ستھرے اور پاکیزہ تھے۔ امام احمد کو ان میں سے کون سا اختیار کرنا تھا؟

بغداد میں فقہ عراق رائج تھی، اس کی تدوین ابو یوسف، محمد بن الحسن الشیبانی اور حسن بن زیاد لؤلؤی وغیرہ نے کی تھی۔

ان فقہاء کے علاوہ بغداد میں محدثین اور حفاظ حدیث کا بھی ایک گروہ موجود تھا۔

فقہ کی دلیل حدیث سے

امام احمد کو اپنا راستہ متعین اور منتخب کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ انہوں نے رجالِ حدیث کا مسلک اختیار کیا اور اس کی طرف اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے انہوں نے ان فقہاء کے طریق کا گستہ سونا بھی معلوم کر لیا تھا جو رائے اور حدیث کو جمع کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق سب سے پہلے امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید ابو یوسف کے حلقۂ درس میں پہنچے، لیکن اس کے بعد ان محدثین کی طرف میلان ہو گیا جو ہر طرف سے کٹ کر صرف حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے اپنی ذہنی و دماغی صلاحیتوں کو وقف کیے ہوئے تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ "حدیث کا پہلا سبق میں نے ابو یوسف ہی سے لیا تھا"

لیکن یہ سلسلہ کچھ نبھا نہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا، اس کے بعد وہ پورے طور پر محدثین کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس گفتگو سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس کے بعد وہ کُلّی طور پر فقہ عراقی سے کٹ گئے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ فقہائے عراق کے نتائجِ فکر پر مطلع ضرور ہوئے، لیکن پھر وہ ان کے طریقہ کی کمزوری کو محسوس کر کے حلقۂ حدیث میں پورے طور پر شامل ہو گئے۔

چنانچہ حافظ ذہبی اپنی تاریخ میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"خلال کا قول ہے کہ امام احمد نے پہلے پہل اہل رائے (عراقی فقہاء) کی کتابیں لکھی پڑھیں اور ان کے مسائل ازبر کیے، لیکن پھر اس طرف ان کا التفات نہ رہا"

یہ ایسی روایت ہے، جس کے رد کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں بلکہ ہم اسے قبول کیے لیتے ہیں؛ اس لیے کہ یہ بات ذرا مستبعد اور بعید از فہم معلوم ہوتی ہے کہ فقہی نتائجِ علمیہ ان کے سامنے اور ان کے زمانہ میں ہوں اور وہ ان سے یکسر بیگانہ اور بے پرواہ رہیں، یا انہیں جانے پہچانے بغیر، ان کے انکار اور رد پر مائل ہو جائیں۔ ضرور ہے کہ انہوں نے ان نتائج علمیہ سے پوری واقفیت حاصل کی ہو۔ انہیں پرکھا اور جانچا ہو، ان کی کمزوری کو محسوس کیا ہو، اس کے بعد یہ راستہ ترک کرکے انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہو، یعنی اربابِ رائے کی جماعت سے کٹ کر اصحابِ حدیث و خبر کے حلقہ میں پہنچے ہوں۔

ان واقعات کی روشنی میں امام احمد کا موقف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے آغازِ حیات میں، اہلِ رائے کی فقہ کی طرف توجہ کی۔ دلیل یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کا درس سب سے پہلے ابو یوسف سے لیا، جن کا شمار فقہائے رائے میں ہوتا ہے۔ اب اس کے باوجود جب وہ محدثین کے گروہ میں پہنچے تو اب ان کا طرزِ کار بدل جاتا ہے یعنی وہ اپنی "فقہ" کی تائید حدیث سے لاتے ہیں، یہ نہیں کرتے کہ حدیث میں رائے کو دخل دیں، اور فقہ کو اپنی جگہ رہنے دیں۔

فقہ کی دلیل حدیث سے لانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام تر حدیث ہی کی طرف مائل اور متوجہ ہو گئے، جب اس کا علم پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو انہوں نے فقہِ رائے (فقہ حنفی) کی جانب التفات کیا اور اس میں علم حدیث کی رُو سے نقد و موازنہ کی طرح ڈالی۔ یہ کام ان فقہائے کرام نے اپنی تفریعِ فقہی کے سلسلہ میں اب تک سرانجام نہیں دیا تھا۔ چنانچہ امام صاحب نے اس سلسلہ میں صحابہ اور تابعین کا طریقہ اختیار کیا۔

بغداد کی علمی اہمیت

امام احمد رضی اللہ عنہ نے آغازِ جوانی میں جب علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں محدثین کرام عالمِ اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ بصرہ اور کوفہ میں بھی محدثین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، اور بغداد تو خلافتِ اسلامیہ کا پایۂ تخت، اور مرکز بھی تھا۔ یہاں محدثین کا ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ اسی طرح بلادِ حجاز بھی محدثین سے بھرا ہوا تھا۔ غرض یہ وہ مبارک زمانہ تھا کہ دیار و امصار میں علمائے حدیث کے گروہ اور طبقات پھیلے ہوئے تھے۔ [illegible]

اپنے شہر کے رواۃ حدیث کی روایتیں قبول کرے، اور دوسرے دیار کے رواۃ حدیث کی روایتیں رد کر دے، بلکہ تکمیل و تحصیلِ علمِ حدیث کے سلسلہ میں صورتِ حال یہ تھی کہ سفر اور سیاحت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جس نے روایتِ حدیث کی مختلف کڑیوں کو باہم ملا دیا تھا۔ عالمِ اسلام کا یہ پھیلاؤ ایک دوسرے سے مربوط تھا، اور حدیثِ نبوی کا نور ہر جگہ اپنی روشنی پہنچا رہا تھا۔

حجازِ مقدس کا سفر

حضرت امام نے جب یہ طے کر لیا کہ حدیث کا علم حاصل کرنا ہے تو ضروری اور لابدی تھا کہ اس سلسلہ میں وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ جہاں حدیث کا علم ملتا، جاتے، اور اسے لے لیتے۔ چنانچہ انہوں نے ہر جگہ علمائے حدیث کے دروازے پر دستک دی، انہوں نے عراق میں تحصیلِ حدیث کی۔ اسی غرض سے وہ شام گئے۔ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر انہوں نے حجازِ مقدس کا سفر کیا۔ غالباً حضرت امام ہی سب سے پہلے محدث ہیں جنہوں نے عالمِ اسلام کے ایک ایک گوشہ میں جا کر حدیث حاصل کی اور اس کی جمع و ترتیب کا فریضہ انجام دیا۔ ہمارے اس دعوے کی شاہدِ صادق امام صاحب کی کتاب "المسند" ہے — ! اس میں تناسب اور ترتیب کے ساتھ حجازی، شامی، عراقی، بصری، اور کوفی حدیثیں ملیں گی۔

طلبِ حدیث کا کام

قدرتی ترتیب یہی ہونی چاہیے تھی کہ سب سے پہلے امام صاحب بغداد میں جس قدر علمِ حدیث تھا، اس کی تحصیل و تکمیل کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہاں ایک طویل عرصہ تک ان کا قیام رہا۔ اور وہ علمائے حدیث کے حضور میں حاضر ہو کر فنِ حدیث حاصل کرتے رہے۔ ۱۷۹ھ میں انہوں نے اس علم کی باقاعدہ تحصیل شروع کی اور ایک عرصۂ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ جو کچھ سنتے تھے اسے قلمبند بھی کر لیتے تھے، یہ سلسلہ ۱۸۶ھ تک جاری رہا؛ اسی سال کے شروع میں وہ بصرہ تشریف لے گئے۔ اس کے بعد کے سال میں انہوں نے حجاز کا سفر اختیار کیا، اور اس کے بعد طلبِ حدیث کے سلسلہ میں وہ مسلسل بصرہ، حجاز، اور یمن و دمشق کے سفر کرتے رہے۔

جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ آپ نے طلبِ حدیث کا کام ۱۷۹ھ میں شروع کیا

له المناقب ص۲۵

اور ۱۸۶ھ سے قبل کوئی علمی سفر آپ نے اختیار نہیں کیا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بغداد میں طلب و تحصیلِ حدیث کا سلسلہ کم و بیش سات سال تک مسلسل جاری رہا۔ اس اثنا میں اوّل تو آپ نے کوئی سفر ہی نہیں کیا، اور اگر کہیں آس پاس گئے بھی تو کسی ضرورت کے سلسلہ میں۔

سماعتِ حدیث

سات سال کی اس مدت میں امام صاحب بغداد سے باہر تحصیلِ علم کے سلسلہ میں نہیں نکلے۔ اس مدت میں شیوخ و علمائے بغداد سے کسبِ فیض کرتے رہے۔ مختلف فقہی مسائل و امور اور معاملات کے سلسلہ میں فتاویٰ ماثورہ، اور صحابہ و تابعین کے فیصلے از بر کرتے رہے۔

اس مدت کو انہوں نے اس طرح نہیں گزارا کہ کبھی اس عالم کے دروازے پر دستک دی ہو، کبھی دوسرے کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے ہوں۔ بلکہ ان کا معمول اور طریقہ یہ رہا کہ علماء میں سے کسی ایک عالم کو انہوں نے چُن لیا اور ایک مدت تک — خواہ وہ طویل ہو یا قصیر — اس سے کسبِ فیض کرتے رہے، یہاں تک کہ اس سے تمام کام کی باتیں حاصل کر لیں۔ مثال کے طور پر بغداد کے نامور امامِ حدیث ہشیم بن بشیر بن ابی خازم الواسطی المتوفی ۱۸۳ھ کی خدمت میں متواتر چار سال رہے — یعنی اپنی ۱۶ برس کی عمر سے ۲۰ برس کی عمر تک (۱۷۹ھ تا ۱۸۳ھ)[1]۔

چنانچہ خود امام صاحب سے مروی ہے کہ:

"ہشیم سے ہم نے کتاب الحج کے سلسلہ میں تقریباً ایک ہزار حدیثیں نوٹ کیں۔ اس کے علاوہ کچھ تفسیر بھی، اور کسی حد تک کتاب القضاء بھی"۔

اس کے بعد امام صاحب کے صاحبزادہ صالح نے پدرِ بزرگوار سے سوال کیا۔

"کیا آپ نے (مجموعی طور پر) تین ہزار حدیثیں نقل کر لیں؟"

آپ نے فرمایا:

"اس سے بھی زیادہ —"!

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہشیم کی وفات سے پہلے اگرچہ آپ زیادہ تر انہی سے کسبِ فیض کرتے رہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ بغداد کے دوسرے شیوخِ حدیث کو آپ نے

[1] المناقب لابن الجوزی ص ۲۵

بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ کبھی کبھی دوسرے ائمہ فن کے ہاں بھی آپ جا نکلتے تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ آپ نے عمیر بن عبداللہ بن خالد سے بھی، (ہشیم کی وفات سے پیشتر) کچھ حدیثوں کی سماعت کی۔

نیز اسی اثنا میں آپ نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے بھی حدیثیں سنیں۔ چنانچہ آپ سے منقول ہے کہ

"عبدالرحمٰن بن مہدی کی عمر ۲۵ سال کی تھی جب مَیں نے انہیں جامع مسجد میں دیکھا"!

اس کے علاوہ آپ نے ابوبکر بن عیاش سے حدیث کی سماعت بھی کی اور روایت بھی کی۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ مستقل طور پر آپ نے ہشیم ہی کے حلقۂ درس میں شرکت کی، لیکن احیاناً دوسرے شیوخِ حدیث کی بارگاہ میں بھی آپ پہنچ جاتے تھے اور سماعتِ حدیث کرتے تھے۔ اور اگر راوی کو ثقہ پاتے تھے تو روایتِ حدیث بھی کرتے تھے۔ خصوصاً ان اساتذۂ فنِ حدیث کی بارگاہ میں ضرور پہنچتے تھے جو فنِ روایت اور جمعِ حدیث میں ممالکِ اسلامیہ کے اندر شہرتِ علمی کے مدارج طے کر چکے تھے۔

ماں کی مامتا

ہشیم کے انتقال کے بعد امام احمد نے جہاں اور جس جگہ بھی حدیث کا حلقۂ درس دیکھا وہاں پہنچے۔ چنانچہ بغداد میں تقریباً تین سال تک وہ مقیم رہے اور وہاں کے شیوخ و ائمہ سے کسبِ فیض کرتے رہے اور اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اگرچہ اس مرتبہ یہ نہیں کیا کہ ہشیم کی طرح کسی ایک ہی کے حلقہ کے ہو رہے ہوں۔

ہشیم کی وفات کے وقت آپ کی عمر تقریباً بیس سال کی تھی، اور اس عمر میں وہ علم و فضل کے اعتبار سے ایک منزلتِ خاص پر فائز ہو چکے تھے، اور طلبِ حدیث میں، جذبۂ خالص اور عزمِ صادق کے ساتھ معروف و مطلق تھے۔ آپ کی والدۂ محترمہ ان نیک کاموں پر برابر آپ کو آمادہ کرتی رہتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہدایت کرتیں کہ تحصیلِ علم میں اپنی جان نہ کھپائیں۔ چنانچہ خود امام احمد نے اپنے بعض رفقا سے بیان کیا ہے کہ

"اکثر ایسا ہوتا کہ مَیں صبح صبح تعلیمِ حدیث کے لیے باہر جانا چاہتا، میری والدہ میرا دامن پکڑ لیتیں (اتنا سویرے جانا انہیں پسند نہ آتا)۔ یہاں تک کہ یا فجر کی اذان ہونے لگتی یا پو پھٹ جاتی، اور صبح طلوع ہو جاتی"!

طلبِ علم میں دُور دراز مقامات کے سفر

حضرت امام احمد نے ۱۸۶ھ میں بسلسلۂ طلبِ حدیث اپنے [illegible]

حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا، اس کے بعد منزلیں طے کرتے ہوئے وہ یمن پہنچے، کوفہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا، ان کی تمنا تھی کہ رَے بھی تشریف لے جائیں، تاکہ جریر بن عبدالحمید سے سماعت کر سکیں، جن سے وہ بغداد میں مستفید نہیں ہو سکے تھے، لیکن اس سفر کی نوبت نہ آسکی، کیونکہ زادِ راہ مہیا نہ ہو سکا۔

ایک عرصہ تک امام صاحب کے سفر و سیاحت کا سلسلہ جاری رہا، تاکہ وہ ائمۂ حدیث کے منہ سے نکلے ہوئے بولوں کو براہِ راست سُنیں اور ان کو ضبطِ تحریر میں لائیں۔

بصرہ کا سفر آپ نے پانچ مرتبہ کیا۔ اور بعض دفعہ وہاں کئی کئی ماہ تک قیام فرمایا۔ جہاں بعض شیوخ سے کسبِ فیض کرتے۔ کبھی کم مدت تک، کبھی زیادہ عرصہ تک، جیسا موقعہ کا تقاضا ہوتا۔

حجازِ مقدس کا سفر بھی آپ نے پانچ مرتبہ کیا۔ سب سے پہلے ۱۸۷ھ میں۔ اسی سفر میں امام شافعی سے ملاقات ہوئی، اور سفر کا جو اصل مقصد تھا وہ پورا کیا، یعنی حدیثِ ابنِ عیینہ کا حاصل کرنا، نیز فقہ شافعی اس کے اصول، قرآن کے ناسخ اور منسوخ کا بیان۔ یہ سب چیزیں معلوم کیں۔ اس کے بعد امام شافعی سے ان کی ملاقات بغداد میں ہوئی جب وہ وہاں تشریف لائے تھے، ان کی کشکول میں ان کی فقہ اور اصولِ فقہ کے اوراق موجود تھے۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد مصر میں ان کے فقہ و اصول نے تنقیح کے مدارج طے کیے، لیکن امام احمد اس فن میں پختہ ہو چکے تھے۔ چنانچہ معرفتِ حدیث میں امام شافعی ان کی رائے اور فکر کو مدارِ اعتماد قرار دیتے اور کبھی کبھی فرماتے:

"اگر آپ کے پاس کوئی صحیح حدیث پہنچ جایا کرے تو مجھے بھی اس سے باخبر کر دیا کیجیے، خواہ وہ کسی حجازی سے پہنچی ہو یا شامی سے، یا عراقی سے یا یمنی سے[1]"

حافظ ابن کثیر نے امام احمد کے سفرِ حجاز کی تفصیل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"امام احمد نے پہلا حج ۱۸۶ھ میں کیا، پھر دوسرا ۱۹۱ھ میں، پھر ۱۹۲ھ میں دوبارہ حج فرمایا اور ۱۹۷ھ تک مقیم رہے۔ پھر ۱۹۸ھ میں حجاز تشریف لائے اور ۱۹۹ھ تک قیام فرمایا[2]"

امام احمد خود فرماتے ہیں:

[1] تاریخ ابن کثیر، دسویں جلد، ص ۳۲۷ - یہ قول امام شافعی کے دوسرے سفرِ بغداد سے متعلق ہے جو

"میں نے پانچ حج کیے، ان میں سے تین حج پاپیادہ کیے، ان میں سے ایک حج پر میں نے صرف تیس درہم صرف کیے، ایک مرتبہ میں راستہ بھٹک گیا، اس حالت میں کہ پاپیادہ قطع مسافت کر رہا تھا آخر میں نے کہنا شروع کیا،

"خدا کے بندو! مجھے راہ پر لگا دو!"

یہاں تک کہ میں صحیح راستہ پر ہو لیا[1]"

امام صاحب کے پاپیادہ حج کرنے کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں:

یا تو ان کا یہ خیال تھا کہ طاعتِ امر میں جتنی زیادہ مشقت برداشت کی جائے گی اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔

یا پھر زادِ سفر کی کمی انہیں یہ زحمت اُٹھانے پر مجبور کرتی تھی، لہٰذا وہ فریضۂ حج پاپیادہ ادا کرتے تھے، تاکہ قربانی کریں۔ بیت اللہ الحرام میں کچھ وقت صرف کر کے حدیثِ نبوی حاصل کریں اور صحابۂ کرام اور تابعین کے فتووں سے واقف ہوں۔

مشکلات و مصائب کوفہ اگرچہ بغداد سے قریب تھا، لیکن وہاں بھی آپ کی زندگی مشکلات و مصائب اور تکلیف و مشقت کی زندگی تھی۔ اس لیے کہ کوفہ میں جہاں آپ رہتے تھے، وہاں آرام و آسائش کا کوئی بندوبست نہ تھا، خود فرماتے ہیں:

"میں گھر میں جب سوتا تھا، تو سر کے نیچے تکیہ کے بجائے، اینٹ رکھ لیا کرتا تھا!"

امام احمد یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

"اگر میرے پاس کچھ روپیہ بھی ہوتا تو میں رَے کا سفر ضرور کرتا تاکہ جریر بن عبدالحمید سے سماعت کر سکوں، لیکن میں رَے نہ جا سکا، کیونکہ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا!"

امام صاحب طلبِ حدیث کی راہ میں مشقت اور تکلیف کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کرتے تھے۔ اس لیے کہ جو چیز آسانی سے حاصل ہو جائے، وہ آسانی سے فراموش بھی ہو جاتی ہے، علاوہ ازیں حصولِ حدیث کی راہ میں وہ ہجرت کی نیت بھی رکھتے تھے۔

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۱۰ ص ۳۲۶

سنہ ۱۹۸ھ میں امام صاحب نے، پروگرام یہ بنایا کہ حج کو تشریف لے جائیں، اور حج و مجاورت کے بعد یمن کے پایۂ تخت صنعا میں تشریف لے جائیں، اور وہاں عبدالرزاق بن ہمام کی خدمت میں حاضر ہوں، امام صاحب کے اس ارادہ کا انکشاف، ان کے رفیقِ راہِ حج اور راہِ علم کے ساتھی امام یحییٰ بن معین نے کیا ہے، دونوں ایک ہی ارادہ سے چلے، اور ساتھ ساتھ مکہ میں داخل ہوئے، اس اثنا میں کہ یہ دونوں طوافِ قدوم میں مصروف تھے، عبدالرزاق بھی طواف کرتے دکھائی دیئے، ابن معین نے انہیں دیکھ لیا، وہ انہیں پہلے سے جانتے پہچانتے تھے، چنانچہ انہوں نے سلام کیا اور کہا:

"یہ آپ کے برادر احمد بن حنبل ہیں"!

حافظ عبدالرزاق نے دعائے درازیٔ عمر دی اور فرمایا:

"ان کے بارے میں جو کچھ بھی مجھ تک پہنچا ہے وہ اچھا ہی اچھا ہے"!

امام ابن معین نے کہا:

"انشاء اللہ! کل ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے، تاکہ آپ سے حدیث کی سماعت کریں اور اسے قلمبند کر لیں"!

واپسی کے وقت امام احمد نے ابن معین پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

"آپ نے شیخ سے کل ملنے کا وعدہ کیوں کر لیا"؟

انہوں نے جواب دیا

"تاکہ ہم ان سے حدیثِ نبوی کی سماعت کریں، اس طرح خدا نے آپ کو مسافتِ دور دراز کی زحمت، آمد و رفت کی مصیبت اور زادِ راہ کی فکر سے نجات دے دی"!

امام صاحب نے جواب دیا

"نہیں یہ خدا کی مرضی نہیں ہے، مَیں نے ایک نیت کر لی تھی، اب تمہاری بات مانوں تو وہ توڑنا پڑے گی، نہیں، ہم یمن جائیں گے اور وہیں سماعتِ حدیث کریں گے"۔

پھر حج سے فارغ ہو کر، وہ صنعا (یمن) تشریف لے گئے، اور وہیں حدیث کی سماعت فرمائی۔[1]

ملاحظہ کیجیے، علم کی راہ میں امام صاحب مصائبِ سفر برداشت کرنے کا ارادہ کرتے ہیں،

[1] [illegible]

بخت و اتفاق سے انہیں موقع ملتا ہے کہ زحمتِ سفر سے بچ جائیں، لیکن وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور اس پر اڑے رہتے ہیں کہ طلبِ علم کے راستہ میں مسافرت اور غریب الوطنی کے شدائد جھیلیں گے اور یہ بات ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی کہ راحت و آسائش کی تلاش و جستجو کریں، جو ان کی دشواریوں کو آسان بنا دے، فرصت کے مواقع مہیا کریں۔

قناعت اور خودداری

اب امام صاحب صنعا کا سفر اختیار کرتے ہیں، دکھ اور مشقت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ راستہ میں جب مصارف کی پونجی ختم ہو جاتی ہے تو بار برداروں کے گروہ میں شامل ہو کر مزدوری کرتے ہیں، اور اس طرح مزدوری سے اپنا کام چلاتے ہوئے صنعا میں داخل ہوتے ہیں۔[1]

رفقائے سفر دستِ اعانت بڑھاتے ہیں، لیکن ان کی خودداری اس پیش کش سے مستفید ہونے میں مانع آتی ہے، وہ خدا کے فضل پر بھروسہ رکھتے اور اپنے دست و بازو پر اعتماد کرتے ہیں، اور مصارفِ سفر اپنی مزدوری سے پیدا کر لیتے ہیں۔

پھر جب وہ صنعا پہنچ جاتے ہیں تو امام عبدالرزاق ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان سے فرماتے ہیں:

"اے ابو عبداللہ — یہ لو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ" اور دیناروں سے بھری ہوئی تھیلی ان کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔

احمد جواب دیتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے، مَیں جس حال میں ہوں، ٹھیک ہوں"!

وہاں دو سال کی مدت اسی طرح کڑیاں جھیلتے ہوئے گزار دیتے ہیں اور زُہری و ابن المسیب کے طُرق پر حدیث کی سماعت کرتے ہیں، اور ان طُرق پر، جو ان بزرگوں سے پہلے چلے آتے تھے۔

امام شافعی کا تعلقِ خاطر

علم کی طلب میں احمد کی بادیہ پیمائی تسلسل کے ساتھ جاری رہتی ہے یہاں تک کہ علم میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور فن میں کمال حاصل ہو جاتا ہے۔

[1] حلیۃ الاولیاء (از امام ابو نعیم)

امام شافعی سے انہوں نے مصر میں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن اس وعدہ کا وہ ایفا نہ کر سکے۔

حرملہ شافعی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا

"احمد بن حنبل نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مصر آئیں گے، لیکن وہ نہیں آئے"!

ابن ابی حاتم کا خیال ہے کہ ہاتھ خالی ہونے کی وجہ سے وہ یہ وعدہ پورا نہ کر سکے۔

طلبِ حدیث کے سلسلہ میں احمد نے اقالیم اسلامیہ کا چکر کاٹا، نہ وہ محنت اور تکان سے گھبراتے تھے، نہ زیادہ سے زیادہ حاصل کر کے بھی سیر ہوتے تھے۔ کتابوں کا پلندا ان کی پیٹھ پر ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کے ایک شناسا نے انہیں حالتِ سفر میں دیکھا اور احادیث کی حفظ و روایت اور کتابت کی کثرت دیکھ کر اعتراض کرتے ہوئے کہا "اتنا کچھ حفظ کر لیا، اتنا کچھ لکھ لیا، اتنی کچھ روایت کر لی، پھر بھی حالت یہ ہے کہ آج کوفہ کا سفر درپیش ہے تو کل بصرہ کا! آخر کب تک اور کہاں تک یہ سلسلہ جاری رہے گا؟"[1]

حدیث کی طلب و روایت میں امام احمد کی سعی و کوشش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ درجۂ امامت پر پہنچ گئے تو ان کے ایک ہمعصر نے انہیں اس حال میں دیکھا کہ قلم دوات ہاتھ میں ہے، اور لکھے چلے جا رہے ہیں۔ اس نے کہا

"ابوعبداللہ ——— آپ اس مرتبۂ بلند تک پہنچ لیے، آپ کی حیثیت یہ ہے کہ امام المسلمین مانے جاتے ہیں، پھر یہ آپ کیا کرتے ہیں"؟

فرمایا:

جب تک قبر میں نہ پہنچ جاؤں قلم دوات کا ساتھ نہیں چھوٹ سکتا"!

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے:

"میں اس وقت تک تحصیلِ علم کرتا رہوں گا جب تک قبر میں نہ پہنچ جاؤں"!

اور اس طرح درحقیقت امام احمد اس حکمتِ ماثورہ پر عمل کرتے تھے کہ:

"آدمی وہی عالم ہے جو طلبِ علم میں مصروف رہے، جب وہ یہ خیال کرنے لگے کہ وہ عالم ہو گیا تو

[1] ابن الجوزی ص ۲۸

وہیں سے اس کا جہل شروع ہو گیا"!

امام صاحب کی حیاتِ گرامی اسی قولِ بلیغ کا نمونہ تھی۔

تحریر و تدوینِ احادیث

قبل اس کے کہ تحصیلِ علم کے سلسلہ میں امام صاحب کے سفر و سیاحت کا بیان ہم کریں، ان کی حیاتِ علمیہ سے متعلق دو باتوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں:

۱۔ امام صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیثیں سنی تھیں، یا اصحابِ رسولؐ کے جو آثار ان کے علم میں تھے، ان کا اصول یہ تھا کہ وہ صرف حافظہ پر بھروسہ نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی تحریر و تدوین کو لابد اور لازمی خیال کرتے تھے، کیونکہ وہ زمانہ ہی تدوینِ علوم کا تھا، اس دور میں فقہ کی تدوین ہوئی، علومِ لغت اور علومِ حدیث کی تدوین عمل میں آئی، چنانچہ وہ صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے تھے کہ جو کچھ کانوں سے سن لیا اور دماغ کے نہاں خانہ میں محفوظ کر لیا، وہی سب کچھ ہے، بلکہ وہ اس پر عامل تھے کہ جو کچھ حاصل کریں اُسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیں، چنانچہ گو انہیں تمام حدیثیں اسناد و طرق کے ساتھ ازبر تھیں، لیکن جب بھی وہ حدیث کی روایت کرتے تھے تو کتاب سے۔ یعنی جو کچھ لکھ لیتے تھے، اور نقل کر لیتے تھے اس سے!

انہیں یہ اندیشہ رہتا تھا کہ ممکن ہے حافظہ دھوکہ دے جائے، اور وہ کچھ بھول گئے ہوں، اور اس طرح کلماتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تحریف واقع ہو جائے۔

یہ بات ان کے فرطِ تقویٰ پر دال ہے اور یہ وجہ بھی تھی کہ وہ اس عروۃ الوثقیٰ سے تمسک چاہتے تھے جس پر سلف صالحین عامل تھے۔ یعنی اس اندیشہ کے ماتحت وہ تحدیث سے گریز کرتے تھے کہ کہیں شبہ نہ لگ جائے۔

صرف یادداشت میں غلطی کا امکان ہے

امام احمد کو خدا کی طرف سے قوتِ حافظہ بہت زیادہ ودیعت ہوئی تھی، چنانچہ اپنے حافظہ پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی اسناد نہیں لکھا کرتے تھے، لیکن متنِ حدیث ہمیشہ لکھ لیا کرتے تھے۔ حدیثیں اگرچہ انہیں ازبر رہتی تھیں۔ مگر ان کی روایت ہمیشہ اپنی کتاب دیکھ کر کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی سائل کسی حدیث کے بارے میں پوچھتا، تو گو وہ یاد ہوتی، تاہم وہ اپنی کتابوں میں تلاش کر لیتے،

تب وہی پڑھ کر سنا دیتے جو لکھا ہوتا، چنانچہ ایک واقعہ ہے کہ مرو کے ایک آدمی نے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا، آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو حکم دیا کہ کتاب "الفوائد" لا کر پیش کریں، تاکہ وہ حدیث اس میں تلاش کریں، لیکن عبداللہ کو وہ کتاب نہیں ملی، تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور کتاب ڈھونڈ لائے، اس کتاب کے متعدد اجزا تھے، آپ بیٹھ کر حدیث کی جستجو کرنے لگے۔ اس اثنا میں ایک اور آدمی حدیث پوچھتا ہُوا آیا۔ اس نے کہا:

"جو کچھ خدا نے آپ کو سکھا دیا ہے مجھے بتا دیجیے!"

آپ گھر میں تشریف لے گئے اور حدیث کی کتابیں نکال لائے، اور اسے املا کرانے لگے، پھر جب وہ لکھ چکا تو آپ نے فرمایا:

"جو کچھ تو نے لکھا ہے وہ پڑھ کر سُنا دے"۔

بات یہ ہے کہ امام صاحب اپنی جودتِ حفظ، اور فراست و ذہانت کے باوجود صرف اپنی یادداشت پر بھروسہ نہیں کرتے تھے بلکہ ہر وہ چیز جو سنتے تھے، اسے مدوّن کر لیتے تھے، اور اپنی غیر معمولی فہم و فراست اور یادداشت و قوتِ حافظہ کے باوجود جب حدیث کے سلسلہ میں کچھ بحث و گفتگو ہوتی تھی تو وہ اسی کو بنائے سخن قرار دیتے تھے جو مدوّن صورت میں ان کے پاس موجود ہوتی تھی۔

فقہ حدیث

۲۔ امام صاحب کی داستانِ تحصیلِ علم ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ امام صاحب جس علم کے جویا تھے، اور جس کی طلب میں سرگرداں رہتے تھے اس کی نوعیت کیا تھی؟

بلاشبہ امام صاحب نے جس علم کی تحصیل میں اہتمام کیا، اور اپنی عمرِ عزیز صرف کی وہ تھا علم حدیث اور آثارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و فتاویٰ صحابۂ کرام، اور ان کے آثارِ علمیہ، نیز معاملات و مسائل میں ان کے اجتہاداتِ عالیہ — ! امام صاحب نے ان سب چیزوں کو حفظ کیا، سمجھا بوجھا، ان کے مقصد اور غایت کو جانا، اور اسی راستہ کی طرف رہنمائی فرمائی — !

لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ امام احمد کا علم روایت ہی کی حد تک محدود تھا؟ یعنی کیا علم حدیث و آثار کے سوا انہوں نے کوئی اور علم نہیں حاصل کیا؟ نہ اس کے سوا انہوں نے جانا اور پہچانا؟

یہ ذرا تحقیق طلب بات ہے!

اصل میں تو یہ بات اس وقت زیرِ بحث آئے گی جب ہم ان کی فقہ پر گفتگو کریں گے، لیکن اس جگہ کچھ اشارات کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، جن کی حیثیت صرف تمہید کی ہے۔

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ آغازِ شباب میں امام صاحب حدیث پڑھنے کے لیے امام ابو یوسف کے ہاں گئے تھے۔ حافظ ابن کثیر کا کہنا یہ ہے کہ اپنی نوعمری کے زمانے میں امام احمد قاضی ابو یوسف کے پاس آتے جاتے رہتے تھے، ظاہر ہے کہ قاضی ابو یوسف سے فقہی استنباط کے سلسلے کا اثر آپ نے ضرور لیا ہوگا۔ کیونکہ قاضی ابو یوسف جب اپنے فتوے اور فیصلے کے لیے نصِ شرعی نہیں پاتے تھے، تو وہ اپنے قیاس ہی سے فتویٰ دیتے اور فیصلے کرتے تھے، اور اس میں بھی شک نہیں کہ امام صاحب اس طرح حدیث نہیں روایت کرتے تھے کہ وہ اس سے استنباط کر سکتے ہوں، اور نہ نصوص اور ان کی غایاتِ مصلحیہ کو سمجھ سکنے کی اس وقت تک پوری پوری استعداد رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب نصوص سے استنباطِ احکام کی طرف خاص توجہ دیتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح وہ روایت اور رواۃ کی اہمیت کو محسوس فرماتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مکہ میں سفیان بن عیینہ سے ملاقات کرتے ہیں، اور ان سے روایت کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ان سے سماعت کرتے ہیں اسے ضبطِ تحریر میں لے آتے ہیں۔ پھر وہ امام شافعی سے جب ملتے ہیں جو وہاں اپنی فقہ کے اصول پڑھایا کرتے تھے تو ان کے مناہجِ فقہیہ نہ صرف یہ کہ ان تک خود رسائی حاصل کرتے ہیں بلکہ بڑے شوق سے اپنے ساتھیوں کو بھی امام شافعی کی خدمت میں پہنچنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔

امام شافعی کی عظمت

یاقوت حموی کی معجم میں ہے۔ آبری کہتے ہیں کہ:

"اسحٰق بن راہویہ کہتے ہیں، ہم سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر تھے، اور عمرو بن دینار کی احادیث لکھ رہے تھے، اتنے میں احمد بن حنبل آئے، مجھ سے انہوں نے کہا:

"ابو یعقوب اٹھو، میں تمہیں ایسا شخص دکھاؤں جسے تمہاری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا!" مَیں اٹھ کھڑا ہوا، وہ مجھے لے کر زمزم کے احاطہ میں پہنچے، یہاں ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص

ہے جو سفید کپڑوں میں ملبوس ہے، چہرہ روشن اور تابناک، فراست ہویدا، ذکاوت آشکارا۔ احمد نے مجھے ان کے پہلو کے پاس بٹھا دیا، اور کہا:۔

"اے ابوعبداللہ، یہ ہیں اسحٰق بن راہویہ حنظلی!"

انہوں نے مجھے مرحبا کہی، دعا دی، میں نے ان سے کچھ پوچھا، انہوں نے مجھے کچھ بتایا، میری نظر میں ان کا ایسا علم آیا جو میرے لیے بہت مرغوب اور پسندیدہ ثابت ہوا۔

جب ہمیں بیٹھے بیٹھے دیر ہو گئی تو میں نے کہا:

"ہمیں اس آدمی کے پاس کیوں نہیں لے چلتے جس کا ذکر کیا تھا؟"

احمد نے کہا،

"یہی تو ہیں وہ شخص!"

میں نے کہا

"سبحان اللہ، میں ایسے شخص کے پاس سے اٹھ کر آیا ہوں، جو کہتا تھا:

"ہم سے زہری نے روایت کی!" میں نے تو یہی خیال کیا تھا کہ آپ مجھ کو ایسے شخص کے پاس لے جائیں گے جو زہری کے مثل ہو گا، یا کم از کم اس کے قریب قریب تو ہو گا، اور تم ہمیں اس نوجوان کے پاس لے آئے۔"

احمد نے جواب دیا،

"اے ابویعقوب، اس شخص سے فیض حاصل کرو، کہ میری آنکھوں نے اس جیسا کوئی اور شخص نہیں دیکھا!"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ امام شافعی یہی تھے۔

فقہ واستنباط سے دلچسپی

اس قصہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام احمد، امام شافعی کے علم کے بہت زیادہ قائل تھے۔

روایت ہے کہ امام احمد نے امام شافعی کے بارے میں ایک مرتبہ کہا:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا، اس امت کے لیے خدائے عزوجل ہر صدی کے شروع میں ایک ایسا شخص مبعوث فرمایا کرے گا جو دین کے بگڑے ہوئے امور کو

اصحاب رائے سے اختلاف

جب بات یہ ٹھہری، تو ضروری ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کریں کہ علم روایت کے ساتھ ساتھ امام احمد فقہ و استنباط کے فن سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے، بلکہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں[1] وہ اہل الرائے حضرات کی کتابیں بھی یاد کیا کرتے تھے، لیکن ان کتابوں سے نہ وہ استناد کرتے تھے، نہ ان کی طرف ملتفت ہوتے تھے۔

امام احمد کے شاگرد رشید خلال فرماتے ہیں:

"احمد نے اصحاب رائے کی کتابیں یاد کیں اور لکھیں، لیکن ان کی طرف التفات قائم نہیں رکھا۔"[2]

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام احمد علم فقہ، اور رائے، اور قیاس اور استنباط سے لگاؤ اور تعلق رکھتے تھے، اگرچہ عراق کے فقہائے رائے، مثلاً امام ابو حنیفہ، اور ان کے تلامذہ کے نتائج فکر سے متفق نہیں تھے۔

فقہ کے فن سے بہرحال انہیں غیر معمولی شغف تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض فقہا کے طریق کار کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔

جامع فقہ وحدیث

حدیث اور روایت و آثار سے غیر معمولی شغف اور توجہ رکھنے کے باوجود جب صورت حال یہ تھی کہ امام احمد فقہ کی تکمیل و تحصیل میں بھی سرگرم تھے، تو ضروری تھا

---

[1] مؤلف کی کتاب "الشافعی" ملاحظہ ہو، طبع اولیٰ ص ۳۶

[2] ملاحظہ ہو تاریخ ذہبی میں امام احمد کا تذکرہ حیات۔

ہے جو سفید کپڑوں میں ملبوس ہے، چہرہ روشن اور تابدار ہے ۔ معنی اور مطلب کے ساتھ حاصل کرتے تھے، وہ
نے مجھے ان کے پہلو کے پاس بٹھا دیا، اور کہا :- ۔ آپ ان کی مسند میں دیکھیں گے کہ اس میں ہر صحابی کے
«اے ابو عبداللہ، یہ ہیں اسحٰق ۔» مسند عمر میں فتاویٰ کا ایک بڑا ذخیرہ ملے گا، جو اس فقیہ عظیم نے
انہوں نے مجھے مرحبا کہی، و عثمان، و عبداللہ بن مسعود وغیرہ میں آپ ان کے فتووں کی ایک بڑی طیب
نظر میں ان کا ایسا علم آیا جو میر ۔ ایک بڑی تعداد ملے گی جو انہوں نے مختلف مواقع پر صادر کیے ۔
جب بھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد نہ صرف محدث تھے، نہ صرف فقیہ۔ بلکہ وہ بیک وقت فقیہ بھی
وہ ہیں ۔ محدث بھی۔ ابو حنیفہ کا قول ہے :۔

"جو حدیث سیکھتا ہے اور فقہ نہیں جانتا اس کی مثال اس دواساز کی سی ہے جو دوائیں تو جمع کرتا رہتا ہے، لیکن یہ نہیں جانتا کہ یہ دوا کس مرض میں کام آئے گی ؛ یہاں تک کہ طبیب آتا ہے اور وہ بتاتا ہے۔ اسی طرح طالب حدیث ہے جو حدیثیں تو یاد کر لیتا ہے لیکن ان کی ماہیت اور حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے، یہاں تک کہ فقیہ آتا ہے اور صحیح بات بتاتا ہے[1]۔"

امام احمد فقہ و حدیث کے جامع تھے، وہ امام حدیث بھی تھے، اور امام فقہ بھی جیسے حضرت امام مالک، کہ وہ جتنے بڑے محدث تھے اُتنے ہی بڑے فقیہ بھی تھے، آگے چل کر ہم احمد اور مالک کے مابین موازنہ کا فریضہ انجام دیں گے۔

امام احمد اور علوم عصریہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام احمد حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کے سوا دوسرے علوم و فنون سے بھی واقف تھے ؟ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مذکورہ علوم کے سوا کسی اور علم مثلاً علم کلام، اور علوم فلسفیہ (جن کے بکثرت تراجم ان کی زندگی میں ہو چکے تھے) وغیرہ میں کوئی دسترس حاصل نہیں کی، کیونکہ اپنی زندگی میں انہوں نے حدیث و قرآن کے سوا کسی اور علم کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔ اُن علوم عربیہ کو مستثنیٰ کر کے، جو علوم دینیہ کے حصول میں آلہ کا کام دیتے ہیں۔

ہم یہ بھی کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ امام احمد فرق مختلفہ مثلاً خوارج اور شیعہ اور جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ کے فرق آراء سے ناواقف تھے، بلکہ اس گمان کے پورے آثار و شواہد موجود ہیں کہ ان فرقوں کے احوال و سوانح

[1] مؤلف کی کتاب "ابو حنیفہ" طبع ثانی ص۲۶۰۔

کیفیات و اخبار وغیرہ سے پورے طور پر آشنا تھے۔

طلب حدیث کے سلسلہ میں انہوں نے پانچ مرتبہ بصرہ کا سفر کیا، وہاں ان کی مدت اقامت سات ماہ، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ رہی۔ اور بصرہ تحریک اعتزالی کا مرکز تھا۔ وہاں کے دیہات میں خوارج ایک اودھم مچائے ہوئے تھے۔ اسی طرح جہمیہ اور مرجیہ کے گروہ بصرہ اور کوفہ میں موجود تھے۔ اور ایک صاحب فکر و نظر عالم ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جان جاتا ہے جو اس کے پڑوسی ہوں، جن سے ملنے جلنے کے مواقع پیش آتے ہوں، جن سے قرب اور اتصال اور ربط و اختلاط کی صورتیں پیدا ہوتی ہوں، پھر ان فرقوں کی احادیث بھی بزم و انجمن میں، کہیں بطریق استحسان، اور کہیں بطریق استہجان جاری و ساری تھیں۔ اور وقت کے اہل علم ہی انہیں مورد تعریف یا مستحق ملامت قرار دیتے تھے۔ امام احمد ان فرقوں کے لوگوں کو مبتدع یعنی بدعتی قرار دیتے تھے، کیونکہ یہ لوگ منہاج سلف سے دور جا پڑے تھے اور امام احمد جیسے پایہ اور منزلت کا شخص با ایں ہمہ عقل و خرد ناممکن تھا کہ لوگوں پر اتنی بڑی فرد قرارداد جرم ان کے افکار و خیالات سے پورے طور پر واقف ہوئے بغیر عائد کر دیتا۔ اس لیے کہ جب کسی چیز پر نفیاً یا اثباتاً، تعریف کے طور پر، یا قدح کے طور پر حکم لگایا جاتا ہے تو وہ اس کے تصور اور معرفت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔

ان اعتبارات کی بنیاد پر یہ باور کرنے کے یقینی وجوہ موجود ہیں کہ امام احمد ان فرقوں کے اقوال و آراء سے پورے طور پر واقف تھے۔ اور یہ کہ ان کے زمانہ میں جو علوم نمودار ہو چکے تھے، ان سے اچھی طرح آشنا تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ان سے متاثر نہیں تھے، یا ان کے انداز و اسلوب سے متفق نہیں تھے۔

جن مقدمات کا ہم نے ذکر کیا ان سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ وہ ان علوم میں ماہرانہ درک اور کامل دسترس رکھتے تھے، ایسی مہارت جو ہر گوشہ پر حاوی، اور ایسی دسترس جو ہر پہلو پر چھائی ہوئی ہو لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ فی الجملہ انہیں ان علوم کی معرفت حاصل تھی، گو استقصاء نہ تھا، صرف یہی بات ایک عالم کو، اس امر سے آشنا کر دینے کے لیے کافی ہے کہ وقت کا رجحان، اور آراء کیا ہیں ؟

امام احمد فارسی جانتے تھے

مذکورۂ بالا امر اور بھی یقینی ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امام احمد فارسی

زبان سے بھی خوب واقف تھے، بلکہ کبھی کبھی اس زبان میں بات چیت بھی کر لیتے تھے اگر مخاطب اچھی طرح عربی زبان نہ جانتا ہو، اور اسے سمجھ نہ سکتا ہو۔

امام احمد کی فارسی دانی کا واقعہ، صرف قیاس آرائی نہیں ہے، بلکہ یہ خبر صحیح اور نقل پر مبنی ہے اور چونکہ امام صاحب اپنے معاصروں سے میل ملاقات رکھتے تھے، لہٰذا ضروری تھا کہ عربی کے علاوہ کوئی دوسری زبان بھی سیکھیں، پس لازمی ہوا کہ اس تعلق کی بنا پر وہ اُن علوم سے بھی واقفیت پیدا کریں جو اُن کے عہد میں مروّج تھے، اگرچہ ان علوم پر وہ ایمان نہیں لائے تھے، بلکہ ان کا رد کیا کرتے تھے، ان کی قدح کیا کرتے تھے، اور لوگوں کو ان سے بیزاری پر مائل کیا کرتے تھے۔

امام صاحب کی فارسی دانی کا واقعہ بالکل صحیح ہے، جیسا کہ تاریخ ذہبی میں مرقوم ہے کہ خراسان سے ان کے ماموں زاد بھائی آئے اور انہی کے پاس قیام پذیر ہوئے، جب دسترخوان بچھا اور کھانا چنا گیا تو امام احمد خراسان اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ، اور وہاں ان کے جو عزیز اور رشتہ دار تھے ان کے حالات دریافت کرنے لگے۔ یہ بات چیت امام صاحب نے زیادہ تر فارسی میں کی۔

اس خبر کے راوی زہیر ہیں، جو امام احمدؒ کے پوتے ہوتے ہیں، وہ نہ صرف اس خبر کے راوی ہیں بلکہ شاہد عینی بھی ہیں، اور ہمارے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے ہم اس خبر کی تردید یا نفی کر سکیں، اور یہ اصول ہے کہ جس خبر کا راوی ثقہ ہو، جب تک اس کے رد کی دلیل موجود نہ ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ہمارے پاس اس خبر کے رد کر دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور اس بات کا کہ امام صاحب فارسی خوب جانتے تھے، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنی فقہ میں بھی فارسی یا عجمی طرزِ فکر سے مدد لینے کے عادی تھے، جیسا کہ ہم ابھی تفصیل سے بیان کریں گے، ان کی فقہ حقیقی معنیٰ میں فقہ اثری تھی جس کا دار و مدار نقل پر تھا جس میں استنباط فلسفی پر اعتماد نہیں روا رکھا جاتا تھا، اور آپ سے مروی مسائل فکر فارسی کے تاثر پر بھی مبنی نہیں تھے، اگرچہ اس میں کہیں کہیں تاثر اقلیمی کا رنگ جھلکتا ہے، جبکہ اساس استنباط نص نہ ہو بلکہ قیاس یا مصلحت ہو۔

اور یہ بات اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ امام احمد قیاس سے قدر قلیل کام لیتے تھے، اور مصلحت ...

اس کے بطلان کی از روئے نص کوئی دلیل نہ ہو، اگر یہ دلیل نہ ہو تو پھر مصلحت کی اصل اباحت ہے۔

بادیہ پیمائی اور جہاں گردی

ائمہ حدیث سے امام احمد نے علم حدیث حاصل کیا، انہی سے احادیث کی سماعت کی، جو کچھ سنا وہ ضبط تحریر میں لے آئے، جو کچھ لکھا اُسے خوب اچھی طرح ازبر کر لیا، جس طرح علم کا کوئی حریص اور شائق کر سکتا ہے۔

امام صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بغداد کے دانش کدوں اور وہاں کی مسجدوں میں ہی تحصیل علم کی ہو، اور وہاں ہی کے علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہو — اور ان کی بھی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں وہ لوگ تھے جن کا حافظہ قوی تھا، جو صاحب فہم و فراست اور زہد و تقویٰ تھے — بلکہ انہوں نے اقالیم اسلامیہ کا گشت لگایا۔ وہ بصرہ گئے، وہ کوفہ پہنچے، انہوں نے حجاز کی زیارت کی، جہاں کسی عالم کی خبر ملی، انہوں نے رخت سفر باندھا، اور اس کے حضور میں طلب علم کے لیے پہنچ گئے۔ سوا اس صورت کے کہ موت ملاقات میں حائل ہو گئی ہو، چنانچہ وہ امام مالک سے استماع نہ کر سکے، اس لیے کہ ان کے طلب حدیث کے ابتدائی عہد میں ان کا انتقال ہو گیا تھا، اسی طرح ابن مبارک سے بھی وہ استماع نہ کر سکے، کیونکہ وہ آخر عمر میں جب بغداد تشریف لائے ہیں، تو وہی زمانہ تھا جب احمد نے طلب حدیث کی منزل میں پہلے پہل قدم رکھا تھا، چنانچہ ان سے بھی وہ ملاقات نہ کر سکے، کیونکہ وہ طرطوس چلے گئے، اور وہاں سے پھر بغداد واپس نہیں آئے۔

نقص اور اسکی تلافی

امام احمد اس بات کو رنج و افسوس کے ساتھ محسوس کیا کرتے تھے کہ ان جلیل القدر علماء کے سامنے وہ زانوئے تلمذ تہ نہ کر سکے، لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس کوتاہی کی تلافی بھی بوجہ احسن فرما دی۔ چنانچہ فرمایا کرتے تھے:

"میں امام مالک سے کسب فیض نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ نے ان کے بجائے سفیان بن عیینہ سے کسب فیض کا موقع دیا، میں حماد بن زید کے حضور میں نہ پہنچ سکا، ان کے بجائے خدا نے مجھے اسمٰعیل بن علیہ سے استفادہ کا موقع عنایت فرمایا۔"[1]

امام صاحبؒ کے زمانے میں علمِ حدیث کا فن اپنے تمام مصادر کے ساتھ بروئے کار آ چکا تھا، اس عہد میں اتصال فکری بھی کامل ہو چکا تھا، نیز علوم متفرقہ میں اور دین کے علوم میں ایک صلہ اور رشتہ

پیدا ہو چکا تھا، ان میں سے متعدد میں امام احمد نے درک حاصل کیا۔ اور جو علم زیادہ مفید سمجھے ان میں تعمق کیا۔ فصل جب پک گئی، تب اسے کاٹا، درخت کی جڑیں جب اچھی طرح زمین میں ترنشین ہو گئیں شاخیں ہری بھری ہو گئیں، تب برگ و بار لانے کا وقت آیا، لوگوں نے یہ منظر دیکھا اور مسرور ہوئے۔

مسند تحدیث و افتاء

یہ تھا وہ وقت جب امام احمد تحدیث و افتاء کی مسند پر متمکن ہوئے، حافظ ابن جوزی فرماتے ہیں، کہ امام احمد نے جب تک زندگی کی چالیس منزلیں نہ طے کرلیں، حدیث و فتویٰ کی مسند پر نہیں بیٹھے، چنانچہ اس سلسلہ میں یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ:

"امام احمد کا ایک معاصر ۲۰۳ھ میں بسلسلۂ طلب حدیث ان کے پاس پہنچا لیکن انہوں نے حدیث بیان کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ امام عبدالرزاق بن ہمام کے پاس یمن گیا، پھر ۲۰۴ھ میں بغداد واپس آیا تو دیکھا کہ امام احمد حدیث بیان کر رہے ہیں، اور لوگ ان پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔"

حزم و احتیاط

امام احمد کے حزم و احتیاط کا تو یہ عالم تھا کہ حدیث و فتویٰ کی مسند پر چالیس برس کے سن تک پہنچنے، یعنی بلوغ عقل سے پیشتر وہ متمکن نہیں ہوئے، لیکن دوسرے فقہا کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سن بلوغ سے کہیں پہلے زینتِ مسند بن گئے، امام شافعی نے مکہ میں، جب درس و افتاء کا سلسلہ شروع کیا ہے، تو وہ اس عمر سے کہیں کم تھے، اور امام مالک رضی اللہ عنہ نے بھی اس عمر تک پہنچنے سے پیشتر، مسندِ درس و افتاء سنبھال لی تھی، مگر امام احمد کی احتیاط کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے بعض شیوخ کے زمانۂ حیات میں روایتِ حدیث سے جھجکتے تھے، چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے ایک معاصر نے استدعا کی کہ وہ کوئی ایسی حدیث روایت کریں جو امام عبدالرزاق سے سنی ہو، لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ حافظ عبدالرزاق ابھی زندہ تھے۔

اتباعِ سنت کی دھن

میرے نزدیک امام احمد بہت زیادہ متبع سنت تھے، وہ اس بات کا التزام رکھتے تھے کہ جو فعل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

سرزد ہوا ہے، اسے وہ بھی انجام دیں، اور وہ کام نہیں کرتے تھے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو۔ اس معاملہ میں ان کی شدت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ جب وہ پچھنا لگواتے تھے تو حجام کو ایک دینار مرحمت کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ:

"روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنا لگوایا، اور ابو طیبہ کو ایک دینار عطا فرمایا۔"

امام احمد کو اگرچہ طبعاً باندیوں سے کوئی رغبت نہیں تھی، لیکن انہوں نے ایک باندی خریدلی اس لیے کہ انہیں معلوم تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باندی رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی اہلیہ سے اسی جذبۂ متابعتِ سنت کے ماتحت اجازت طلب کی، انہوں نے اجازت دے دی، تاکہ وہ اتباعِ سنت کے سلسلہ میں اپنے شوہر کی مددگار ثابت ہو سکیں۔

آنحضرت سے ایک مناسبت

جب صورتِ حال یہ تھی کہ ایسے ایسے چھوٹے معاملات میں امام احمد اتباعِ سنت کے حریص تھے تو مناسب یہی تھا کہ وہ اس امر جلیل میں بھی اتباع کے فرض سے عہدہ برآ ہوں جو درحقیقت کارِ پیمبراں ہے، یعنی درس و تحدیث و افتاء۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے، یعنی منصبِ رسالت پر فائز ہوئے۔ پس ضروری تھا کہ چالیس برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے امام احمد بھی مسند درس و افتاء پر بیٹھنے سے جھجکتے، یعنی جب تک جسم و روح کا نمو مکمل نہ ہو جائے۔

کتمانِ علم سے احتراز

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سن سے پہلے کسی شخص کو آپ کوئی مسئلہ یا کوئی روایت بتاتے ہی نہ تھے جب کہ وہ اس کا علم رکھتے ہوں، یعنی کسی مستفتی کے جواب میں انہوں نے سکوت اختیار کیا ہو، یا ان سے کوئی حدیث پوچھی گئی ہو اور انہوں نے اس کی روایت سے انکار کیا ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرتے تو علم کے چھپانے والے ہوتے، اور حدیثِ نبوی کے نشر و اشاعت میں حائل قرار پاتے، حالانکہ خدائے بزرگ و برتر نے کتمانِ علم سے منع فرمایا ہے، اور دین کا تقاضا یہ ہے کہ احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشر و اشاعت [illegible]

اور ہمارے اس خیال کی شہادت میں کئی واقعات موجود ہیں، چنانچہ وہ مسجد خیف میں فتویٰ دیتے ہوئے ۱۹۸ھ میں دیکھے گئے، حالانکہ اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔

ان دونوں باتوں یعنی چالیس برس کی عمر سے پہلے فتویٰ نہ دینے اور چالیس برس کی عمر سے پیشتر دینے میں اگر جمع و تطبیق سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ضرورت کے وقت فتویٰ دینا تو ایک ابدی اور لازمی امر ہے، اس شخص پر فتویٰ دینا واجب ہے، جو کچھ علم رکھتا ہو لیکن درس و افتاد کی مسند پر بیٹھ کر باقاعدہ روایت حدیث کرنا، اور طالبان حدیث کو درس دینا یہ کام انہوں نے چالیس سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد کیا۔

شہرتِ عام کے مدارج

امام احمد درس و افتاد کی مسند پر اس وقت تک نہیں بیٹھے جب تک کامل نہیں ہو گئے (جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں) اور جب لوگوں کے درمیان، ان کے صلاح و تقویٰ، زہد و ورع، عفت و عظمت کا ڈنکا بجنے لگا، اور تحصیلِ حدیث کے لیے جم کر بیٹھ جانے، اور طلبِ حدیث کے لیے دور دراز مقامات کے سفر و سیاحت کے واقعات نے شہرتِ تام حاصل کر لی، اس راہ میں انہوں نے سخت سے سخت گھاٹیاں طے کیں، اُن مقامات کو طے کیا جہاں پاؤں پھسلتے اور قدم ڈگمگاتے تھے، تاکہ وہ کسی ایسے عالم تک پہنچ جائیں کہ اس سے کسبِ فیض کر سکیں۔

اور یہ اس لیے کہ لوگوں میں اہلِ فضل کا ذکر پھیلنے لگا تھا، کچھ ایسے لوگ تھے جو مقابلہ میں آتے تھے، لیکن تھے کمتر، اور امام احمد کا ذکر، ان کا فضل و کمال، ان کی دینی اور مذہبی حیثیت، مسند تحدیث و افتاء پر بیٹھنے سے پہلے شہرتِ عام کے مدارج طے کر چکی تھی: یہاں تک کہ جب وہ صنعاء میں امام عبدالرزاق کے پاس پہنچے ہیں تو ان کے زہد و تقویٰ، علم و حفظ اور عفت و ورع کا شہرہ ان سے پہلے پہنچ چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد درس و افتا کے لیے جم کر اس وقت بیٹھے جب لوگوں نے حدیثِ نبوی اور فقہ کے بارے میں ان سے پوچھ گچھ شروع کی، چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ جواب دینے کے لیے مسجد میں بیٹھ جائیں، اس کے بعد ان کی حیاتِ گرامی شہرت و عظمت کی منزلیں تیزی کے ساتھ طے

لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان کے فضل وکمال کا کیا پایہ تھا۔ امراء اور حکام کے ساتھ ان کی یہ روش تھی کہ وہ ان سے بالکل مستغنی رہتے ہیں۔ حرمت مسلمین کی مراعات وہ کس درجہ ملحوظ خاطر رکھا کرتے تھے؟

ان پر آفات و مصائب کے نزول کا سلسلہ شروع ہوا، اس سے ان کی منزلت اور عفت میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا، ان کا مقام لوگوں کی نظر میں بھی بڑھ گیا، اور بارگاہِ الٰہی کا تقرب بھی انہوں نے حاصل کرلیا۔ ان میں خاکساری تھی، فروتنی تھی، نام و نمود اور جاہ و منصب سے وہ گریزاں رہتے تھے، لوگوں نے انہیں صحیح طور پر پہچان لیا، ان کے مقام بلند، اور درجۂ عالی سے واقف ہوگئے، وہ شرف سے بھاگتے تھے۔ اور شرف ان کا پیچھا کرتا تھا، جیسا کہ خلیفۂ رسول ع حضرت ابوبکر صدیق فرمایا کرتے تھے۔

حلقۂ درس و افتاء چونکہ مسند درس و افتاء پر جلوہ فرما ہونے سے پہلے آفاق اسلامیہ کے کونے کونے میں ان کی شہرت پہنچ چکی تھی، لہٰذا لازمی تھا کہ ان کے حلقۂ درس میں انبوہ خلائق ہو۔ چنانچہ بعض رواۃ کا بیان ہے کہ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد پانچ ہزار نفوس کے قریب تھی، ان میں سے پانچسو کے قریب وہ تھے کہ جو لکھ بھی لیا کرتے تھے۔[1]

بغداد میں اتنے آدمیوں کی گنجائش جہاں ہوسکتی تھی وہ جامع مسجد کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہوسکتی تھی، چنانچہ ضروری ہوا کہ امام احمد وہیں اپنا حلقۂ درس قائم کریں ——!

ہوسکتا ہے کہ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہونے والوں کی جو تعداد بیان کی گئی ہے وہ ساری صحیح نہ ہو، لیکن اس تعداد سے کثرت تعداد کا اندازہ تو بہر حال ہو جاتا ہے، یہ تعداد اگر بقدر نصف کے بھی گھٹا دی جائے، یا اور زیادہ کم کردی جائے تو بھی بہت زیادہ بنتی ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اہل بغداد کی نظر میں امام احمد کا پایہ کیا تھا؟ اور ان کی منزلت کا کیا عالم تھا؟[2]

استفادہ کرنے والوں کی قسمیں امام احمد کے حلقۂ درس میں جو لوگ شریک ہوا کرتے تھے، ان کے بارے میں اس مقام پر یہ تصریح کر دینا بسا ضروری ہے

---

[1] المناقب لابن الجوزی ص۲۱۰ [2] ایضاً

کہ یہ سب کے سب احمد کے علم ہی کے جویا نہ تھے، ان میں کچھ لوگ وہ تھے جو تمین کے طور پر حاضر ہوتے تھے، کچھ ایسے تھے جو وعظ و پند کے لیے حاضر خدمت ہوتے تھے ایسے لوگ بھی تھے جو اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ اس مرد عجیب کے حالات سے واقفیت پیدا کریں، اس کے خلق و ادب، اور کردار و سیرت کو دیکھیں اور پرکھیں۔

چنانچہ ان کا ایک معاصر کہتا ہے۔

"میں بارہ سال تک امام ابو عبداللہ احمد بن حنبل کی خدمت میں حاضر رہا، وہ مُسند اپنی اولاد کو پڑھایا کرتے تھے، میں نے اس میں سے ایک حدیث بھی نہیں لکھی، مجھے ان کی جس چیز سے غیر معمولی شغف تھا، وہ تھے ان کے اخلاق و آداب اور سیرت و کردار[1]"

درس و تحدیث کی دو مجلسیں

امام احمد کے درس و تحدیث کی دو مجلسیں تھیں۔

۱ - ایک مجلس گھر پر منعقد ہوتی تھی، اس میں خاص خاص شاگرد شریک ہوتے تھے، اور خود امام صاحب کے لڑکے تحصیل حدیث کے لیے رونق افروز ہوتے تھے۔

۲ - دوسری مجلس مسجد میں جمتی تھی۔ اس مجلس میں عام لوگ اور تلامذہ کا گروہ کثیر شریک ہوتا تھا۔

ابھی ہم یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ امام صاحب کے حلقۂ درس میں پانچ ہزار کے قریب نفوس شریک ہوتے تھے، ان میں پانچ سو کے قریب وہ تھے کہ جو کچھ سنتے تھے اسے قلمبند بھی کر لیتے تھے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ایسا سمجھیے کہ حاضرین کا دسواں حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو ان سے حدیث سُن کر نقل و کتابت کی قید میں لے آتے تھے۔ یہ نقل و روایت کرنے والے لوگ ان کے گروہ تلامیذ اور متبعین کے خاص خاص لوگ تھے، پھر خاص الخاص وہ تلامذہ تھے جو ان کے گھر پر تشریف لے جاتے تھے، اور وہاں ان کے صاحبزادوں اور عزیزوں کے ساتھ شریک درس ہُوا کرتے تھے۔

درس و تحدیث کا وقت

حافظ ذہبی کی تاریخ میں منقول ہے کہ امام احمد کے درس و تحدیث کا وقت عام طور پر نماز عصر کے بعد ہُوا کرتا تھا

شاید یہ وقت انہوں نے اس لیے اختیار کیا تھا کہ رات شروع ہونے سے پہلے اور دن ڈھلنے کے

[1] المناقب لابن الجوزی، ص ۲۱۰

بعد کا وقت بھی ہے، نیز یہ کہ اکثر لوگوں کی فرصت کا وقت بھی ہوا کرتا ہے، لہٰذا حلقۂ درس میں حاضر ہونے کی سہولت حاصل ہو جاتی تھی، اور اس لیے بھی کہ یہ وقت مشاغل و اضطراب حیات سے فرصت اور صفاءِ نفس کا ہوتا ہے، اس موقع پر حدیث و آثار سے متعلق جو باتیں سننے میں آتی ہیں انہیں نفسِ انسانی بشاشت اور مسرت کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ لہٰذا یہ باتیں دل کی گہرائی میں اترتی چلی جاتی ہیں۔

چند اہم خصوصیتیں

امام احمد کے درس کی چند خصوصیتیں ایسی تھیں جو لوگوں کے دلوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی تھیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) ان کی مجلس درس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہاں تواضع اور اطمینان نفس کے ساتھ ساتھ وقار و سکون کی کیفیت طاری رہتی تھی، اور یہ وقار کا دبدبہ صرف ان کی مجلس علمی ہی سے مختص نہ تھا۔ ان کی ہر مجلس، خواہ وہ نجی ہو یا علمی، اس خصوصیت کی حامل ہوتی تھی، نہ وہ مذاق کرتے تھے، نہ لہو و لعب کی باتیں پسند کرتے تھے، جو لوگ ان کی خدمت میں اکثر آمد و رفت رکھتے تھے، وہ اس بات سے آگاہ تھے چنانچہ ان کی موجودگی میں ذرا بھی ہنسی اور دل لگی کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ خواہ وہ مجلس علم ہو یا کسی دوسرے نوع کی مجلس۔ امام احمد کے شیوخ اور اساتذہ تک ان کی اس عادت سے واقف تھے، اور اس کا لحاظ رکھتے تھے، چنانچہ ان کی موجودگی میں وہ بھی مزاح اور دل لگی کی باتوں سے مجتنب رہتے تھے۔ ابو نعیم خلف بن سالم سے روایت کرتے ہیں کہ:

"ہم یزید بن ہارون کی مجلس میں حاضر تھے۔ یزید نے اپنے اُن شاگردوں سے جنہیں وہ املا کرا رہے تھے، کوئی بات ہنسی مذاق کی کہہ دی۔ امام احمد بن حنبل بھی موجود تھے، وہ کھنکھار کر رہ گئے، یزید نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہا:

"کمبختو! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں دیا کہ امام احمد یہاں ہیں تو میں کیوں مزاح کی باتیں کرتا؟"

تلاش و تحقیق

(۲) دوسری بات جو ان کے حلقۂ درس میں خاص طور پر نمایاں نظر آتی تھی یہ تھی کہ بغیر تلاش و تحقیق کے وہ درس کا آغاز نہیں کرتے تھے، وہ احادیث مرویہ کو اچھی طرح چھان پھٹک لیتے تھے۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، جن میں انہوں نے احادیث مدون کی تھیں پہلی بات تو یہ کہ بغیر تحقیق کیے وہ کوئی بات نہیں کہتے تھے۔

جب تک کتاب دیکھ کر اطمینان نہ کریں، تاکہ نقل وبیان میں کسی طرح کی امکانی غلطی کے واقع ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔

یہ بہت ہی کم ہُوا کہ وہ کتاب کی طرف رجوع کیے بغیر حدیث بیان کریں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے ان روایتوں کا شمار کیا ہے جو آپ نے کتاب دیکھے بغیر بیان کیں، تو یہ تعداد ایک سَو سے متجاوز نہیں ہوئی۔ یہ تعداد اس ساری مدتِ حیات پر حاوی ہے جو روایت ونقل، اور تحدیث وافتاء میں امام صاحب نے بسر کی، جس کی مدت کم وبیش چالیس سال ہوتی ہے۔

امام صاحب کی مجلس کی کیفیت

تاریخ ذہبی میں مروذی جو امام احمد کے ساتھی تھے، ان کی مجالس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"کسی مجلس میں مَیں نے امام ابوعبداللہ کی مجلس سے زیادہ کسی کم مایہ اور فقیر شخص کو معزز اور ممتاز نہیں دیکھا، وہ دنیا والوں سے میل جول کم رکھتے تھے۔ حلیم اور بُردبار تھے، عجلت پسندی کو پسند نہیں کرتے تھے کثیر التواضع تھے سکینت اور وقار ان کی سرشت تھی۔ اپنی مجلس میں جب عصر کے بعد تشریف فرما ہوتے تھے تو اس وقت تک خاموش رہتے تھے جب تک ان سے سوال نہ کیا جائے۔"

مُسنَد کا اِملا

اس واقعہ سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ان کے عادات وخصائل کیا تھے؟ یہ کہ جب تک پوچھا نہ جائے، بابِ سخن وا نہ کرتے تھے، یعنی بیان اس وقت کرتے تھے جب طلب دیکھتے تھے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے جب اپنی کتاب "مُسنَد" تحریر فرمائی، تو اپنے خاص خاص شاگردوں، اور اولاد کو، ان کی طلب وتقاضا کے بغیر املا کراتے تھے، حالانکہ دوسروں کے ساتھ وہ ایسا نہیں کرتے تھے، انہیں وہ اسی وقت املا کراتے تھے جب ان کی طرف سے طلب دیکھتے تھے، ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب تک ان سے پوچھا نہ جائے، وہ [illegible]یث بیان نہیں فرمایا کرتے تھے۔

امام ابوحاکم رازی کا بیان

ابن الجوزی، امام ابوحاتم رازی سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"میں احمد بن حنبل کے پاس آیا، یہ واقعہ ۲۱۳ھ کا ہے۔

یہ وہ وقت تھا کہ نماز کے لیے وہ باہر نکل رہے تھے" کتاب الاشربہ" [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بلکہ اس امر پر وہ اپنے شاگردوں اور اصحاب کو بھی آمادہ کیا کرتے تھے، وہ انہیں بغیر کتاب دیکھے روایت سے منع کرتے تھے، اس اندیشہ سے کہ کہیں گمرہی کے موجب نہ بنیں۔

چنانچہ امام علی المدینیؒ بغیر کتاب دیکھے، حدیث کی روایت نہیں کرتے تھے، وہ فرمایا کرتے تھے:

"میرے سردار امام احمد بن حنبل نے مجھے حکم دیا ہے کہ بغیر کتاب دیکھے، روایت حدیث نہ کروں"

اور یہی حافظ علی بن المدینی جو امام احمد کی اس ممانعت کا ابھی ذکر کر چکے ہیں فرماتے ہیں:

"ہم لوگوں میں ابو عبداللہ (احمد) سے زیادہ قوی الحافظہ کوئی نہیں تھا"

فتاویٰ فقہیہ اور امام احمد امام صاحب کی مجلس درس کی تیسری خصوصیت کو ہم دو قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں:

اول ——— روایت حدیث اور نقل حدیث جسے وہ اپنے شاگردوں کو اپنی کتاب میں سے املا کرایا کرتے تھے، جیسا کہ ابھی آپ نے پڑھا ہوگا، شاذ صورتوں کے سوا وہ حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔

دوم ——— فقہی فتاویٰ، آپ اپنے تلامذہ کو اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ ان فتاویٰ کو مدوّن اور منضبط کریں، احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ آپ کسی اور چیز کی تدوین جائز نہیں سمجھتے تھے، نہ اس کی اجازت دیتے تھے۔ امام صاحب کے نزدیک علم دین صرف کتاب و سنت کا نام تھا، ان کے نزدیک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے سوا اشخاص و افراد کی آراء کی جمع و تدوین بدعت تھی، اور آپ کے نزدیک سب سے زیادہ ناگوار اور ناپسندیدہ جو چیز تھی وہ خود آپ کے فتاویٰ کی جمع و تدوین کا کام تھا، آپ اسے ناپسند کرتے تھے کہ لوگ آپ سے فتاویٰ نقل کریں، بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس طرح کی کوئی چیز جب آپ کے علم میں آتی تھی تو اپنی طرف اس کی نسبت سے انکار کر دیتے تھے، اس لیے کہ یہ بات آپ کی نظر میں ناجائز تھی۔

ایک مرتبہ آپ کو بتایا گیا کہ آپ کے بعض شاگردوں نے کچھ مسائل آپ سے روایت کیے ہیں

[illegible]

"آپ حضرات گواہ رہیے کہ میں نے ان سب مسائل سے رجوع کر لیا"

آپ کے پاس ایک خراسانی شخص کچھ کتابیں لے کر آیا، ان کتابوں میں ایک کتاب پر آپ کی نظر پڑی تو اس میں اپنا کلام پایا، یہ دیکھ کر آپ کو غصہ آگیا اور آپ نے کتاب پھینک دی۔

امام احمد کا یہ طرزِ عمل صرف اپنے افکار و آراء کے سلسلہ ہی میں نہیں تھا، بلکہ دوسرے آئمہ کی فقہ کے بارے میں بھی آپ کا رویہ یہی تھا، چنانچہ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے سوال کیا۔

"کیا میں اہل الرائے (حنفیہ) کی کتابیں ضبط تحریر میں لا سکتا ہوں؟"

آپ نے فرمایا:

"ہرگز نہیں!"

سائل نے کہا،

"لیکن ابن مبارکؒ تو لکھ لیا کرتے تھے؟"

امام احمد نے جواب دیا:

"ابن مبارک آسمان سے نہیں اُترے تھے، ہمیں تو حکم ہے کہ ہم علم آسمان سے حاصل کیا کریں"[1]

اسی طرح آپ امام شافعی اور ابو ثور وغیرہ کے مسائل فقہیہ بھی ضبطِ تحریر میں لانے سے منع فرمایا کرتے تھے، حالانکہ امام شافعی کو آپ اپنے اُستاد کی طرح مانتے تھے۔ اور ان کی بہت زیادہ عزت و محبت کرتے تھے، لیکن اس ممانعت کے باوجود ضخیم مجلدات میں امام احمد کے فتاویٰ جمع کیے گئے، جن پر بعض لوگوں کو کچھ کلام بھی ہے۔ چنانچہ آگے چل کر ہم امام احمد کی فقہ پر بحث کے موقع پر اس سلسلہ میں زیادہ شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کر سکیں گے۔

پیرویٔ سلف قبل اس کے کہ ہم امام احمد کی مجلسِ درس کی یہ گفتگو ختم کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی حیاتِ گرامی کے ایک اہم واقعہ پر ایک نظر ڈال لیں۔

وہ یہ کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے طلب حدیث و فقہ کے دور میں اور بعدہٗ تحدیث و روایت کے زمانہ میں انہوں نے جو زندگی بسر کی، وہ خاص طور پر پیرویٔ سلف پر مبنی تھی، یہ ایسی زندگی تھی، جو وقت کے اثرات و ملابسات سے یکسر خالی تھی۔ فکری، سیاسی، اجتماعی، اور حربی موثرات جو ان کے زمانہ

[1] ان بیانات کی تفصیل کے لیے مناقب امام احمد لابن الجوزی ص ۱۹۲-۱۹۳ ملاحظہ ہو۔

میں چل پڑے تھے، انہوں نے امام احمد کی ذات، اور ان کے افکار و خیالات کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا، وہ ان نئے عصری تقاضوں سے متاثر ہوئے بغیر اس فضا میں پرواز کرتے رہے جسے صحابۂ کرام تابعین عظام، اور تبع تابعین کا دَور کہا جا سکتا ہے، وہ انہی کے راستے پر چلے، انہی کی راہ اختیار کی، اس لیے کہ ان کا علم اور ان کی فقہ دراصل عبارت تھی علمِ سنّت سے، وہ صرف ایسے امر میں ذوقِ جستجو کا مظاہرہ کرتے تھے جس کے بارے میں معلوم ہو جاتا تھا کہ صحابۂ کرام اس راہ کی رہبری کر چکے ہیں، پس اگر صحابہ کا نشان قدم ملتا تو وہ اُن کی رائے کی پیروی کرتے اور دوسرے افکار و آرا کو نظر انداز کر دیتے تھے، اور اگر یہ معلوم ہوتا کہ صحابۂ کرام اس راہ سے نہیں گزرے تھے تو وہ بھی اس کی رہبری ترک فرما دیتے تھے اور سختی کے ساتھ اس اندیشہ کے ماتحت ٹھٹک جاتے تھے کہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ اس لیے کہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اس جادۂ صحیح سے انحراف منہاجِ سلف سے انحراف کے مترادف ہے، اور خدا کے دین سے روگرداں ہو جانے کا ہم معنی ہے۔

امام صاحب نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسے علم میں صرف نہیں کیا جو علمِ سلف نہ کہلایا جا سکے، نہ ایسی کوئی چیز پڑھائی جو علمِ سلف سے غیر متعلق ہو۔

عربی عناصر پر عجمیت کا غلبہ

امام احمد اس راستے پر کیوں گامزن ہوئے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم امام احمد کے زمانہ پر ایک نظر ڈال لیں، گو وہ سرسری ہی کیوں نہ ہو، (تفصیل مناسب موقع پر آ رہی ہے)۔

امام صاحب کا زمانہ وہ ہے کہ عربی عناصر پر، فارسی عناصر غالب آ چکے تھے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ فارسی تہذیب و ثقافت عربی حضارت پر غالب آ گئی تھی، یا کم از کم غیر عربی حضارت کا سکہ اسلامی سوسائٹی پر چلنے لگا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ممالکِ اسلامیہ میں مختلف عناصر ابھر رہے تھے، نئی نئی قوموں سے میل جول کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی، یونانی اور سریانی زبان سے علومِ فلسفیہ کے بیش از بیش ترجمے ہو رہے [illegible]

اور اس عہد کی خصوصیت یہ تھی کہ منازعات بڑھ گئے تھے، مختلف تمدنوں کی آویزش میں اضافہ ہو گیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افکار و آرا، اور آداب و اخلاق میں انحراف و تضاد پیدا ہو گیا، فکری اور اجتماعی اختلاف و انحراف بڑھ گیا تھا، آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جو باتیں انہونی سمجھی جاتی تھیں، وہ کثرت کے ساتھ رونما ہونے لگیں، اور جسے نادر اور غریب سمجھا جاتا تھا اس سے لوگ مانوس اور مالوف ہو گئے۔

مامون و امین کی کشمکش کا نتیجہ

یہ تمام باتیں عباسیوں کے عہد میں اس وقت سے رونما ہونا شروع ہوئیں جب فارسی تلواروں اور سنگینوں پر اس نے استقرار اور استحکام حاصل کیا۔ خلیفہ منصور نے جن مستحکم بنیادوں پر یہ حکومت قائم کی تھی وہ قائم نہ رہ سکیں۔ جب خلیفہ مہدی مسندِ خلافت پر متمکن ہوا تو طرح طرح کے فتنے ابھرے اور شورشیں ظہور میں آئیں۔ تلواریں میانوں سے نکلیں، اور سنگینوں نے اپنی چمک دکھائی لیکن اس میں اتنی سکت تھی کہ اس نے ان فتنوں اور شورشوں کا قلع قمع کر دیا۔ پھر اس کے بعد ہارون الرشید مسند آرائے خلافت ہوا تو اس نے ان منازعات پر غالب آنے کی کوشش اس طرح کی کہ اسلامی سوسائٹی کا تلوار کی جنگ سے رُخ موڑ دیا، فقہاء اور محدثین اس کے حضور میں پہنچے، اور انہیں اقتدار و اختیار کے مناصب حاصل ہوئے۔

پھر مامون الرشید کا دَور آیا، وہ اپنے بھائی امین پر اہلِ فارس کی امداد و اعانت سے غالب آیا، بس یہیں سے غیر عربی عناصر، عربی عناصر پر غالب آئے، اور نئی نئی صورتیں پیدا ہونے لگیں، فلسفۂ یونان اور علومِ جدیدہ کو مامون کی صورت میں بہت بڑا معین و مددگار مل گیا۔

تخریب پسند عناصر

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فساد انگیزیاں اور مفسدہ پردازیاں بڑھ گئیں اسلامی سوسائٹی میں تخریب پسند عناصر پروان چڑھنے لگے، فکرِ اسلامی پر نت نئی فکری یورشیں پس پردہ رہ کر شروع کر دی گئیں۔

اس موقع پر وہ لوگ جو منہاجِ سلف پر رہروی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے، دو حصوں میں بٹ گئے۔

ایک گروہ تو وہ تھا جس نے مقاومت و مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔

دوسرا راستہ امام احمد کا تھا، ان تمام منازعاتِ فکری وعقلی کے دور میں وہ بالکل الگ تھلگ رہے وہ اب بھی اس فضا میں سانس لے رہے تھے جو سلف صالح کی تھی، ان کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے ایک معاصر نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ:

"امام احمد بہت بڑے تابعی ہیں، اگرچہ انہوں نے تابعین کرام کا زمانہ نہیں پایا"

امام صاحب کا قطعِ تعلق

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں سے یکسر قطع تعلق کر لیا جو اثرِ سلف سے ہٹ کر اپنی فکر وعقل کی راہیں تلاش کر رہے تھے، اس قطع تعلق کی انتہا یہ تھی کہ کم از کم اپنے لیے تو وہ ان فلسفیوں اور عقل پرستوں کا رد کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے اس مسلک پر زندگی کی آخری سانس تک قائم رہے،

ایک شخص نے امام صاحب کو اہلِ کلام سے مناظرہ کے سلسلہ میں لکھا، اس کے جواب میں امام صاحب نے حسبِ ذیل مکتوب اسے تحریر فرمایا:

"خدا تمہاری عاقبت بخیر کرے۔

ہم نے جو کچھ (سلف سے) سنا ہے اور جو کچھ ہم کو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ (سلف) لوگ علم کلام کو ناپسندیدہ قرار دیتے تھے، اور کج راہ لوگوں کے ساتھ نشست وبرخاست کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ہر نئی چیز جو کتاب کی صورت میں اور بدعتیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے سلسلہ میں ہو ان کے نزدیک مکروہ ہے[1]"

علمِ کلام کی موشگافیاں

امام احمد لوگوں کو، علم کلام کی موشگافیوں سے باز رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ یہ وہ علم ہے جو مذہبی عقائد کو فلسفیانہ طور پر پرکھتا اور بحث کرتا ہے، لہٰذا آپ اہل کلام کی مذمت فرمایا کرتے تھے، اگرچہ کسی مسئلہ میں وہ برسرِ حق ہی کیوں نہ ہوں، نیز باری تعالیٰ کے بارے میں تدقیق اور نکتہ آفرینی سے بھی آپ منع کیا کرتے تھے

امام احمد کا یہ مسلک ——— علم کلام کے خلاف ——— اس امر پر مبنی تھا کہ یہ ایسا راستہ ہے جس پر سلف نے کبھی قدم فرسائی نہیں کی، اس راہ میں چلنے والا اگر ایک مرتبہ بھی قدم اٹھاتا ہے تو بھی وہ بالآخر گمراہی کے راستہ پر جا پڑتا ہے۔

منہاج سلف کی طرف دعوت

امام احمد کی مجلس درس و تدریس ایک ایسے مطمئن مومن کی مجلس تھی جو ایمان اور اسلام کی فضا میں زندگی بسر کرتا ہے، اور اپنے آپ کو عصر صحابہ و تابعین میں گم کر دیتا ہے، اپنے شاگردوں کو دعوت دیتا ہے کہ اکابر سلف کے راستہ پر چلیں۔ انہی کی باتوں پر کان دھریں، انہی کے اعمال صالحہ کو پیش نظر رکھیں۔ وہ ایک ایسے شخص کے لیے جو متقی ہو اور منہاج سلف پر چلتا ہو ایک مثال صالح تھے، اس باب میں ان کا طریق کار اور اسلوب حیات وہی تھا جو سفیان ثوری، اور عبداللہ بن المبارک وغیرہ کا تھا۔ ان اکابر کے متعلق انشاء اللہ ہم آگے چل کر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

مستحق کا ہے کے تھے، ملا کیا؟

امام احمد جیسا متقی اور متورع شخص اس کا مستحق تھا کہ اپنے گھر اور مسجد میں سکون اور اطمینان کی باوقار زندگی بسر کرتا، نہ اسے کسی ہنگامہ سے واسطہ ہوتا نہ شورش سے، لیکن اس ساکن تالاب کے لیے پتھر مقدر ہو چکے تھے، جنہوں نے اس کے سکون اور اطمینان کو فساد اور فتنہ سے بدل دیا۔ اس کے اعتقاد اور ایمان کی دنیا کو جھنجھوڑ دیا۔

اس امام جلیل کے لیے یہ بات بھی مقدر ہو چکی تھی کہ ابتلا اور مصیبت کے پہاڑ اس پر ٹوٹیں، اس کے جسم کو ہدف ستم بنایا جائے، اور اس کے اعتقاد و ایمان کو تہ و بالا کرنے کی کوشش کی جائے، اسے کوڑے مارے جائیں، آہنی ہتھکڑیوں، اور بیڑیوں میں جکڑ کر اسے سر راہ گھسیٹا جائے۔ صرف اس جرم میں کہ وہ اس طرح کیوں نہیں سوچتا تھا جس طرح مامون سوچتا تھا؟ اور اس کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے کے لیے وقت کے علماء سوچتے تھے؟

اب ہم اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

عہدِ ابتلا

بہ جرمِ عشق توام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

امام صاحب کا دورِ ابتلاء

اُس کے اسباب اور ادوار

امام صاحب کے دورِ ابتلاء کا اصل سبب مامون کی وہ دعوت تھی جو اس نے وقت کے فقہاء اور محدثین کو اپنے قول خلق قرآن کی تائید و حمایت کے سلسلہ میں دی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں کی زبانوں پر بھی یہ بات جاری ہو گئی کہ قرآن کریم مخلوق اور حادث ہے، جن لوگوں نے یہ مسلک اعتزال حاصل کر لیا، انہیں وزارت کے منصب ملے، عزت اور اقتدار کی کرسی ملی، وہ مقرب بارگاہ بنا لیے گئے۔

سردست اس مسئلہ پر ہم امام احمد کے افکار و آراء سے بحث نہیں کرتے، کیونکہ بعد میں ان کی رائے کے بارے میں علماء میں اختلاف پیدا ہو گیا، لہٰذا اس مسئلہ پر آگے چل کر ہم گفتگو کریں گے لیکن یہ بات تو بہر حال سب مانتے ہیں کہ امام احمد نے مامون کی رائے سے اتفاق نہیں کیا، نہ انہوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی، اس جرم کی پاداش میں وہ نشانۂ جور و اذیت بنائے گئے، اس شقاوت اور سفاکی کا آغاز مامون کے عہد میں ہوا، پھر معتصم باللہ اور واثق باللہ کے عہد میں مامون کی وصیت اور اس کی پیروی کے سلسلہ میں درجۂ اتمام کو پہنچی۔ لہٰذا اس مرحلہ پر ہم صرف یہ بیان کریں گے کہ امام صاحب کو کن آفات و مصائب سے اس سلسلہ میں دوچار ہونا پڑا؟ پھر ہم بتائیں گے کہ خلفاء اور گورنروں سے امام صاحب نے کیا فرمایا؟

مامون الرشید اور خلق قرآن | چونکہ امام صاحب کی مصیبت اور آماجگاہ مصائب بننے کا واحد

سبب یہ تھا کہ مامون نے چاہا کہ وہ بھی خلق قرآن کا مسلک اختیار کرلیں۔ اس لیے ہم مامون کے اس قول کی تفصیل بیان کرتے ہیں، اس ذیل میں علماء اور دوسرے فرقوں کا رویّہ بھی سامنے آجائیگا

خالد بن عبد اللہ القسری کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے یہ کہا کہ "قرآن مخلوق ہے" وہ جعد بن درہم تھا، جو عبد اموی کا ایک فرد تھا، اسے عید اضحیٰ کے دن کوفہ میں خالد بن عبد اللہ القسری نے اسی جرم میں قتل کر ڈالا۔ وہ خالد کے سامنے اس حالت میں کہ اس کی مُشکیں کسی ہوئی تھیں، لایا گیا۔ نماز کا وقت آچکا تھا، خالد نے نماز سے فراغت کے بعد ایک خطبہ دیا، اپنے خطبہ کے آخر میں اُس نے کہا:

"لوگو!

جاؤ، اپنی اپنی قربانی کے جانور ذبح کرو، مَیں نے ارادہ کیا ہے کہ جعد بن درہم کو ذبح کروں، اس لیے کہ یہ کہتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے باتیں نہیں کیں، نہ خدا نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست بنایا، خدا اس بات سے بہت بلند ہے جو یہ کمبخت کہتا ہے!"

پھر خالد منبر سے اُترا اور جعد بن درھم کو قتل کردیا۔

جہم بن صفوان جہم بن صفوان بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام کی نفی کیا کرتا تھا، یعنی اس کا خیال تھا کہ خدا بات چیت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ صفات و حوادث سے منزّہ ہے۔ اسی لیے جہم کہتا تھا کہ قرآن قدیم نہیں مخلوق ہے۔

پھر معتزلہ کا دور شروع ہوا، انہوں نے پہلے تو صفاتِ باری تعالیٰ کا انکار کیا، پھر یہاں تک مبالغہ کیا کہ اس کے منکر ہو گئے کہ خدا کلام کر سکتا ہے اور قرآن کریم کی اس آیت "وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا" کی یہ تاویل کی کہ اللہ تعالیٰ نے کلام کی صفت پیدا کی ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے تکلم کی صفت کی صاف نفی کر دی۔ معتزلہ کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اور تمام چیزیں پیدا کی ہیں اس طرح اُس نے صفتِ کلام بھی پیدا کی ہے، اسی بنا پر ان کا یہ دعویٰ تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔

[illegible]

بشر بن غیاث عصرِ عباسی میں معتزلہ نے خلق قرآن کے مسئلہ میں بہت زیادہ نکتہ آفرینیاں پیدا کیں، وقت کے کچھ فقہا بھی ان کے ہمنوا بن گئے۔ چنانچہ مصری علما میں بشر بن غیاث المریسی کا بھی یہی مسلک تھا۔ بشر کے استاذ قاضی ابو یوسفؒ نے، جو حضرت امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید تھے، اس مسلک سے اسے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانا۔ آخر قاضی ابو یوسف نے اسے اپنی مجلس سے اٹھا دیا!

ہارون رشید اور معتزلہ یوں تو ہارون رشید کے عہدِ خلافت ہی سے معتزلہ کی تحریک شروع ہو گئی تھی، اور دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا، وہ لوگوں کو اپنے مسلک کی طرف دعوت دینے لگے تھے، لیکن رشید ان لوگوں میں نہیں تھا جو عقائد کے معاملات میں ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا، اور اقوالِ فلاسفہ کی روشنی میں جدل عقائد برپا کرنے والوں کا ساتھ دیتا، یہی وجہ تھی کہ رشید کے عہدِ خلافت میں معتزلہ، اپنے عقائد کے بارے میں کچھ زیادہ پروان نہ چڑھ سکے بلکہ ایک روایت تو یہ بھی ہے کہ معتزلہ کے ایک گروہ کو، جو جدل عقائد میں مبتلا تھا، اس نے نذرِ زنداں کر دیا، اور جب بشر بن غیاث کا مقولہ اس تک پہنچا تو اس نے کہا

"اگر خدا تعالیٰ نے مجھے موقع دیا تو میں بشر کو قتل کرکے چھوڑوں گا؟"

چنانچہ ہارون رشید کے عہدِ خلافت میں بشر چھپا پھرتا رہا۔

مامون الرشید کا عہدِ خلافت لیکن جب مامون الرشید کا دورِ خلافت شروع ہوا تو صورتِ حالات یکسر بدل گئی۔ معتزلہ اس پر چھا گئے، اس کے حاشیہ نشینوں اور مصاحبوں میں بھی یہی لوگ نمایاں تھے، اس نے بھی انہیں اپنا مقرب بارگاہ بنالیا، ان کی زیادہ سے زیادہ پذیرائی کی، انہیں بلند و برتر مناصب پر فائز کیا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ جب ابو ہشام الفوطی (جس کا شمار ائمہ معتزلہ میں ہوتا ہے)، اس کے پاس آیا تو تعظیم قد ہو کر مامون نے اس کی تعظیم کی، حالانکہ یہ اظہارِ احترام وہ کسی کے لیے روا نہیں رکھتا تھا۔

اور مامون معتزلہ پر اس درجہ جو مائل تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ادیان و مقالات میں وہ ابوہذیل علاف کا شاگرد تھا، اور ابوالہذیل وہ شخص ہے جس کا شمار معتزلہ کے سربراہوں میں ہے۔

[illegible]

سب سے آگے تھے، اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اس لیے کہ یہ لوگ عقلی طور پر مسائل کی بحث میں خصوصیت امتیاز رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ مامون پر ان لوگوں کا اثر بہت زیادہ ہو گیا، انہی میں سے اس نے اپنے پسندیدہ لوگوں کو مصاحبت کے لیے چن لیا، بلکہ اس گروہ میں سے کچھ لوگوں کو اس نے مناصب وزارت پر بھی فائز کر دیا، اور اسی جماعت کے ایک فرد احمد بن ابی دؤاد پر تو اس نے لطف و کرم کی بارش سی کر دی، یہاں تک کہ اس نے اپنے بھائی معتصم کو وصیت کی کہ امور مہمہ میں اس کی فکر و رائے کو شریک رکھا کرے، چنانچہ وہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتا ہے:۔

"ابو عبد اللہ بن ابی دؤاد کو اپنے ہر معاملہ میں شریک کار رکھنا"

پھر جب معتزلہ نے اپنی منزلت اور حیثیت اچھی طرح محسوس کر لی تو انہوں نے سوچا کہ اب خلق قرآن کے عقیدہ کا مامون سے اعلان کرا دینا چاہیے، تاکہ ان کے مسلک کو فروغ حاصل ہو اور اس طرح وہ عوام کی نگاہوں میں بڑھ جائیں اور اجلال و احترام کا خراج ان سے حاصل کر لیں۔ یہ بات مامون کے دل میں بھی بیٹھ گئی، چنانچہ اس نے سنہ ۲۱۲ھ میں اس کا اعلان کرا دیا اور اس بات کو پیش نظر رکھا کہ اس کی مجلس مناظرہ میں کون چھاجاتا ہے اور کون اپنے دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ اس نے لوگوں کو فکر و عقیدہ کے بارے میں آزاد چھوڑ دیا، وہ ان پر کوئی بات مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا، نہ کوئی عقیدہ تھوپنا چاہتا تھا۔

جبر و جور کا آغاز لیکن سنہ ۲۱۸ھ میں صورت حال بدل گئی۔ اس سنہ میں اس کا انتقال ہوا۔ انتقال سے پہلے اس نے طے کیا کہ اپنی قوت اور قہرمانیت سے کام لے کر لوگوں کو خلق قرآن قبول کرنے پر مجبور کرے، چنانچہ اس فیصلہ کو جبراً نافذ کرنے کی اس نے تیاریاں شروع کر دیں، اس کی ابتدا اس فرمان سے ہوئی جو اس نے رقہ سے اپنے نائب اسحٰق بن ابراہیم کو جو بغداد میں تھا بھیجا کہ وہ فقہاء اور محدثین پر سختی کرنے میں کوئی تامل نہ کرے، یہاں تک کہ وہ یہ مان لیں کہ قرآن مخلوق ہے۔

اس کام کی ابتدا ان لوگوں سے ہوئی جو مناصب حکومت پر فائز تھے، یا حکام سے کسی نوعیت اور صورت میں وابستہ تھے۔ اگرچہ وہ عدالت قضا میں گواہ کی حیثیت سے کیوں نہ آئے ہوں، بغداد میں اپنے نائب کو مامون نے جو پہلا فرمان لکھا تھا اس کے آخر میں وہ تحریر کرتا ہے۔

"تمہارے ہاں جو قاضی ہیں ان کو بلاؤ، اور امیرالمومنین کا یہ فرمان انہیں سنا دو، ان کے عقائد کا امتحان لو اور دریافت کرو، آیا وہ قرآن کو حادث اور مخلوق سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اور ان لوگوں کو یہ بتا دو کہ امیرالمومنین اس شخص سے اپنا کوئی کار خدمت نہیں لیں گے جس کا ایمان اور توحید کے بارے میں اعتقاد و یقین پختہ اور مستحکم (مطابق مامون کے) نہ ہو، پس اگر وہ اس مسلک کو تسلیم کریں اور امیرالمومنین کی رائے سے اتفاق کریں تو ان کے لیے ہدایت اور نجات کا راستہ کھلا ہوا ہے، پھر تم ان کو حکم دینا کہ وہ علی رؤس الاشہاد اپنے عقیدے کو بیان کریں، اور جو اس بات کو تسلیم نہ کرے کہ قرآن مخلوق اور محدث ہے، اس کی شہادت ترک کر دی جائے۔

اس کے علاوہ تم اپنے علاقہ کے تمام قاضیوں سے اس مسئلہ کے بارے میں پوچھ گچھ کرو، انہیں ہمارا یہ حکم پہنچا دو اور ان کے احوال کی نگرانی رکھو تاکہ جب تک وہ اپنے دین و ایمان میں پکے اور سچے ثابت نہ ہوں احکام الٰہی کو نافذ نہ کرنے پائیں۔ امیرالمومنین کے اس فرمان کا جو اثر مترتب ہو اس سے اطلاع دو۔[1]"

اس فرمان سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ جو لوگ اس عقیدہ سے اختلاف رکھتے تھے ان کے لیے مامون نے کوئی تعزیر و عقوبت تجویز نہیں کی تھی، سوائے اس کے کہ مناصب حکومت سے محروم کر دیئے جائیں، یا اگر وہ گواہ کی حیثیت سے حاضر عدالت ہوں تو ان کی شہادت نہ قبول کی جائے۔

یہ فرمان پا کر اسحٰق بن ابراہیم نے نہ صرف قاضیوں کو بلایا، اور ان کا امتحان لیا بلکہ اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس نے محدثین کو بھی اپنی بارگاہ میں طلب کیا، بلکہ ہر اس شخص کو طلب کیا جو مسند ارشاد و ہدایت، اور تعلیم و فتویٰ سے کچھ تعلق رکھتا تھا، ان سب کا اس نے امتحان لیا، اور انہوں نے اس مسئلے سے متعلق جو جوابات دیئے، وہ مامون کے پاس بھیج دیئے۔[2]

---

[1] تاریخ الطبری۔

[2] مامون نے اس فرمان کے جواب میں وقت کے محدثین اور علماء نے جو کچھ کہا اور مامون نے جس طرح اس کا رد کیا، اس کا بیان آگے آئے گا۔

اس کے بعد مامون نے جو مکتوب بھیجا، اس میں ان جوابات کو کمزور قرار دیا، اور جواب دینے والوں پر جرح کی، اور ان کے بارے میں تند و تیز اور تلخ و ترش الفاظ استعمال کیے، پھر ان سزاؤں کا ذکر کیا جن کا ذکر اس سے پہلے اس نے نہیں کیا تھا، اور حکم دیا کہ جو شخص اس مسلک کو قبول نہ کرے، اسے جکڑ بند کر کے بھیج دو، اس مکتوب میں اس نے تحریر کیا:

"جو شخص اس کا اقرار نہ کرے کہ قرآن مخلوق ہے تو ایسے تمام لوگوں کو جکڑ بند کر کے امیرالمومنین کے لشکر میں بھیج دو، پھر اگر وہ اپنے مسلک سے رجوع نہ کریں، اور تائب نہ ہوں تو سب کی گردن تلوار سے اڑا دی جائے گی، ـــ ان شاء اللہ، ولا قوۃ الا باللہ۔"

مردانِ راہِ حق! آپ نے ملاحظہ فرما لیا، مامون کے طرز عمل میں کیسی درجہ بدرجہ تبدیلی ہوئی ہے! پہلے معاملہ صرف جاہ و منصب سے محرومی تک محدود تھا، پھر بڑھتے بڑھتے قتل و ہلاکت تک پہنچ گیا۔

اسحٰق بن ابراہیم نے، مامون کی مرضی کو عملی جامہ پہنانے میں امکانی سرعت سے کام لیا۔ اس نے محدثین، فقہاء، اور مفتیوں کو اپنی بارگاہ میں طلب کیا، انہی میں امام احمد بن حنبل بھی تھے۔

اسحٰق نے ان لوگوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے وہ بات نہ مانی جس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، وہ نہ کہا جس کی فرمائش کی جا رہی ہے، بغیر کسی تردد اور تامل کے مامون کے فرمان پر سر تسلیم خم نہ کر دیا، تو ان کو لرزہ خیز سزا اور ہلاکت آفریں اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اس دھمکی سے مرعوب و متاثر ہو کر تقریباً سب نے وہ کہہ دیا جو ان سے چاہا جا رہا تھا، اور انہوں نے اس مسلک کی پیروی کا اعلان کر دیا، لیکن چار آدمی ایسے تھے جن کے قلوب کو خدا نے مضبوط کر دیا، جو حکم الٰہی پر مطمئن رہے، جنہوں نے باقی کو فانی پر ترجیح دی، جنہوں نے اپنے اعتقاد سے بال برابر بھی ہٹنا گوارا نہ کیا۔ انہوں نے جرأت اور اصرار کے ساتھ اپنے موقف کو پیش کیا، یہ چار نفوس قدسیہ حسب ذیل تھے۔

(۱) احمد بن حنبل

(۲) محمد بن نوح

(۳) القواریری

(۴) سجادہ

ان لوگوں کو اسحاق کے حکم سے رسیوں میں جکڑ لیا گیا، بیڑیوں سے کس دیا گیا، انہوں نے رات اس حالت میں گزاری کہ مشکیں کسی ہوئی تھیں، پھر جب صبح ہوئی تو سختیوں اور شدائد کی تاب نہ لا کر سجادہ نے امتحان کی بات مان لی، چنانچہ ان کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں اور انہیں رہا کر دیا گیا، باقی اصحاب ثلثہ بدستور مبتلائے آفات و مصائب رہے۔

دوسرے روز یہی سوال پھر دوہرایا گیا اور حسب مرضی جواب طلب کیا گیا، اس مرتبہ قواریری کی ہمت نے جواب دے دیا اور انہوں نے وہ بات مان لی جس کا مطالبہ کیا جا رہا تھا، چنانچہ انہیں بھی رہا کر دیا گیا۔ اب دو آدمی باقی رہ گئے۔ ان دونوں کو بیڑیوں میں جکڑ کر طرطوس بھیجا گیا تاکہ مامون کی خدمت میں پیش کیے جائیں، ابن نوح راستہ ہی میں شہید ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے، تغمدہ اللہ برحمتہ۔

جن لوگوں نے مامون کے مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا، ان کو اسحاق نے کہا کہ وہ بھی طرطوس جا کر مامون کی خدمت میں حاضری دیں۔

مامون کی وصیت

یہ لوگ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ مامون کی خبر وفات پہنچی، لیکن اس نے دنیا چھوڑنے سے پہلے اپنے بھائی معتصم کو یہ وصیت کی کہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک پر وہ قائم رہے، اور اس مسلک کے قبول کرنے کی لوگوں کو دعوت پوری قوت و شوکت کے ساتھ دے، گویا یہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی تھی کہ یہی مسلک واجب الاتباع ہے، جب تک وہ اپنے جانشین کو اس کی وصیت نہ کر دے، وہ اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہو سکتا، چنانچہ اس نے وصیت کر دی۔

وصیت کے شروع ہی میں وہ کہتا ہے:-

" یہ وہ وصیت ہے جس کا اعلان عبداللہ بن ہارون الرشید امیر المومنین نے حاضرین مجلس کی موجودگی میں کیا ہے، وہ ان سب کو گواہ بنا کر اس کی شہادت دیتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ایک ہے، نہ اس کا کوئی شریک حکومت ہے، نہ اس کے سوا کوئی اور مدبر حکومت ہے۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ مخلوق ہے، قرآن بھی مخلوق ہونے سے مستثنیٰ نہیں کیونکہ وہ بھی دوسری چیزوں کی طرح ایک ایسی ہی چیز ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا کی مثل کوئی چیز نہیں!"

اس وصیت کے وسط میں یہ الفاظ ہیں:

اے ابو اسحاق! مجھ سے قریب ہو جا، جو کچھ تو دیکھ رہا ہے اس سے نصیحت حاصل کر کے خلق قرآن کے بارے میں اپنے بھائی کی سیرت اختیار کر!"

معتصم باللہ کا دور حکومت

اس نصیحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مامون کی وفات کے بعد وہ ابتلا ختم نہیں ہوا، بلکہ اس کے شکنجہ میں کچھ اور زیادہ وسعت پیدا ہو گئی، آفات و مصائب میں کچھ اور اضافہ ہو گیا، زاہدوں، عالموں، فقیہوں اور محدثین میں سے جو لوگ اب تک اس مسلک کے ماننے میں توقف کر رہے تھے، ان پر بلاؤں کا نزول شروع ہو گیا۔ اس گروہ کے سربراہ امام احمد بن حنبل تھے۔ معتصم کے عہد میں اور اس کے بعد پھر واثق کے دور میں ابتلا اور مصیبت کی شدت اور بڑھ گئی۔

قبل اس کے کہ ہم یہ داستان درد بیان کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مراسلات نقل کر دیں جو مامون اور اس کے نائب (جو بغداد میں تھا) کے مابین جاری ہوئے، ان مراسلات میں اس قول کی دلیل بھی ہے، جس کی وہ لوگوں کو دعوت دیا کرتا تھا، اور وہ جواب بھی ہے جو امام احمد نے دیا تھا، پھر مامون کی تہدید بھی ہے۔ یہ مراسلات "تاریخ طبری" سے ماخوذ ہیں۔

مامون کا پہلا فرمان

بغداد کے نائب حاکم اسحاق بن ابراہیم کے نام

مامون الرشید نے بغداد کے نائب حاکم اسحاق بن ابراہیم کو اس سلسلہ میں جو پہلا فرمان بھیجا تھا، وہ حسب ذیل ہے:۔

امابعد:

مسلمانوں کے ائمہ اور خلفا پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ اس دین کی اقامت میں جسے اللہ نے ان کی حفاظت میں دیا ہے، اور ان مواریث نبوت کے قیام میں جن کا اللہ نے ان کو وارث بنایا ہے، اور اس علم کے اظہار میں جو خدا نے انہیں ودیعت کیا ہے، اور اپنی رعایا میں حق و صداقت کے ساتھ عمل کرنے اور اسے خدا کی اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے کوشش سے کام لیں۔ امیرالمؤمنین خدائے بزرگ و برتر سے اپنے فرائض کی بجا آوری اور انجام دہی میں اس کی رحمت اور توفیق اور عزم صمیم کے طلبگار ہیں۔

امیرالمؤمنین کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ رعیت کا ایک بہت بڑا گروہ جو فکر و نظر، اور دانش و بینش سے محروم ہے جس کے پاس نہ استدلال ہے نہ ہدایت، نہ علم کا نور، نہ برہان، اور جمیع اقطار و آفاق مملکت میں ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو اہل جہالت ہیں، کور چشم ہیں، حقیقت دین اور توحید و ایمان سے ناواقف ہیں۔ خدا کی کھلی ہوئی نشانیوں سے بے خبر اور اس کے واضح راستے سے لاعلم ہیں۔ وہ اللہ کا اس کی قدر کے مطابق اندازہ کرنے سے اور اس کی کنہ معرفت سے قاصر ہیں۔

فرق نہیں کرسکتے، اسی وجہ سے انہوں نے اللہ اور اس کے نازل کیے ہوئے قرآن کو برابر کا سمجھ لیا ہے، ان لوگوں نے اس بات پر اتفاق کرکے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن قدیم ہے، اول ہے نہ اللہ نے اسے پیدا کیا ہے، نہ اس کی اختراع کی ہے، نہ اسے عالم وجود میں لایا ہے، حالانکہ اللہ عزوجل اپنی اس کتاب میں جو دل کے روگ کی شفا اور مؤمنین کے لیے رحمت اور راہ ہدایت ہے، فرماتا ہے:

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا پس جس چیز کو اللہ نے بنایا ہے، اسے گویا پیدا بھی کیا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ» (۶:۱)

پھر ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ۔ (۲۰: ۹۹)

اس آیت کریمہ میں خود اللہ نے یہ خبر دے دی کہ قرآن میں ایسے واقعات اور قصص بیان کیے گئے ہیں جو قرآن سے پہلے کے ہیں، اور قرآن ان کے بعد نازل ہوا ہے۔ پھر وہ فرماتا ہے:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ۔ (۱۱: ۱)

اور جو شے محکم اور مفصل ہوتی ہے کوئی اسے استحکام بخشنے والا، اور تفصیل کرنے والا بھی ہوتا ہے، چنانچہ اپنی کتاب کو محکم کرنے والا اور اس کی تفصیل بیان کرنے والا خود خدا ہے، لہٰذا وہ اس کا خالق اور پیدا کرنے والا بھی ہوا۔ علاوہ ازیں ان لوگوں نے باطل کو اپنا شعار قرار دے کر لوگوں کو اپنے مسلک کی دعوت دی، اور اپنے آپ کو تبع سنت ثابت کرنے کی کوشش کی، حالانکہ قرآن کریم کی ہر فصل میں ایسے قصے ہیں جو ان کے قول کو باطل کرنے والے اور ان کے دعوے کی تکذیب کرنے والے ہیں!

اس کے باوجود یہ لوگ ظاہر یہ کرتے ہیں کہ صرف یہی اہل حق ہیں، دیندار ہیں اور صاحب جماعت ہیں، اور ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ باطل پرست ہیں، کافر ہیں، فرقہ پسند ہیں، ایک عرصہ دراز تک یہ لوگوں کو اس طرح دھوکا دیتے رہے، یہاں تک کہ جہلا ان کے فریب میں آگئے، اور وہ لوگ بھی جو اہل کذب و دروغ ہیں، غیر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے اور دین الٰہی کے سوا دوسرے

گروہ میں ان کا اعزاز و وقار بڑھ جائے گا، اور ریاست و عدالت پر ان کا اثر قائم ہو جائے گا، یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے باطل کی خاطر حق کو چھوڑ دیا، خدا سے کنارہ کش ہو کر گمراہی کے گڑھے میں جا پڑے، ان کے ظاہری تزکیہ اور تورع کی وجہ سے ان کی شہادت کو لوگوں نے مان لیا اور ان کے ذریعہ سے احکام الہٰی نافذ ہونے لگے، حالانکہ نہ ان کا ایمان درست ہے، نہ نسب ٹھیک ہے، نہ دیانت قابلِ اعتماد ہے، ان کی نیت فاسد ہے، ان کا یقین مجروح ہے، ان کا مقصد و منشا اور غرض و غایت صرف یہ ہے کہ فریب کاری سے فتنہ و فساد برپا کر دیا جائے، انہوں نے اپنے رب پر افترا پردازی کی ہے، حالانکہ قرآن کریم میں ان سے عہد واثق لیا گیا ہے کہ اللہ کے معاملہ میں صرف حق پر قائم رہیں گے، لیکن انہوں نے اس تعلیم کو مٹا دیا، انہی کے لیے اللہ تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَ	یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، پھر ان کو بہرا کر دیا اور ان کی بصارت
أَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ	چھین لی، یہ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے، کیا
أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ؛ (۴۷ : ۲۳)	ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؛

امیر المومنین نے محسوس کیا کہ یہ لوگ امت کے لیے مضر اور ضلالت کی جڑ ہیں۔ انہوں نے توحید اور ایمان میں قطع و برید کر دی ہے، یہ جاہل اور جھوٹے ہیں، شیطان ان کی زبان سے بول رہا ہے۔ ان کی صداقت و شہادت متروک اور مردود ہونے کے قابل ہے، ان کے کسی قول و عمل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ عمل یقین کے بعد ہے، اور یقین اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک حقیقت اسلام سے پوری واقفیت نہ ہو، اور خلوص کے ساتھ توحید پر عقیدہ نہ ہو، اور جو ان حقائق سے اندھا ہے وہ اپنے عمل اور شہادت میں اور زیادہ اندھا اور گمراہ ہو گا جو خدا پر اور اس کی وحی پر جھوٹ بولے جو خدا کو اور اس کی حقیقت کو نہ پہچانتا ہو، ضروری ہے کہ اس کی شہادت رد کر دی جائے، کیونکہ یہ وہ ہے جس نے اللہ کی گواہی اس کی کتاب پر رد کر دی ——!

لہٰذا تم اپنے قاضیوں کو بلاؤ، اور انہیں ہمارا یہ خط سناؤ، ان کے عقائد کا امتحان لو، اور دریافت کرو آیا وہ قرآن کو اللہ کی مخلوق سمجھتے ہیں یا نہیں؛ اور انہیں یہ بتا دو کہ جس شخص کا ایمان اور توحید کے بارے میں اعتقاد پکا اور سچا نہ ہو گا، امیر المومنین آئندہ اس سے کوئی سرکاری خدمت نہیں لیں گے، پس اگر وہ خلق قرآن کو تسلیم کریں، اور امیر المومنین کے مسلک سے اتفاق کریں تو وہ

ہدایت اور نجات کے راستے پر گامزن ہیں، پھر تم انہیں حکم دینا کہ وہ سب کے سامنے اپنے مسلک کو بیان کریں۔ اور جو اس مسلک کو قبول نہ کرے اس کی شہادت ترک کر دی جائے ——!

اس کے علاوہ تم اپنے علاقہ کے تمام قاضیوں سے اس مسئلہ کے بارے میں استفسار کرو، اور ان کو ہمارا حکم پہنچاؤ، اور ان کی نگرانی کرتے رہو تاکہ جب تک وہ اپنے دین و ایمان میں پکے اور سچے نہ ثابت ہو جائیں احکام الہٰی کو نافذ نہ کرنے پائیں اور امیر المومنین کے اس فرمان کا جو اثر مترتب ہو اس سے اطلاع دینا"!

یہ خط ماہ ربیع الاول ۲۱۸ھ میں تحریر کیا گیا۔"!

مامون کا دوسرا خط

بغداد کے نائب حاکم اسحٰق بن ابراہیم کے نام

مامون الرشید نے بغداد کے نائب حاکم اسحٰق بن ابراہیم کو لکھا کہ وہ حسب ذیل سات آدمیوں کو اس کی خدمت میں روانہ کر دے۔

۱۔ محمد بن سعد، کاتب الواقدی[1]
۲۔ ابو مسلم مستملی یزید بن ہارون
۳۔ یحییٰ بن معین
۴۔ زہیر بن حرب ابو خیثمہ
۵۔ اسمٰعیل بن داؤد
۶۔ اسمٰعیل بن ابی مسعود — اور
۷۔ احمد بن الدورقی۔

اسحٰق نے ان لوگوں کو مامون کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ مامون نے ان کے عقائد کا امتحان لیا، اور مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ ان سب نے اعتراف کر لیا[2] کہ قرآن کریم مخلوق ہے۔ اس اعتراف کے بعد مامون نے انہیں مدینۃ السلام (بغداد) واپس بھیج دیا۔ اب اسحٰق بن ابراہیم نے انہیں

[1] مصنف نے صرف محمد بن سعد کاتب الواقدی کا نام سات ناموں کا ذکر کر کے لکھا ہے۔ میں نے تاریخ طبری سے لے کر بقیہ نام بھی درج کر دیئے ہیں تا کہ پوری فہرست سامنے آ جائے۔ (رئیس احمد جعفری)

[2] البدایہ (۲۷۳ ج ۱۰) میں ابن کثیرؒ نے لکھا ہے: (اظھروا موافقتہ وھم کارھون) ان لوگوں نے بکراہت موافقت کا اظہار کیا تھا ...

اپنے دارالامارۃ میں طلب کیا۔ یہ جو کچھ بغداد میں اعتراف کر آئے تھے اس کو شہرت دی اور اس کا ذکر فقہا اور محدثین کے سامنے کیا۔ ان ساتوں اصحاب نے جو کچھ مامون کے سامنے کہا تھا، وہی یہاں بھی دُہرا دیا، یعنی قرآن مخلوق ہے۔ اسحٰق نے ان لوگوں کو آزاد کر دیا۔ اسحٰق نے یہ سب کچھ مامون کے حکم کے مطابق کیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد مامون نے اسحٰق بن ابراہیم کو ایک اور خط لکھا، جو ذیل میں درج ہے[1]،

اما بعد!

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اس زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے اور جنہیں اپنے بندوں کے لیے اس نے اپنا امین چُنا ہے، ان کا کام یہ ہے کہ اس کے دین کو قائم کریں، اور جن لوگوں کو اس نے اپنی مخلوق کی نگرانی تفویض کی ہے انہیں اپنے احکام اور قوانین کے نفاذ، اور مخلوق الٰہی میں اپنے عدل کو بروئے کار لانے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

ان لوگوں پر (یعنی خلفا پر) خدا کا حق یہ ہے کہ وہ پوری طرح اس کا حق ادا کریں، اور اپنے فرائض کے ادا کرنے میں اس سے خلوص برتیں اور اس علم و معرفت کی وجہ سے جو خدا نے انہیں عطا کیا ہے لوگوں کو راہ حق پر گامزن کریں جو راہ حق سے بھٹک جائے، یا بچھڑ جائے اسے پھر راہ راست دکھائیں، اپنی رعایا کی راہ نجات کی طرف رہنمائی کریں، اسے ایمان کے حدود اور اصول سمجھائیں، اور وہ راستہ بتائیں جس پر چل کر وہ کامرانی کی منزل تک پہنچ جائے، اور جہالت سے محفوظ رہے دین کے جو امور مشتبہ اور پنہاں ہوں انہیں صاف اور واضح کر دیں تا کہ شک دور ہو اور دلیل کی روشنی سب کے لیے نمایاں ہو جائے۔

یہ کام خلفا کو خود انجام دینا چاہیے، کیونکہ یہ خدمت تمام خدمات کی جامع ہے، اس میں رعایا کے دینی اور دنیاوی فوائد شامل ہیں، خلفا کو چاہیے کہ اپنی رعایا کو وہ امور یاد دلاتے رہیں جن کے بارے میں اللہ نے انہیں منصب خلافت دیتے وقت بجا آوری کی توقع فرمائی ہے کہ وہ

[1] اس خط پر حافظ ابن کثیرؒ کا تبصرہ یہ ہے: ثم کتب المامون الی اسحٰق ایضا بکتاب ثان یستدل بہ علی القول بخلق القرآن بشبہ من الدلائل ایضا لا تحقیق تحتہا، لا حاصل لہا بل ھی من المتشابہ

اپنے پیش روؤں کی طرح بدستور اس خدمت کو انجام دیتے رہیں گے، چنانچہ اس باب میں امیر المومنین صرف خدائے واحد سے توفیق کے طلبگار ہیں، وہی ان کے لیے کافی اور وافی ہے۔

قرآن کے بارے میں جو عقیدہ پیدا ہوا ہے اس پر کافی غور و فکر، اور تلاش و مطالعہ کے بعد امیر المومنین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے جس کا اثر دین اسلام اور ملت اسلامیہ پر نہایت مضر پڑے گا، کیونکہ خدا نے قرآن کو ہمارا امام بنایا ہے اور ہمارے لیے رسول اکرمؐ کا بھی اثر باقی ہے، لوگوں پر حقیقت امر مشتبہ ہو گئی، چنانچہ وہ خیال کرنے لگے کہ قرآن غیر مخلوق ہے یعنی انہوں نے اسی طرح انہوں نے خدا کی صفت خلق سے بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ اسی صفت کی وجہ سے وہ اپنی تمام مخلوقات کے مقابلہ میں نمایاں طور پر علیحدہ اور منفرد ہے، کیونکہ اس نے صرف اپنی حکمت اور قدرت کاملہ سے کام لے کر بغیر کسی ابتدا اور تقدم کے ہر چیز کو خلق فرمایا، اور ایجاد کیا۔

خدا کے سوا ہر چیز مخلوق اور حادث ہے، خالق اور موجد تو صرف ذات باری تعالیٰ ہے[1] خود قرآن اس حقیقت پر ناطق اور دال ہے، اس باب میں جتنے بھی اختلافات ہو سکتے تھے، قرآن نے ان سب کو مٹا دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو قدیم ماننے والوں نے عیسائیوں کی تقلید کی ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ بن مریم چونکہ کلمۃ اللہ ہیں اس لیے مخلوق نہیں ہیں۔ حالانکہ اس کے برخلاف قرآن کریم کہتا ہے[2]:- اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا یعنی ہم نے قرآن کو بنایا۔

[1] اس مغالطے کا جواب بھی معقول و مدلل طریقے سے امام احمدؒ نے کتاب الرد علی الجھمیہ میں دے دیا ہے۔ (حنیف ندوی)

[2] بشر بن غیاث اور احمد بن ابی دؤاد وغیرہ اساطین معتزلہ قرآن حکیم کے مخلوق ہونے کے دلائل اسی قسم کے دیتے تھے جنہیں مامون نے اپنے ان خطوں میں ذکر کیا ہے۔ ان سب کے جواب حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الرد علی الجھمیہ میں بڑی تفصیل سے دیئے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان و مصر میں طبع ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کے جواب میں حضرت امامؒ نے جو ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "جعل" قرآن مجید میں کئی معنوں میں آتا ہے۔ اگر جعل الظلمات و النور میں خلق کے معنی میں ہے، تو الذین جعلوا القرآن عضین میں تسمیہ کے معنی میں بھی ہے، اور یجعلون اصابعھم فی آذانھم میں فعل جعل مراد ہے، اور پھر رب اجعل ھذا بلدا آمنا قسم کی آیات میں جعل یعنی خلق کسی صورت ہو ہی نہیں سکتے، بنا بریں

"بنایا" کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے خلق کیا، پیدا کیا، جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے:
وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۙ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۔ (۷۸-۱۱) یعنی ہم نے رات کو راحت و آسائش کے لیے اور دن کو معاش کے لیے بنایا۔

ظاہر ہے، یہاں بھی "بنایا" کا مطلب یہی ہے کہ پیدا کیا۔ اسی طرح قرآن مجید میں آیا ہے:
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۔ (۲۱-۳۰) یعنی ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی بخشی۔

یہاں بھی "جعلنا" کے معنی "خلقنا" ہی ہو سکتے ہیں۔ ان آیات کی رو سے خدا نے قرآن کو بھی مخلوقیت کے اعتبار سے ان چیزوں کے مساوی قرار دے دیا ہے جن کے بارے میں پیدائش، صنعت اور خلق قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ تنہا (بلا شرکت غیرے) ان چیزوں کا خالق ہے۔

اسی طرح خدائے بزرگ و برتر فرماتا ہے:
بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۔ (۸۵-۲۲)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوح قرآن کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور ظاہر ہے کہ محاط مخلوق ہوتا ہے، (پس قرآن بھی مخلوق ہوا)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اپنے نبیؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:
لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ (۷۵-۱۶)

پھر فرماتا ہے:-
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۔ (۷-۳۷)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جن کا قول تھا،
مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ ۔ (۶-۹۲)

اور پھر اپنے رسول ہی کے ذریعے ان کے اس قول کی تکذیب کرائی، اور اپنے رسولؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-
قُلْ مَنْ أَنزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا (۶-۹۲) یعنی تم پوچھو کہ کتاب موسیٰ لائے تھے وہ کس نے نازل کی تھی (؟)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ نے قرآن کو "ذکر" "ایمان" "نور" "ہدیٰ" "مبارک" "عربیا" اور "قصصا" سے تعبیر فرمایا ہے

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ۔ (۱۲-۳)

پھر فرمایا:

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ (۱۷-۸۸)

پھر ارشاد ہوا:

قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ ! (۱۱-۱۳)

نیز فرمایا:

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (۴۱-۴۲)

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے لیے اوّل بھی رکھا ہے اور آخر بھی، اس کے اوّل اور آخر کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ محدود اور مخلوق ہے۔ ان جاہلوں نے قرآن کے متعلق اپنے غلط عقیدہ کا اظہار کرکے اپنے دین اور امانت میں بہت بڑا رخنہ ڈال دیا ہے اور اس طرح دشمنانِ اسلام کے راستہ کو سہل بنا دیا ہے۔ اپنے الحاد اور بے دینی کا اعتراف کر لیا ہے کہ اللہ کی ایک مخلوق شے کو اس صفت سے موصوف کرنے لگے جو صرف خدا ہی کے لیے خاص ہے۔ انہوں نے قرآن کو خدا سے تشبیہ دی، حالانکہ مخلوقات ہی آپس میں ایک دوسری سے مشابہ ہو سکتی ہیں۔

جو لوگ قرآن کو قدیم مانتے ہیں امیرالمؤمنین کا ان کے بارے میں خیال ہے کہ نہ وہ دین میں کچھ درک رکھتے ہیں، نہ یقین و ایمان کی نعمت انہیں حاصل ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے امیرالمؤمنین یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ اب ان کی امانت، عدالت، یا قول و حکایت پر اعتماد کیا جائے۔ یہ لوگ اب اس قابل نہیں رہے کہ حکومت رعایا کے امور میں انہیں کوئی ذمہ داری سونپے، اگرچہ ان میں سے بعض لوگ نیک اور درست اطوار کے ہیں مگر فروع سے کیا ہوتا ہے؟ اصل چیز تو عقائد ہیں۔ مدح و ذم کا انحصار عقائد کی بھلائی اور برائی پر ہوتا ہے، جو شخص ایمان کے اصل اصول یعنی توحید سے پورے طور پر واقف نہ ہو وہ دوسرے احکام اور اصول سے بدرجہ اولیٰ ناواقف اور جاہل ہوگا، ایسا شخص کسی کو راہ ہدایت کیا

امیرالمؤمنین نے تمہیں جو کچھ لکھا ہے، یہ تم جعفر بن عیسیٰ، اور عبدالرحمٰن بن اسحاق کو سنا دو اور ان سے دریافت کرو کہ قرآن کے بارے میں وہ کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ اور یہ بات خوب اچھی طرح انہیں جتا دو کہ امیرالمؤمنین اس شخص سے کوئی خدمت نہیں لے سکتے، نہ اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں جو اخلاص و توحید کی نعمت سے بہرہ ور نہ ہو، اور توحید کا عقیدہ اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتا جب تک قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کیا جائے۔

پس اگر یہ دونوں امیرالمؤمنین کے ارشاد کو تسلیم کر لیں، تو انہیں حکم دو کہ فصل خصومات کے وقت جب لوگ اپنے دعاوی کے ثبوت میں شہادتیں پیش کریں تو ان سے خلق قرآن کے بارے میں دریافت کریں، جو یہ نہ مانتا ہو کہ قرآن مخلوق ہے اس کی شہادت باطل قرار دیں، اور اس کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے وہ دونوں کوئی فیصلہ ہرگز صادر نہ کریں، اگرچہ وہ بظاہر کتنا ہی نیک، پارسا اور متقی ہی کیوں نہ ہو۔

تمہارے ماتحت علاقہ میں جتنے قاضی ہیں ان سب کو یہ حکم پہنچا دو، اور امیرالمؤمنین کو اپنے اقدام و عمل کے نتائج سے مطلع کرو!

یہ دونوں فرمان ہیں جن سے ایک دورِ ابتلا کی ابتدا ہوتی ہے، اس کا آغاز اسحٰق بن ابراہیم نے پہلا فرمان موصول ہونے کے بعد کیا۔ اور اس کا اتمام دوسرے فرمان کے موصول ہونے کے بعد ہوا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم یہ بتائیں کہ مامون کے اس حکم کا ردِ عمل کیا ہوا؟ اور اسے اس کا کیا جواب ملا؟ پھر مامون کی تعلیق۔ یا دوسرے لفظوں میں احمد بن ابی دؤاد۔ کی اس جواب پر حاشیہ آرائی کا ذکر کرکے ہم اس مادی ابتلا کا ذکر کرینگے، جس سے اہلِ حق و صداقت دوچار ہوئے۔

مامون کے حسب الحکم اسحٰق بن ابراہیم نے فقہا، حکام، اور محدثین کی ایک جماعت کو طلب کیا، تاکہ ان کے عقیدہ کا امتحان لے، چنانچہ ابوحسان زیادی، بشر بن الولید الکندی، علی بن ابی مقاتل، فضل بن غانم، ذیال بن الہیثم، سجادہ، قواریری، احمد بن حنبل، قتیبہ، سعدویہ الواسطی، علی بن الجعد، اسحٰق بن ابی اسرائیل، ابن الهرش، ابن علیۃ الاکبر، یحییٰ بن عبدالرحمٰن العمری، نیز حضرت عمرؓ بن الخطاب کی اولاد سے ایک اور بزرگ

ابن الفرخان، اور ایک اور جماعت جس میں نضر بن شمیل، ابن علی بن عاصم، ابوالعوام البزاز، ابن شجاع، اور عبدالرحمن بن اسحٰق وغیرہ شامل تھے، یہ سب لوگ سب الحکم اسحٰق کے دربار میں حاضر ہوئے۔

اسحٰق نے ان حضرات کے امتحان کا آغاز اس طرح کیا کہ مامون کا فرمان دو مرتبہ پڑھ کر سنایا، تاکہ یہ لوگ اس کے مفہوم و معنیٰ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ پھر اس نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

(اس گفتگو کو ہم مکالمات کی صورت میں درج کرتے ہیں)

اسحٰق بن ابراہیم نے بشر بن الولید سے پوچھا:

"قرآن کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

بشر بن الولید نے جواب دیا،

"میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنا خیال امیرالمومنین کے سامنے ظاہر کر دیا ہے!"

اسحٰق بن ابراہیم۔ لیکن امیرالمومنین کے فرمان کے بعد یہ مبحث از سرِ نو زیرِ بحث آگیا ہے، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔

بشر بن الولید۔ میں کہتا ہوں قرآن خدا کا کلام ہے۔

اسحٰق بن ابراہیم۔ میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا تھا۔ یہ بتاؤ وہ مخلوق ہے یا نہیں؟

بشر بن الولید۔ خدا ہر چیز کا خالق ہے۔

اسحٰق بن ابراہیم۔ کیا قرآن "چیز" ہے؟

بشر بن الولید۔ ہاں، وہ ایک شئے ہے۔

اسحٰق بن ابراہیم۔ کیا وہ مخلوق بھی ہے؟

بشر بن الولید۔ وہ خالق نہیں ہے،

اسحٰق بن ابراہیم۔ میں یہ نہیں پوچھتا، یہ بتاؤ، یہاں مخلوق بھی ہے؟

بشر بن الولید۔ جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے، اس پر اضافہ نہیں کر سکتا، میں نے امیرالمومنین کے سامنے

---

[1] معتزلہ "اللہ خالق کل شیئ" سے بھی قرآن کے مخلوق ہونے پر استدلال کرتے تھے، حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ ص ۳۴۳ ج ۱۰ میں امام احمدؒ کا جواب نقل کیا [illegible]

عہد کیا ہے کہ اس مسئلہ پر کسی طرح کی گفتگو نہیں کروں گا، اور جو کچھ میں کہہ چکا اس کے علاوہ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

یہ سن کر اسحٰق بن ابراہیم نے ایک رقعہ اُٹھایا، جو اُس کے سامنے رکھا ہُوا تھا۔ رقعہ سنانے کے بعد اس نے بشر سے دریافت کیا۔

"کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ واحد اور یکتا ہے، نہ اس سے پہلے کوئی چیز تھی، نہ اس کے بعد کچھ ہے۔ اس کی مخلوقات میں سے کوئی شے کسی درجہ میں بھی، اور کسی طرح بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتی؟"

بشر نے جواب دیا

"ہاں، میں اس سے اتفاق کرتا ہوں، اور میں تو ان لوگوں کو پٹیا کرتا تھا جن کا عقیدہ اس عقیدہ سے مختلف ہوتا تھا۔"

اسحٰق نے منشی سے کہا "جو کچھ بشر نے کہا ہے، اسے لکھ لو۔"

اب اسحٰق علی بن ابی مقاتل کی طرف متوجہ ہُوا، اور پوچھا۔

"خلقِ قرآن کے بارے میں علی، تمہاری کیا رائے ہے؟"

علی بن ابی مقاتل نے کہا،

"ایک سے زائد مرتبہ میں امیرالمومنین کو اپنے خیال سے آگاہ کر چکا ہوں۔ جو کچھ وہ مجھ سے سن چکے ہیں وہی رائے میری اب بھی ہے۔"

پھر اسحٰق نے رقعہ کے بارے میں ابن ابی مقاتل کا امتحان لیا، اسے سنا کر پوچھا۔

"کیا اس سے تمہیں اتفاق ہے؟"

ابن ابی مقاتل نے کہا

"ہاں، میں اس سے متفق ہوں۔"

اسحٰق بن ابراہیم۔ تو یہ بات مانتے ہو کہ قرآن مخلوق ہے؟

ابن ابی مقاتل۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔

ابن ابی مقاتل۔ قرآن خدا کا کلام ہے، اور اگر امیرالمومنین ہمیں کوئی حکم دیں گے تو ہم اسے سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے۔

اسحٰق نے منشی سے کہا۔

"ابن ابی مقاتل نے جو کچھ کہا ہے اسے نوٹ کر لو۔"

اب اسحٰق نے ذیال سے بھی یہی سوال کیا، اور انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو علی بن ابی مقاتل نے دیا تھا۔

پھر اس نے ابو احسان الزیادی سے دریافت کیا۔

"کہو تمہاری کیا رائے ہے؟"

زیادی نے کہا،

"جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پوچھو۔"

اب اسحٰق نے مامون کا وہی رقعہ پڑھ کر سنایا اور پوچھا۔

"کیا تم اس سے اتفاق رکھتے ہو؟"

زیادی نے اقرار کر لیا، اور اس کے بعد یہ بھی کہا:

"جو اس عقیدہ کو نہیں مانتا میرے نزدیک وہ کافر ہے!"

اسحٰق نے کہا

"تم مانتے ہو کہ قرآن مخلوق ہے؟"

زیادی نے جواب دیا،

"قرآن کلامِ الٰہی ہے، خدا ہر شے کا خالق ہے، اس کے سوا ہر چیز مخلوق ہے۔ امیرالمومنین مامون ہمارے امام ہیں، انہی کے ذریعے سے ہم نے ہر طرح کا علم پایا ہے، وہ جو کچھ سن چکے ہیں وہ ہم نے نہیں سنا۔ وہ جو کچھ جانتے ہیں ہم نہیں جانتے۔ اللہ نے ہماری باگ ان کے ہاتھ میں دے دی ہے، وہ حج اور نمازیں ہماری امامت کرتے ہیں، انہی کی خدمت میں ہم اپنے اموال کی زکوٰۃ پیش کرتے ہیں، انہی کے ساتھ ہم جہاد کے معرکوں میں شریک ہوتے ہیں، ہم ان کی امامت کو برحق سمجھتے ہیں، وہ ہمیں جو حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے، وہ ہمیں جس کام سے منع کریں گے، ہم اس سے باز آ جائیں گے، وہ جب ہمیں بلائیں گے ہم لبیک کہتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔"

اسحٰق نے یہ باتیں سن کر مزید سوال کیا:

"یہ تو ٹھیک ہے، مگر یہ بتاؤ قرآن مخلوق بھی ہے؟"

اس کے جواب میں ابوحسان الزیادی نے پھر وہی باتیں دوہرادیں جو اگلی کہی تھیں۔

اسحٰق نے کہا،

"لیکن امیرالمؤمنین کا تو اس باب میں یہ ارشاد ہے، اس ارشاد کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

زیادی نے کہا،

"ہاں، امیرالمؤمنین کا یہ عقیدہ ہوگا، لیکن انہوں نے لوگوں کو یہ حکم تو نہیں دیا ہے کہ وہ بھی اس عقیدہ کو مان لیں، اور نہ انہوں نے اس عقیدہ کی عام دعوت دی ہے، اور اگر تم مجھے یہ کہو کہ امیرالمؤمنین نے تمہیں حکم دیا ہے کہ میں بھی خلق قرآن کا عقیدہ اختیار کر لوں، تو اگر تم مجھے ایسا حکم دوگے تو میں اس کے مطابق اپنے عقیدہ کا اظہار کر دوں گا، میں تم پر پورا بھروسہ رکھتا ہوں کہ تم وہی کہوگے جس کا امیرالمؤمنین نے تمہیں حکم دیا ہے، لہٰذا اگر تم کوئی ایسا حکم مجھ تک پہنچاتے تو میں ضرور اس کی تعمیل کرتا۔"

اسحٰق نے کہا

"بلاشبہ مجھے اس طرح کا کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے کہ میں کوئی بات اس رقعہ کے سوا ان کی طرف سے تم سے کہوں۔"

علی بن ابی مقاتل نے کہا،

"امیرالمؤمنین مامون کا قول، خلق قرآن کے بارے میں ویسا ہی ہے جیسا فرائض اور وراثت کے معاملہ میں صحابۂ کرام کا اختلاف، لیکن انہوں نے دوسرے کسی شخص کو اپنے اقوال منوانے پر کبھی مجبور نہیں کیا۔"

ابوحسان نے کہا،

میرے پاس سمع وطاعت کے سوا کچھ نہیں ہے، میں تو بندۂ فرمان ہوں، جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کروں گا

اسحٰق نے اس کے جواب میں کہا،

"امیرالمؤمنین نے مجھے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی میں آپ حضرات سے تعمیل کراؤں، انہوں نے مجھے صرف یہ حکم دیا تھا کہ میں آپ صاحبان کا امتحان لوں، سو وہ فرض میں نے ادا کر دیا۔"

"قرآن کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

امام احمد نے جواب دیا،

"قرآن کلامِ الٰہی ہے۔"

اسحٰق بن ابراہیم۔ کیا وہ مخلوق ہے؟

امام احمد: "وہ کلامِ الٰہی ہے، اور میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کو تیار نہیں ہوں۔"

پھر اسحٰق نے امام احمد کو وہ رقعہ سنایا جو دوسروں کو سنا چکا تھا، اور اس کی تائید چاہی، جب وہ اس مقام پر پہنچا "لایشبہہ شیٔ فی خلقہ فی معنی من المعانی ولا وجہ من الوجوہ" (یعنی خدا کی مخلوق میں سے کوئی چیز کسی حیثیت سے، اور کسی طرح بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتی)، تو اس پر امام احمد نے فرمایا:

"میں کہتا ہوں "لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" (خدا کی طرح کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع وبصیر ہے)۔"

تو ابن البکاء الاصغر نے اس پر معترض ہوتے ہوئے کہا:

"خدا تمہاری اصلاح کرے، یہ احمد کہتے ہیں کہ خدا کان سے سنتا اور آنکھ سے دیکھتا ہے۔"

اسحٰق نے امام احمد سے دریافت کیا۔

"خدا کے قول سمیع اور بصیر کے کیا معنی ہیں؟"

امام احمد نے جواب دیا،

"اس نے اپنا وصف جیسا بیان کیا ہے وہ ویسا ہی ہے۔"

اسحٰق نے پوچھا،

اس کے معنی کیا ہوئے؟

امام صاحب نے جواب دیا،

"میں نہیں جانتا، بس وہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے اپنا وصف بیان کیا۔"

پھر اسحٰق نے سب کو فرداً فرداً بلایا اور یہی سوال کیا۔ سب نے جواب میں کہا،

"قرآن کلامِ الٰہی ہے۔" سوا حسبِ ذیل حضرات کے:

منفقرین مرجا، اور ایک شخص جو نابینا اور ضعیف تھا، نہ فقیہ تھا، نہ کچھ جانتا تھا، لیکن گھس بیٹھ کر کسی طرح اس مجلس میں پہنچ گیا تھا، اور ایک دوسرا شخص رقہ کا قاضی جو عمر بن الخطاب کی اولاد میں سے تھا، اور ابن الاحمر۔

ابن البکاء الاکبر نے اسحٰق کے سوال کے جواب میں کہا،

"قرآن "مجعول" ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ا ناجعلناہ قرآناً عربیاً۔ اور قرآن محدث بھی ہے، کیونکہ خدا خود کہتا ہے: مَا یَأْتِیْهِمْ مِنْ ذِکْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ"(۲۲۱)

اسحٰق نے پوچھا،

"کیا مجعول مخلوق ہے؟"

ابن البکاء الاکبر نے کہا

"ہاں، ہے!"

اسحٰق نے پھر کہا،

"پھر تو قرآن مخلوق ہوا؟"

انہوں نے جواب دیا،

"میں مخلوق تو نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ کہتا ہوں کہ وہ مجعول (بنایا ہوا) ہے!

اسحٰق نے یہ بیان لکھ لیا۔

ان حضرات کے امتحان سے جب اسحٰق فارغ ہوگیا اور ان کے بیانات اس نے نوٹ کر لیے، تو ابن البکاء الاصغر نے اعتراض کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں قاضیوں کو جو امام ہیں یہ حکم دیں کہ اپنے خیالات ظاہر کریں، تاکہ ان کے خیالات کی دوسروں سے ہم حکایت کر سکیں۔

اسحٰق نے جواب دیا۔

"اگر ان دونوں حضرات کی خدمت میں کبھی تم بطور گواہ کے پیش ہوگئے، تو خود ہی جان لوگے ان کے خیالات کیا ہیں؟"

اس کے بعد اسحٰق نے جملہ حاضرین کے فرداً فرداً خیالات وعقائد قلمبند کیے، اور مامون کی خدمت میں ارسال کر دیئے۔ نو دن تک یہ حضرات اسحٰق کے پاس مقیم رہے، تاکہ مامون کے پاس سے ان خیالات کو پیش نظر

مامون کا تیسرا خط

نو دن کے بعد اسحٰق نے ان سب حضرات کو دوبارہ طلب کیا، کیونکہ اب اس کے خط کا جواب مامون کے پاس سے آچکا تھا۔

مامون کا وہ مکتوب حسب ذیل ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اما بعد،

امیر المؤمنین کو تمہارا خط ان کے اس مکتوب کے جواب میں موصول ہوا جس میں انہوں نے قرآن کے بارے میں ایک بناوٹی اور غلط عقیدہ رکھنے والے لوگوں کا امتحان لینے اور ان کے حالات وکیفیات بیان کرنے کا انہوں نے تمہیں حکم دیا تھا۔

اس خط سے معلوم ہوا کہ تم نے امیر المؤمنین کا مکتوب موصول ہونے کے بعد جعفر بن عیسیٰ اور عبد الرحمٰن بن اسحٰق کی موجودگی میں مدینۃ السلام (بغداد) کے فقیہوں، محدثوں اور مفتیوں کو سنایا، اور پھر ان سے قرآن کے بارے میں ان کا عقیدہ دریافت کیا، اور یہ معلوم کیا کہ کون اس بات کا قائل ہے کہ کوئی چیز بھی کسی طرح خدا سے مشابہت نہیں رکھتی، اور یہ کہ قرآن کے بارے میں ان کے خیالات میں کس درجہ اختلافات ہیں؟ یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل نہیں ہے، اسے تم نے علانیہ طور پر درس حدیث اور فتویٰ دینے سے منع کر دیا ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ تم نے دونوں قاضیوں کی طرح سندی اور عباس مولیٰ امیر المؤمنین کو سب لیا ہے

کر دیا کریں کہ خلقِ قرآن کے سلسلہ میں ان کا عقیدہ کیا ہے؟ علاوہ ازیں یہ کہ تم نے اپنے علاقے کے تمام قاضیوں کو طلب کیا ہے تاکہ امیر المومنین کے حسب ارشاد تم ان کا بھی امتحان لو۔

خط کے آخر میں تم نے ان تمام لوگوں کے نام لکھ دیئے ہیں، جو حاضر تھے اور ان کے خیالات بھی قلمبند کر دیئے ہیں۔ امیر المومنین تمہارے خط کے مفہوم سے پورے طور پر واقف ہوئے۔ اس تمام کارروائی پر وہ خدائے کریم کا شکر بجا لاتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنی رحمت اپنے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائے۔ امیر المومنین خدائے قادر و توانا سے مستدعی ہیں کہ اپنی طاعت کی انہیں توفیق دے، اور اپنی رحمت سے نیت کی سلامتی کے ساتھ ان کی مدد کرے۔

اپنے خط میں تم نے جن لوگوں سے قرآن کے بارے میں سوال و جواب کی کیفیت لکھی ہے، امیر المومنین نے اس پر غور کیا، اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ بشر بن الولید نے نفی تشبیہ میں جو کچھ کہا، اور جس طرح قرآن کے مخلوق ہونے کے بارے میں خاموش رہا، اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ اس کے بارے میں امیر المومنین کے سامنے عہد کر چکا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ بشر نے غلط بیانی سے کام لیا، جھوٹ بولا، اور ناقابلِ تسلیم بات کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے اور امیر المومنین کے مابین اس سلسلہ میں نہ کوئی گفتگو ہوئی، نہ معاہدہ، نہ مناظرہ، اس کے برعکس بارہا امیر المومنین کے سامنے دعوائے اخلاص کے ساتھ اس نے اپنے اعتقاد کو بیان کیا ہے، اور اعتراف کیا ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔ لہٰذا تم اسے بلاؤ، اور جو کچھ امیر المومنین نے لکھا ہے اسے بتاؤ، اور قرآن کے بارے میں صاف صاف اس کے خیالات معلوم کرو، اور اس سے کہو کہ توبہ کرے، کیونکہ امیر المومنین کا یہ خیال ہے کہ جو شخص قرآن کے بارے میں ایسے خیالات رکھتا ہے وہ کفر صریح اور شرک محض کا ارتکاب کرتا ہے، پس اگر وہ ان خیالات سے توبہ کرے تو تم اس کا اعلان کر دینا اور اگر وہ اپنے شرک پر اصرار، اور قرآن کے مخلوق ہونے سے انکار کرے تو اس کفر و الحاد کی پاداش میں اس کی گردن اڑا دینا اور امیر المومنین کی خدمت میں اس کا سر بھیج دینا۔

اسی طرح ابراہیم بن مہدی کے ساتھ کرنا، بشر کی طرح ان کا بھی امتحان لو، کیونکہ وہ بھی

پس اگر وہ اقرار کرے کہ قرآن مخلوق ہے، تو اس کے اس عقیدہ کو بھی مشتہر کر دو، اور اسے رہا کر دو بصورت دیگر اس کی گردن بھی مار دو، اور امیر المومنین کی خدمت میں اس کا کٹا ہوا سر بھیج دو۔

رہا علی بن ابی مقاتل، تو اس سے پوچھنا کیا تو نے امیر المومنین سے یہ بات نہیں کہی کہ تو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیتا ہے؟ اور کیا اس نے قرآن کے بارے میں اپنا وہی عقیدہ نہیں بیان کیا، جو امیر المومنین نے اپنا بیان فرمایا تھا؟

اور ذیال بن ہیثم سے کہنا کہ تو وہ ہے جو انبار میں کھانا چرایا کرتا تھا، اور امیر المومنین ابو العباس نے جو خدمت اسے سونپی تھی کیا وہ مشغلہ اس کے لیے کافی نہیں ہے؟ اور اگر تھی وہ آثار سلف کی پیروی کرنے والا ہوتا تو کبھی ایمان کے بعد شرک کے راستہ پر نہ چلا پڑتا، اور احمد بن یزید المعروف بہ ابی العوام نے قرآن کے بارے میں جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس جاہل کو بتا دینا کہ وہ عقل و دانش کے اعتبار سے ایک طفل کم سواد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ قرآن کے بارے میں اس نے جواب نہیں دیا، لیکن جب وہ تادیب و تعزیر سے دوچار ہوگا تو جواب دیگا، بہرحال اگر وہ حسب مراد جواب نہ دے تو پھر تلوار سے کام لو۔

اور ہاں احمد بن حنبل کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا، امیر المومنین نے اسے پڑھا، اور تم بتا دو کہ امیر المومنین اس کے مفہوم و منشاء سے پورے طور پر واقف ہیں، اس مسئلہ میں وہ اس کے جاہلانہ عقیدے سے مطلع ہوئے، اس کا خمیازہ بہرحال اسے اٹھانا پڑے گا۔

اور فضل بن غانم کو بتا دو کہ ایک سال سے کم کی مدت میں مصر سے اس نے جو روپیہ ناجائز طور پر کمایا، کیا اس کے باعث وہ امیر المومنین سے خائف نہیں ہے جو اب مزید جرم کا ارتکاب کر رہا ہے؟ حالانکہ اس حرکت پر مطلب بن عبد اللہ سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا جس شخص کے کردار کی پستی کا یہ عالم ہو، اور جو درہم و دینار کا ایسا لالچی ہو اس سے ہرگز یہ بات مستبعد نہیں ہے کہ وہ اپنا ایمان بھی سیم و زر، اور نفع عاجل کی خاطر بیچ ڈالے، علاوہ ازیں اس نے علی بن ہشام کے سامنے اپنا وہ عقیدہ بیان کیا تھا وہ اس سے قطعاً مختلف تھا جس کا اظہار اب وہ کر رہا ہے، لہٰذا اس سے دریافت کرو کہ اس انقلاب خیال میں کیا بات ہے؟

علم میں سب سے پہلے اختلاف کیا گیا۔ ظاہر ہے وہ بھی اپنے باپ ہی کے نقشِ قدم پر چلے گا جو جھوٹا مدعیِ نسب تھا۔ اسی لیے ابوحسان نے زیادی یا کسی شخص کا مولیٰ بننے سے انکار کر دیا کسی شخص نے بھی اس کا مولیٰ بننا گوارا نہیں کیا۔ (بیان کیا جاتا ہے کہ ایک خاص وجہ سے زیادی کی طرف منسوب کیا گیا تھا)

اور جو شخص ابونصر التمار کے نام سے مشہور ہے اس سے کہہ دو کہ امیرالمومنین کی نگاہ میں جیسی پست اس کی تجارت ہے، ویسی ہی ذلیل اس کی عقل ہے۔

اور فضل بن الفرخان سے کہہ دینا کہ قرآن کے بارے میں یہ عقیدہ اس لیے تو نے اختیار کیا ہے کہ تو ان امانتوں کو ہضم کر لینا چاہتا ہے جو عبدالرحمٰن بن اسحٰق وغیرہ نے تیری سپردگی میں دی تھیں اور اس امر کا خواہش مند ہے کہ یہ امانت رکھانے والے کسی طرح ختم ہوں تو تمام مال و منال پر قبضہ کر لے۔ مگر چونکہ وہ بہت سن رسیدہ اور بوڑھا ہے اس لیے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی، البتہ عبدالرحمٰن بن اسحٰق سے کہنا کہ خدا تجھے جزائے خیر سے محروم رکھے کہ تو نے ایسے شخص کو تقویت پہنچائی، اور ایسے شخص کے پاس اپنی امانت رکھوائی جو شرک کا معتقد اور توحید سے برگشتہ ہے۔

اور محمد بن حاتم، اور ابن نوح، اور ابومعمر سے کہو کہ یہ سود خوار لوگ بھلا توحید کو کیا سمجھ سکتے ہیں؟ اور امیرالمومنین بھلا ان لوگوں کے خلاف جہاد کو کیسے جائز نہ قرار دیں، جب کہ کتاب الٰہی (قرآن) میں ان جیسوں کے لیے جہاد کا حکم وارد ہوا ہے۔ اور یہ تو دوہرے مجرم ہیں کہ انہوں نے سود خواری کے ساتھ ساتھ شرک کو بھی اپنا شعار بنا لیا ہے، اور اس طرح اب وہ مثل نصاریٰ کے ہو گئے

اور احمد بن شجاع سے کہہ دینا کہ کل کی بات ہے جب علی بن ہشام کے مال میں سے ناجائز طور پر تو نے بھی ابوہمر کے ساتھ حصہ بٹایا تھا، لہٰذا معلوم ہوا تیرا دین و مذہب صرف دینار و درہم ہیں!

سعدویہ الواسطی سے کہنا کہ خدا اس شخص کو غارت کرے جو ایک طرف تو حدیثِ نبوی کی زیب و زینت میں لگا رہتا ہے اور اس کا ہمیشہ رہتا ہے کہ اس فن میں سیادت کا درجہ حاصل کرے

رویہ پر بھی قائم رہتا ہے۔

اور وہ شخص جو سجادہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے اپنے معاصر حضرات اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ سے کبھی یہ نہیں سنا کہ قرآن مخلوق ہے، کہہ دو کہ کھجوروں کی گٹھلیاں شمار کرنے، اپنے لبادے کی درستگی کرنے، اور علی بن یحییٰ وغیرہ کی امانتوں میں تغلب کرنے میں وہ اس قدر مشغول ہے کہ اس نے توحید کو فراموش کر دیا۔ اس سے دریافت کرو کہ اگر تو یوسف بن ابی یوسف اور محمد بن الحسن کی صحبت میں واقعی شریک رہا ہے تو کیوں نہیں بتاتا کہ خلقِ قرآن کے بارے میں ان لوگوں کا خیال کیا تھا۔؟

اور قواریری وہ شخص ہے کہ جب اس کے احوال کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا یہ رشوت لیتا رہا ہے۔ یہ ایسے امور کا مرتکب رہا ہے جن سے اس کی بے ایمانی، بد اخلاقی اور سخافتِ عقل و دین پورے طور پر ہویدا اور ظاہر ہے۔ امیرالمومنین کے سمعِ مبارک میں یہ بات بھی پہنچی ہے کہ وہ جعفر بن عیسیٰ الحسنی کے معاملات کا وکیل اور مختار ہے۔ پس تم جعفر بن عیسیٰ سے کہہ دو کہ اس سے الگ تھلگ رہے۔ اس پر بھروسہ نہ کرے، اور نہ اسے اپنا امین بنائے۔

اور یحییٰ بن عبدالرحمٰن العمری اگر واقعی حضرت عمرؓ بن الخطاب کی اولاد میں سے ہے تو اس کا جواب معروف و معلوم ہے۔

اور محمد بن حسن بن علی بن عاصم، سو اگر وہ اپنے اسلاف کرام کے نقشِ قدم پر، پیروی کیے ہوتے تو ہرگز وہ مسلک نہ اختیار کرتے جس کے بارے میں ان کی شہرت ہو رہی ہے، اور پھر وہ ابھی نوعمر ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے

امیرالمومنین تمہارے پاس ابومسہر کو روانہ کرتے ہیں، انہوں نے قرآن کے بارے میں اس کا امتحان لیا، پہلے تو اس نے جواب دینے سے گریز کیا اور ٹال مٹول کی کوشش کی، مگر جب امیرالمومنین نے اس کی گردن قلم کرنے کے لیے تلوار طلب کی تو اس نے گڑگڑا کر خلقِ قرآن کا اقرار کر لیا، پس اگر وہ اس عقیدے پر قائم ہو تو اس کے عقیدے کو شہرت دو۔!

جن لوگوں کے نام تم نے اپنے مکتوب بنام امیرالمومنین میں تحریر کیے ہیں، یا جن کے

نہ آئیں، اور قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کریں تو بشر بن الولید، اور ابراہیم بن المہدی کے علاوہ سب کو طوق و سلاسل میں اسیر کر کے سرکاری محافظوں کے ساتھ امیر المؤمنین کی خدمت میں روانہ کر دو یہاں تک کہ وہ لوگ عسکر امیر المؤمنین میں پہنچ جائیں اور ان لوگوں کی تحویل میں آجائیں جو اس کام پر مامور کیے گئے ہوں تاکہ امیر المؤمنین بہ نفس نفیس ان کا امتحان لیں اور اگر وہ اپنے عقیدہ سے رجوع نہ کریں اور تائب نہ ہوں تو ان سب کی گردنیں تلوار سے اڑا دیں ان شاء اللہ ولا قوۃ الا باللہ!

امیر المؤمنین یہ فرمان دوسرے سرکاری کاغذات کے جمع ہونے کا انتظار کیے بغیر بطور خاص غرض الٰہی سمجھ کر اور اس کے تقرب کی تمنا میں تم کو روانہ کرتے ہیں، اور تمہیں ہدایت کرتے ہیں کہ اس کا نفاذ فوراً کر دینا، اور اس کا جواب بھی اسی طرح بطور خاص امیر المؤمنین کی خدمت میں ارسال کر دینا تاکہ وہ جان لیں کہ تم نے اس سلسلہ میں کیا کیا!

یہ خط ۲۱۸ھ میں لکھا گیا۔

یہ ہیں مامون کے خطوط!

امام احمد کا مقام رفیع

مامون نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا، ابتلاء و آزمائش، امتحان و ایذاء، اہانت اور تشدد کے جو دور گزرے، ہم چاہتے ہیں کہ . . . .

. . . . علماء کی اہانت و ذلت، ان کا پابجولاں ہو کر سجن و زنداں کے مصائب میں گرفتار ہونا، فولاد و آہن کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا جانا، ان میں جو ضعیف جسم کے تھے وہ ان کڑیوں کی تاب نہ لا سکے اور راہ حق و صداقت میں مرتبۂ شہادت پر فائز ہو کر عروس مرگ سے ہمکنار ہوئے۔ لیکن ایک حضرت امام باقی رہ گئے۔ اس لیے کہ ان کے جسم میں قوت تھی، ان کے نفس میں عزیمت تھی، ان کے قلب میں ایمان تھا، صبر و برداشت کی تاب و تواں تھی۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ مامون نے ایذا رسانی جاری رکھنے کی وصیت بھی کر دی!

بلاشبہ تاریخ نے امام احمد کے ساتھ ان کے شایان شان برتاؤ کیا، انہیں ابدال کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ بلکہ ان کے بعض عقیدت مندوں نے تو یہاں تک غلو کیا کہ انہیں تقدیس کے درجہ پر فائز کر دیا، چنانچہ بعض

... امام احمد اگر بنی اسرائیل میں ہوتے تو مرتبۂ نبوت پر سرفراز ہوتے!

کیا واقعی یہ خطوط مامون نے لکھے تھے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مامون نے کیوں ایسی دشوار گھاٹی پر چڑھنے کی کوشش کی؟ ہم چاہتے ہیں کہ اس پر کچھ روشنی ڈالیں کہ اس کے اسباب کیا تھے، ممکن ہے اسی ذرہ میں اس کے لیے کچھ عذر پیدا ہو سکے۔

مامون کے اس طرز عمل کے محرکات کچھ ڈھکے چھپے نہیں، انہیں ہم کھول کر بیان کر چکے ہیں۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ یہ کام تاریخ نے بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ مامون کے جو مکاتیب ہم نے نقل کیے ہیں ان کا طرز و اسلوب، اور انداز بیان خود ہی بتا رہا ہے کہ اس کے اس طرز عمل کا محرک کیا تھا؟ کیوں اس معاملہ میں وہ حد سے بڑھا اور ایذا رسانی پر اتر آیا؟

مامون نے احمد بن ابی دؤاد معتزلی کو اپنا وزیر ہی نہیں بنایا بلکہ خاص مشیر بھی، اپنی مملکت کا اسے ایک صاحب اقتدار و اختیار شخص بنا دیا۔ مامون کی نظر میں اس کی منزلت کا یہ عالم تھا کہ اس نے بھائی کو وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد وہ احمد بن ابی دؤاد کو اس کی جگہ خیال کرے، اسے اپنے پاس سے دور نہ کرے۔

یہ مکاتیب جو مامون کی طرف سے لکھے گئے، ان کی زبان احمد بن ابی دؤاد کی زبان ہے۔ اس میں بیکار طول بیانی سے کام لیا گیا ہے، اور خلفاء کا یہ دستور نہیں تھا کہ وہ اگر کبھی کچھ لکھیں تو ایسا طولانی خط لکھنے بیٹھ جائیں۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان خطوں میں ہمیشہ خلیفہ کا ذکر غائب کے صیغہ میں ہے۔ ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ خلیفہ نے متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہو۔ ان خطوں میں فتووں پر طعن، حسود کا ذکر، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ملیں گی جو مامون جیسے شخص سے مستبعد ہیں، پھر کیا یہ رائے نہیں قائم کی جا سکتی کہ جب یہ خطوط لکھے گئے تو مامون بستر علالت پر دراز تھا۔ اس کے فکر و خیال پر ضعف و انحطاط طاری تھا، اور یہ کارروائیاں اس کے نام سے ہوتی رہیں، کیونکہ اگر وہ صحت مند ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس کے نام سے ایسے خطوط بھیجے جا سکتے جن میں اس طرح کے طنز ہوتے، اور دوسروں کے عیوب کی یوں پردہ دری کی گئی ہوتی۔ کیونکہ اس طرح کی باتیں ان لوگوں سے سرزد نہیں ہو سکتیں جو مامون کی پوزیشن کے ہوں۔ نہ وہ اپنے مرتبہ بلند سے اتنا نیچے اتر سکتے ہیں کہ وہ اس طرح کی باتیں لکھنے پر اتر آئیں جیسی ان خطوں میں لکھی گئی ہیں۔

طرح کی رکیک باتیں ہرگز نہ ہوتیں، لہٰذا ہمارا خیال یہ ہے کہ ان خطوط کی ترسیل کا سرے سے اسے علم ہی نہیں تھا، اور اگر اسے ان خطوط کا علم بھی تھا، یا وہ ان کے مضمون سے واقف بھی تھا، تو وہ ضعف و علالت کی حالت تھی، اس میں اتنی قدرت نہیں تھی کہ وہ ان امور کی چشم داشت کر سکتا، چنانچہ ان خطوط کی ترسیل کے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

پس منظر

گزشتہ صفحات میں یہ بات ہم معلوم کر چکے ہیں کہ مامون مسند خلافت پر جب بیٹھا، بلکہ اس سے پیشتر ہی سے وہ عقیدۂ خلق قرآن کا قائل تھا۔ وہ اس مسئلہ پر بحث مباحثے بھی کرتا تھا اور اس مسلک کی لوگوں کو دعوت بھی دیتا تھا۔ لیکن ایسا اس نے کبھی نہیں کیا کہ دلوں کو ٹٹولا اور عقلوں کا امتحان لیا ہو، اور مخالف عقیدہ رکھنے والوں پر بلائیں نازل کی ہوں۔

پھر آخر کیا بات تھی کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس راستہ سے وہ منحرف ہو گیا؟ کیوں اس نے ابتلا اور ایذا رسانی کا کام شروع کر دیا۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ حرکتیں کرنے والا درحقیقت احمد بن ابی دؤاد تھا، جس نے یہ خطوط لکھے، اور ایسی حالت میں لکھے جب مامون زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھا، چنانچہ اس نے اس زبان اور ایسے لب و لہجہ میں یہ خطوط لکھ ڈالے، اور ان میں ابتلا و اختبار کی باتیں لکھ کر اپنی حرص پوری کر لی۔

ابن ابی دؤاد کی ذمہ داری

ایک سمجھدار آدمی کو یہ سوال حیران کر دیتا ہے کہ مامون جب بغداد میں مقیم تھا اور گروہ علماء بھی وہاں موجود تھا، تب اس نے یہ سختیاں کیوں نہیں کیں؟ امتحان و آزمائش کا سلسلہ کیوں نہیں شروع کیا؟ پھر خطوط و فرامین کا سلسلہ اس وقت کیوں شروع ہوا جب وہ بستر مرگ پر دراز تھا؟ درحقیقت یہ حرکت احمد بن ابی دؤاد کی تھی، اس نے مامون کا نام استعمال کیا، حالانکہ مامون کا نہ اس سلسلہ میں کوئی خاص ارادہ تھا، نہ اس میں اتنی طاقت ہی باقی رہ گئی تھی کہ ان امور کو اس طرح انجام دے سکے، جب تک اس کی صحت و تندرستی بحال رہی وہ کئی سال کی طویل مدت میں اگرچہ وہ علماء سے اس مسلک کے بارے میں الجھتا رہا، لیکن اس کا یہ اختلاف امتحان اور ایذا رسانی کے حدود تک نہیں پہنچا، اور یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہی جب تک وہ تندرست رہا، اور بغداد میں مقیم تھا۔ لہٰذا اس فعل شنیع کی تمام تر ذمہ داری صرف احمد بن ابی دؤاد پر عائد ہوتی ہے، یا پھر

مسلک پر عامل تھے جس سے جمہور امت کو کسی طرح کا لگاؤ نہ تھا، بہرحال جب تک مامون تندرست رہا اس نے کوئی حرکت ایسی نہیں کی جو دائرہ اعتدال سے متجاوز ہوتی ہو۔

محاکمہ

جب یہ بات ہے کہ اس دارو گیر کا ذمہ دار احمد بن ابی دؤاد تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا احمد بن ابی دؤاد کا مسلک تمام تر شر پر مبنی تھا، اس میں خیر کا کوئی پہلو نہ تھا؟ اور کیا امام احمد کا موقف ہر اعتبار سے درست تھا، اور اس میں لغزش کا کوئی امکان نہ تھا؟

اس مسئلے کے متعدد پہلو ہیں، اور ہر پہلو کا ایک خاص حکم ہے۔ لیکن جہاں تک تقویٰ، ایمان، عزیمت اور قوت صبر و احتمال کا تعلق ہے، ماننا پڑے گا کہ امام احمد کا شمار تاریخ کے ایسے بڑے قائدین میں ہوتا ہے جو امتحان و ابتلا کی کسوٹی پر پرکھے گئے اور کھرے ثابت ہوئے، جو اپنے عقیدہ پر صبر و استقامت کے ساتھ جمے رہے۔ جنہوں نے دنیا کو دین پر ترجیح نہیں دی، جنہوں نے باقی کے مقابلہ میں فانی کو نہیں اپنایا۔

جہاں تک دین کے معاملہ میں حزم و احتیاط اور مذہب کو فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلی لغویات سے بچائے رکھنے کا تعلق ہے، اس اعتبار سے بھی ہمیں امام احمد کے موقف کی تحسین و تعریف کرنا پڑتی ہے اس لیے کہ وہ جس مسلک پر سختی سے قائم تھے وہ یہ تھا کہ دینی معاملات میں عقلی اور فلسفیانہ طرز پر ایجابی یا سلبی اعتبار سے غور و خوض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں اگر وہ ٹھٹک جاتے تھے، اور کلام پر سکوت کو ترجیح دیتے تھے، ان کی یہ رائے تھی کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس طرح کے مسائل پر غور و تعمق کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ سلف سے اس سلسلہ میں کوئی بات منقول نہیں ہے، اور دینی مسائل کے بارے میں وہ آثار سلف کی سختی کے ساتھ پیروی کرتے تھے۔ وہ انہی چیزوں پر غور کرتے تھے جن پر اسلاف نے دماغ کاوی کی تھی، وہ انہی کے راستہ سے ہدایت حاصل کرتے تھے، اور انہی کی راہ پر گامزن ہوتے تھے۔

لیکن اگر اس قضیہ پر ہم اس حیثیت سے غور کریں کہ قرآن کریم مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ تو جن دلیلوں کی بنا پر احمد بن ابی دؤاد نے مامون کے نام سے مکاتیب اور فرامین لکھے، اور عقل و بداہت کا جہاں تک تعلق ہے، ہم معتزلہ کی صحت نظر اور صحت رائے کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں، کیونکہ قرآن اگرچہ کلام الٰہی ہے لیکن بہرحال مخلوق ہے[1] اور یہ بات خدا کے قدیم ہونے کے باعث اس کی صفت کلام کے قدم کو مانع نہیں ہے۔

---

[1] مصنف کی یہ رائے قرآن، حدیث، اجماع صحابہ و سلف امت کے نصوص و تصریحات کے سراسر خلاف ہے۔

مثلاً یوں سمجھیے کہ خدا نے جو کچھ خلق فرمایا ہے وہ اس کی "قدرت" کا نتیجہ ہے، اور اس کی "قدرت" بہرحال قدیم ہے، اور اس قدرت کے ماتحت اشیاء کی تخلیق، قدم خلق کو لازم نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن کا کلامِ الٰہی ہونا اور اس کے ذریعہ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنا، اور اپنی قدرت سے اسے نازل کرنا اور اس کلام میں اپنا ذکر کرنا، ہرگز اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ قرآن کریم قدیم ہے۔

معتزلہ کا یہ طرزِ عمل انتقامی تھا؟

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ احمد بن ابی دؤاد اور معتزلہ کا مسلک اس باب میں صحیح اور درست تھا تو کیا ہم یہ بھی مان لیں کہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں پر انہوں نے جو بلائیں نازل کیں، انہیں جس طرح امتحان و آزمائش کی اذیتوں سے دوچار کیا، یہ بھی صحیح تھا؟ خاص طور پر ارباب زہد و تقویٰ، اور اصحاب علم و فضل کے ساتھ جو تشدد روا رکھا گیا وہ بھی جائز اور مناسب تھا کہ ان کے قلب و ضمیر کا امتحان لیا جائے اور خواہ مخواہ کی گرفتاریاں کی جائیں؟

معتزلہ کی یہی بیہودگی ہے جس پر امام احمد کے زمانے ہی سے ان پر گرفت کی جاتی رہی ہے، حتیٰ کہ خود معتزلہ بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے دیکھو جاحظ جو خود بھی پکا معتزلی تھا، اور امام احمد کا ہم عصر تھا، وہ بھی مجبور ہو گیا کہ معتزلہ کی طرف سے اس کا دفاع کرے۔ چنانچہ ایک کتاب میں معتزلہ کی اس کفرسازی اور جور و ستم کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے کہتا ہے:

(بقیہ حاشیہ ۱۲۸) کلام کر سکتا ہے، اور وہ حسب مشیت و ارادہ کلام کرتا ہے۔ یہ صفت اس میں ہمیشہ سے ہمیشہ تک ہے۔ یہ صفت اس کے ساتھ قائم ہے، الگ نہیں، بخلاف مخلوق کے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے الگ ہے۔ باقی رہے معتزلہ کے مغالطہ آمیز دلائل سو حضرت امام احمد نے ان کا معقول جواب اس خط میں دے دیا ہے جسے مصنف خود ہی آئندہ نقل کریں گے۔ تعجب ہے، اس خط کے ملاحظے کے باوجود مصنف معتزلہ کے ہم نوا ہو گئے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب خلق افعال العباد، اور صحیح بخاری میں اس مسئلہ کو خوب مدلل فرمایا ہے۔ پھر مزید تفصیل درکار ہو تو امام ابن تیمیہؒ امام ابن قیمؒ کی تصانیف ملاحظہ کے لائق ہیں۔ میری دانست میں مصنف نے یہاں سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ عفا اللہ عنا وعنہ۔ عقیدہ وہی رکھنا ضروری ہے "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق"۔ ہاں اور یہ بھی یاد رہے کہ غیر مخلوق ہونا قدم کو مستلزم نہیں۔ امام احمد اور دوسرے محققین امت سے قرآن حکیم کے متعلق قدیم ہونے کا قول ثابت نہیں جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بہت سے مقامات پر اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ چنانچہ مصنف خود نقل کریں گے۔ (حنیف)

"معلوم ہونا چاہیے، ہم کافر اسی کو قرار دیتے ہیں جس تک ہم اپنی حجت پہنچا چکے ہوں اور امتحان اس کا کرتے ہیں جو متہم ہو۔ ہاں متہم کی پردہ دری تجسس نہیں ہے اور نہ ہی ملزم کی آزمائش اس کی رسوائی۔ کیونکہ اگر ہر انکشاف راز، پردہ دری قرار پائے، اور ہر امتحان تجسس مانا جائے تو قاضی وقت سب سے زیادہ اس جرم کا مرتکب مانا جائے گا کہ وہ لوگوں کے اسرار و عیوب کا پردہ فاش کرتا ہے۔"

لیکن جاحظ کی یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ ان لوگوں نے امتحان و آزمائش کی گرفتاریاں اہل تہمت تک محدود نہیں رکھیں بلکہ انہیں عام کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی اذیتیں اور مصیبتیں اہل علم و فضل پر بھی نازل ہوئیں کیا امام احمد جیسی شخصیت دین میں متہم قرار دی جا سکتی تھی؟ کیونکہ اگر امام احمد جیسے جلیل القدر اصحاب علم و تقویٰ بھی اہل تہمت میں شمار کیے جا سکتے ہیں تو پھر کہاں کا دین اور کیسا تدین؟ لہٰذا جاحظ کی یہ بات اس مقام پر چسپاں نہیں ہوتی۔

جب صورت حال یہ ٹھہری تو جور و ستم اور ایذا رسانی کی حرکتوں کو کیونکر درست قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں۔ لیکن جن لوگوں نے ان افعال کا ارتکاب کیا، ان سے اگرچہ ہمیں اتفاق نہ ہو پھر بھی کیا ہم یہ بات تسلیم کر سکتے ہیں کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا وہ بغیر کسی سبب کے محض اذیت کی خاطر تھا؟

یہ ہے وہ اصل سوال جو دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے، اور بدقسمتی سے اس کا کوئی قاطع جواب دستیاب نہیں ہوتا۔ اور جب سلبی یا ایجابی طور پر کوئی قطعی رائے نہیں قائم ہوتی ہے، تو پھر قیاس آرائی کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہ جاتی۔ البتہ بعض وقعہ ہی امر راجح کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ پس ترجیح کے اسباب ہمارے سامنے ہیں اگر یقین کی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے تو ظن راجح کی دلیل تو بہرحال موجود ہے مامون کے ——— کے بعض خطوط ——— زیادہ صحیح لفظوں میں احمد بن ابی دؤاد میں اس قول کی تردید کرتے ہوئے کہ قرآن قدیم ہے، اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ عیسیٰ بن مریم مخلوق نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ کلمۃ اللہ ہیں۔ یہ قول اس بات کی دلیل ہے کہ مامون اور معتزلہ یہ خیال کرتے تھے کہ اگر قرآن کے قدیم ہونے کا دعویٰ مان لیا جائے

اور لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے تو تعدد قدما لازم آجائے گا، یہاں سے ان کی رائے یہ قرار پائی
کہ تعدد قدما کا دعویٰ مان لیا جائے تو تعدد آلہہ بھی ماننا پڑے گا، اور ظاہر ہے یہ کھلا ہوا شرک ہے
خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ۔ چنانچہ جب نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قدیم مانا تو ان کی پرستش
بھی کرتے ہیں، پس جب معتزلہ نے اور ان کے ساتھ مامون نے یہ دیکھا تو انہوں نے لوگوں کے سامنے
اپنے خیالات پھیلانے شروع کر دیئے، جیسا کہ مکتوب بالا کی تصریح سے ظاہر ہے، وقت کے
بعض فقہاء اور محدثین[1] اور معتزلہ کے اہلِ تقویٰ نے بھی اس امر کو اور جاذب بنا کر پیش کیا کہ وہ خیال
کرنے لگے کہ یہ عقیدہ امت کی گمراہی کا موجب ہوگا، جیسا کہ اس سے پہلے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کی پرستش کر کے گمراہ ہو چکے ہیں۔ اور جب بیان و تقریر سے عوام کو اپنے عقیدہ پر مائل نہ کر سکے تو انہوں نے
"حق" کو قوت اور تشدد کے ذریعہ ٹھونسنا چاہا۔

مذکورہ مکتوبات سے واضح ہوتا ہے کہ معتزلہ کے اس طرزِ عمل میں اخلاص[2] کا شائبہ بہرحال تھا کیونکہ
ان کو عیسائیوں کی تردید سے سابقہ پڑتا رہتا تھا اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو جاحظ معتزلی نے

---

[1] یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ فقہائے محدثین میں سے کوئی معتزلہ کے ہم نوا نہیں تھا، سب کا اجماعی عقیدہ
یہی تھا کہ قرآن حکیم اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں۔ (حنیف ندوی جیانی)

[2] مصنف کا یہ تاثر صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ احمد بن ابی دؤاد اور بشر مریسی جیسے اکابر معتزلی اس فتنہ کے پیدا کرنے
میں مخلص تھے، اور نہ یہی نتیجہ درست ہے کہ واقعۃً وہ عیسائیت کے حملوں کی مدافعت کے لیے ہی "قرآن حکیم کے
مخلوق" ہونے کے قائل ہو گئے تھے، بلکہ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، اس کا پس منظر ان کا انتقامی جذبہ دکھائی
دیتا ہے۔ اس کے لیے مناسب ہے کہ واقعات و حقائق پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اموی دور میں یہ مسئلہ پیدا ہو چکا تھا، اور "کلام الٰہی مخلوق ہے" کے مسئلے کے پہلے سرگرم
مبلغ جعد بن درہم نامی ایک ایرانی نژاد شخص نے جب سر اٹھایا تو اس عقیدے کی پاداش میں ــ محدثین و فقہاء کے
متفقہ فتویٰ سے ــ عراق کے گورنر (۱۰۵ھ تا ۱۲۰ھ) خالد بن عبداللہ قسری المتوفی ۱۲۶ھ نے ہشام
بن عبدالملک کے عہد (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) میں اسے قتل کر دیا۔ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر ص ۳۵۰ ج ۹، خلق افعال العباد
للامام البخاری وغیرہ)

۲۔ اسی طرح جعد کے ایک ایرانی شاگرد جہم بن صفوان زیادہ تر کہ اس عقیدے اور ایسے ہی دوسرے عقائد

اپنے رسالہ "الرد علی النصاریٰ" میں لکھا ہے کہ اسلام پر خدع و فریب کی کمندیں پھینکنے والے عیسائی، فقہاء اور

۔ کی وجہ سے اگرچہ ۱۲۸ھ میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

۳۔ جہم بن صفوان کا ایک مخلص مرید بشر بن غیاث مریسی ان کا جانشین ہوا، اور اس نے ایسے ہی عقائد
کی تبلیغ کی مہم شروع کر دی جن میں سرِ فہرست یہ مسئلہ خلقِ قرآن ہی تھا۔ چنانچہ امام شافعیؒ وغیرہ محدثین و فقہاء سے
اس کے مناظرے بھی ہوئے۔

۴۔ ہارون رشید کو جب بشر کی سرگرمیوں کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا بشر مجھے کہیں مل جائے تو اسے
قتل کر دونگا، یعنی ان لبشراً یقول القرآن مخلوق علی ان اظفرنی اللہ بہ ان اقتلہ (لسان المیزان ص ۳۰ ج ۲،
بلکہ بعض خلفاء عباسیہ کے زمانے میں اسے قید بھی بھگتنی پڑی (لسان المیزان)۔

۵۔ جعد کے زمانے سے ہی علمائے اسلام اجماعاً خلقِ قرآن کے عقیدے کو گمراہی اور بعض صورتوں میں کفر
قرار دیتے تھے، اور بصورتِ عدمِ توبہ اس عقیدے کے حاملین کو اسلام کی نظر میں قابلِ قتل قرار دے دیتے تھے۔
اور جب تصریحِ امام ابن تیمیہؒ (رسالہ حمویہ وغیرہ) و حافظ ابن کثیرؒ (البدایہ)، محدثین و فقہاء یہ سمجھتے تھے کہ عقیدہ
خلقِ قرآن یہودیوں سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ جعد نے یہ مسئلہ یہودیوں ہی سے اخذ کیا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں معتزلہ اور جہمیہ (جو مسلکِ اعتزال کے انتہا پسند طبقے کا عنوان ہے) محصور تھے
وہ تاک میں تھے کہ جوں ہی موقع ملے تو محدثین و فقہاء سے جعد و جہم کے قتل اور بشر کے قید و بند وغیرہ سختیوں کا
بدلہ لیا جائے، مامون کے برسرِ اقتدار آتے ہی انہوں نے اس کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ ان کو محسوس ہوا کہ مامون کے
دربار میں اس کے ایرانی ننہال برامکہ کا عمل دخل ہے (جو خود بھی عربی حکومت کو مختلف طریقوں سے کھوکھلی کرنا چاہتے
تھے) کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے،

آخر بشر وغیرہ کی وجہ سے معتزلہ اپنی ان مساعی میں کامیاب ہوئے، "هو احد من اضل المامون" (البدایہ

ص ۲۸۱ ج ۱۰) یعنی مامون کو گمراہ کرنے میں بشر کا ہاتھ بھی ہے اور خلیفہ مامون کو مذہبی عنوان دیکر پھانس لیا یعنی یہ کہا کہ
قرآن کو کلام الٰہی اور غیر مخلوق ماننے سے عیسائیت کو مدد ملتی ہے ظاہر ہے کہ مامون کو ایسے ہی عنوان سے مغالطہ دیا
جا سکتا تھا۔ ادھر اتفاق یا کسی سازش سے احمد بن ابی دؤاد معتزلی قلمدانِ وزارت پر براجمان ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا بشر و
ابن ابی دؤاد دونوں نے مل کر خوب خوب دل کے ارمان نکالے۔ بشر کے خبثِ باطن کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شاعر بھی اس
مسئلے میں مسلکِ اہلِ حدیث کی تائید کرتا تو اس کو سزا دلوانے کے لیے بھی مامون کو اکساتا تھا (البدایہ والنہایہ ص ۲۸۱ ج ۱۰)

محدثین کے اس قول کو عوام الناس کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک پورا قرآن شریف قدیم ہے تو اس دلیل سے مسیح علیہ السلام بھی قدیم ہوئے، اور یہ دلیل قرآن سے ثابت ہے کہ مسیح علیہ السلام کلمۃ اللہ تھے، اور چونکہ خدا کا ہر کلام قدیم ہے لہٰذا مسیحؑ بھی قدیم ہوئے۔

یہیں سے معتزلہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قدم قرآن کا خیال اس بنا پر کہ وہ کلام الٰہی ہے عیسائیوں کی دسیسہ کاریوں سے جمہور مسلمانوں میں آیا ہے اور تقدیس قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے اس کو قبولیت عامہ حاصل ہو گئی ہے، نیز تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نصاریٰ مسلمانوں کے درمیان بستے تھے اور چونکہ یہ بات ان کو ناگوار تھی کہ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر عیسائی دن بدن مسلمان ہو رہے ہیں۔ بنا بریں پہلے وہ مسلمانوں میں اپنے افکار پھیلاتے، بعدہٗ ان کو ہی دلیل بنا کر عیسائیت سے دفاع کرتے تھے۔

کتاب "تراث الاسلام" میں یوحنا دمشقی کے بارے میں ایک واقعہ ملتا ہے۔ ــــ یہ یوحنا امویوں کے دور حکومت میں تا العہد ہشام بن عبد الملک خدمات جلیلہ پر فائز تھا ــــ کہ وہ عیسائیوں کو ایسی باتیں سکھایا کرتا تھا جس سے وہ مسلمانوں سے مناظرہ کر سکیں۔ مثلاً:

"اگر کوئی عرب تم سے سوال کرے کہ "مسیح کے بارے میں تم کیا رائے رکھتے ہو؟" تو کہہ دینا،

"وہ کلمۃ اللہ ہیں"!

پھر عیسائی کو اس مسلمان سے پوچھنا چاہیے:

قرآن میں مسیح کو کس طرح بیان کیا گیا ہے؟

مسلمان اس معاملہ میں کچھ کہتے ہوئے ہچکچائے گا، تاہم وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ:

انما المسیح عیسی بن مریم رسول اللہ و کلمتہ القاھا الی مریم و روح منہ "مسیح بن مریم

ء۔ ۶۔ یہ درست ہے کہ عیسائی اسلام کے اس عقیدے سے عوام کو ایسے مغالطے ضرور دیتے تھے، لیکن ائمہ سلف اسی وقت اپنی مجالس اور تصانیف میں اس کا دندان شکن جواب دے دیا کرتے تھے، چنانچہ کتاب "الرد علی الجہمیہ" ص۲۹ میں امام احمدؒ اور کتاب "خلق افعال العباد" ص۱۵ طبع دہلی میں امام بخاریؒ نے اس کی تفصیل کی ہے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" میں اس پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ وقول النصاری باطل علی

صرف اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں، ایسا کلمہ جسے اللہ نے مریم کی طرف بذریعہ جبریلؑ ڈالا، اور جو روح ہیں اس کی طرف سے[1]!

جب مسلمان اس طرح کا جواب دے لے، تو اس سے پوچھو،

"اللہ کے کلمہ سے کیا مراد ہے اور اس کی روح کیا ہے؟ آیا وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟

پس اگر وہ یہ کہہ دے کہ مخلوق ہے، تو اس کے قول کا یوں رد کرو کہ نہ اللہ تعالیٰ مخلوق ہے، نہ اس کا کلمہ، نہ اس کی روح، (یہ سب قدیم ہیں)!

جب یہ کہو گے تو وہ عرب لاجواب ہو جائے گا، کیونکہ مسلمانوں میں جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ عام مسلمین کی نظر میں زندیق ہے۔

قرآن کو قدیم کہنے کے نتائج

معتزلہ کی نظروں سے یہ باتیں ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ اس لیے کہ وہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں اور زنادقہ سے بحث و جدل میں مصروف رہتے تھے، وہ جانتے تھے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن قدیم ہے، وہ عیسائیوں کی مدد کرتا، اور اس اقرار سے اس دلیل کو قوی کرتا ہے جس سے کام لے کر وہ مسلمانوں سے مجادلہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ بات نہ کہی جائے، اس لیے کہ یہ بات کہہ کر اسلام کے خلاف دشمن کے ہاتھ میں ایک حربہ دے دیا جاتا ہے، اور یہ بات بجائے خود حق بھی نہیں ہے جو ایسا کہتا ہے وہ مسیح کے بارے میں گویا قول نصاریٰ کی تائید کرتا ہے۔ اور اس طرح تعدد قدما کو مان لیتا ہے[2]۔ اور قرآن کو قدیم کہہ

---

[1] یہ قرآن حکیم کی آیت کا ہے۔ پوری آیت یہاں درج کر دی جاتی ہے جس سے خود بخود اس مغالطہ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی اس آیت سے یہ ہے کہ حضرت مسیح نہ خدا ہیں، نہ خدا کے بیٹے، نہ اس کا اقنوم (حصہ) وہ تو صرف اللہ کے رسول ہیں۔ مریم کے بیٹے۔ امتیاز ان کا صرف یہ ہے کہ بلا باپ صرف کلمۂ کُنْ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس امتیاز سے کلمۃ اللہ ہیں اور بس۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ؎ ۔ ۱۷۱ حنیف ندوی

[2] یہ مغالطہ محض ہیچ ہے۔ قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر جس انداز سے فرمایا ہے، اس سے صاف

کہ اس کو خدائے واحد کے ہمسر بنا دیتا ہے۔

پس جب معتزلہ کا نقطۂ نظر یہ تھا تو ماننا پڑے گا کہ توحید اور اسلام کے نقطۂ نگاہ سے یہ بڑی گہری بات تھی۔ پس یہ ایسا موقف تھا جو ہر اعتبار سے صحیح و راست اور ایمان سلیم کا مقتضی تھا۔ جس طرح امام احمد بن حنبل دین کے معاملہ میں حد درجہ محتاط تھے، اور کسی ایسی چیز پر غور و خوض نہیں کرتے تھے جو سلف صالح کے مسلک کے برخلاف ہو، تو ماننا پڑے گا کہ معتزلہ بھی دین کے معاملہ میں احتیاط ہی کا نقطۂ نظر رکھتے تھے، اور ان تمام دروازوں کو حق کے ساتھ بند کر دینا چاہتے تھے، جہاں سے اسلام پر فریب کی کمندیں پھینکی جا سکتی تھیں، پس اگر وہ اپنے نقطۂ نظر کا پروپیگنڈا کرتے تھے، تو ان کو دین سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لہٰذا اس مسئلہ پر اس حیثیت سے غور کرنا چاہیے کہ وہ اسلام کے ساتھ بھلائی کے ارادہ سے ہی اپنے خیالات کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے موقف اور مسلک کی تائید و حمایت کرے، اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔

حق تشدد کے ذریعہ تھوپا نہیں جا سکتا

یہاں تک ہم نے احمد بن ابی دؤاد اور حضرات معتزلہ کے ساتھ جہاں تک فکر و رائے کا تعلق ہے پورا پورا انصاف کیا ہے، لیکن عملی پہلو کا جہاں تک تعلق ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے حد سے زیادہ غلو اور تشدد سے کام لیا۔ مثال میں صرف اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ انہوں نے وقت کے بہت بڑے پاکباز اور پاک نہاد شخص

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۳) کی صفت نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے قرآن اللہ کا کلام ہے، اس کی صفت ہے، مخلوق کے لوازم سے اسی طرح مبرا ہے جس طرح اس کا موصوف (اللہ تعالیٰ) مبرا ہے۔ حنیف ندوی جیاتی

۱؎ محققین علمائے حدیث و سنت معتزلہ کو اسلام سے خارج قرار نہیں دیتے، ہاں البتہ جہمیہ کو ضرور اسلام سے خارج کہتے ہیں، کیونکہ وہ اگرچہ اعتزال ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہیں تاہم جس قسم کے عقائد کفریہ تک وہ پہنچ گئے ان کو شاید اکثر معتزلہ بھی ناپسند کرتے ہوں لیکن معتزلہ اسلام سے خارج نہ سہی مگر ان کی کج روی و گمراہی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے قرآن و حدیث کے اصول میں شبہات اور ائمہ سلف پر بداعتمادی کا ایسا دروازہ کھول دیا جس کے برے نتائج آج تک امت بھگت رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے نیک نیتی سے بیرونی طور پر اسلام کی جو خدمت کی اندرونی طور پر اسی کے قریب قریب نقصان پہنچا دیا۔ حنیف ندوی جیاتی

امام احمد پر اختلاف رائے کے جرم میں عذاب کے کوڑے برسائے، ایذا رسانی میں اس درجہ انہماک کا اظہار کیا کہ انہیں نذرِ زنداں کر دیا، ان کو سخت سخت تکلیفیں پہنچائیں، اور زیادہ سے زیادہ ناروا تشدد سے کام لیا، یہاں تک کہ لوگ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ صرف رائے کا رائے سے اور ایک نقطۂ نظر کا دوسرے نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں ہے، نہ یہ تنزیہہ الٰہی کے اثبات کا جھگڑا ہے، بلکہ یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے جو اسلام اور مسلمانوں پر ائمہ ہدایت اور دین کے رہنماؤں پر نازل ہو گئی ہے، یہ قلوب و ضمائر کی تفتیش اور نفوس و سرائر کی آزمائش ہے۔ یہ غلط کار اس خیال کے ماتحت کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں درست ہے، اپنی راہ چلتے رہے۔ حالانکہ اس میں خیر کا پہلو یہ تھا کہ یہ رائے قوت اور طاقت کے بل پر منوائی جا رہی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ جو افکار و آرا، تشدد، اور ایذا رسانی کے بل پر پھیلائے جائیں، انہیں آخر کار کامیابی نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ حق مبین ہی کیوں نہ ہوں، چنانچہ جیسے جیسے معتزلہ کی طرف سے تشدد اور ابتلاء و آزمائش کا اظہار ہوتا رہا، ویسے ویسے لوگوں کے دلوں میں ان لوگوں کا جو نشانۂ جور و ستم بنتے رہتے تھے اجلال و احترام بڑھتا رہا۔ وہ ان کی فکر و رائے کی پیروی کرنے لگے، ان کا خیال تھا، کہ معتزلہ جس مسلک کی دعوت دیتے ہیں، اگر وہ خیر ہے تو اس کے راستہ میں سجن و زنداں اور تعزیر و تعذیب، اور جور و ستم کی منزلیں کیوں ہیں؟

معتصم باللہ کا دورِ حکومت

مامون کا انتقال ہو گیا، اس حالت میں کہ امام احمد اس کی طرف کشاں کشاں آہنی بیڑیوں میں جکڑے، ہتھکڑیاں پہنے آ رہے تھے۔ مامون کی موت نے بھی ابتلا اور آزمائش کے اس دور کو ختم نہیں کیا، بلکہ ایک ایسے دور کا آغاز کیا جو پہلے سے بھی زیادہ سفاکانہ، شدید، اور درزہ خیز تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ مامون نے اپنے جانشین بھائی معتصم کو، دو باتوں کی خاص طور پر وصیت کی تھی۔

۱۔ خلق قرآن کی دعوت پر سختی کے ساتھ وہ قائم رہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ احمد بن ابی دؤاد سے ہر حالت میں اپنی وابستگی قائم رکھے۔

اور یہ احمد بن ابی دؤاد ہی تھا جس نے خلق قرآن کا عقیدہ لوگوں پر جبر و تشدد کے ذریعہ تھوپا، انہیں ابتلا اور آزمائش میں ڈالا، ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے۔ انہیں قید و بند کی آماجگاہ بنایا۔ انہیں ہتھکڑیوں سے محصور اور بیڑیوں سے مقید کیا۔

اور معتصم کا حال یہ تھا کہ وہ علم سے کورا اور تلوار کا دھنی تھا، نتیجہ یہ کہ اس نے خلق قرآن کا معاملہ

تمام تر محمد بن ابی دواد کو سونپ دیا کہ وہ مامون کی وصیت نافذ کرنے کے سلسلہ میں جو چاہے کرے۔

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ جب مامون کا انتقال ہوا امام احمد قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہے تھے، اب وہ پھر بغداد کی جیل میں بھیج دیئے گئے۔ یہاں تک کہ ان کے بارے میں نئی صورت حال پیدا ہوئی، اور وہ معتصم کے دربار میں حاضر کیے گئے۔ چنانچہ پہلے تو انہیں دھمکی اور تخویف سے رام کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ عقیدہ قبول کر لیں، لیکن وہ ترغیب اور ترہیب سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے، جب دیکھا کہ یہ راہ ناکام رہی تو پھر دھمکی نے عملی جامہ پہن لیا۔ چنانچہ ان پر کوڑے پڑنے لگے۔ ایک کے بعد ایک، یہاں تک کہ کوڑوں کی ضرب کی تاب نہ لاکر وہ بیہوش ہو جاتے۔ پھر انہیں جگایا جاتا کہ ہوش میں آ جائیں لیکن وہ بے حس و حرکت پڑے رہتے، قید و بند کے ساتھ ساتھ تشدد اور تعذیب کا یہ سلسلہ کم و بیش ڈیڑھ سال تک جاری رہا، جب یہ لوگ مایوس ہو گئے کہ امام احمد ان کی بات نہیں مان سکتے تو ان کے دل میں کچھ شفقت کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ انہیں رہا کر دیا گیا، اور انہیں ان کے گھر میں ایسی حالت میں پہنچایا گیا کہ وہ زخموں سے لہو لہان تھے، اور متواتر مار پیٹ اور جیل کی سختیوں کی وجہ سے ان کا بدن چور چور ہو گیا تھا۔

واثق باللہ کا عجیب حکم

امام احمد اپنے گھر میں آکر اقامت گزیں ہو گئے، جب تک زخموں کی ٹیک جاری رہی وہ درس و تحدیث سے کنارہ کش رہے۔ پھر جب وہ اس قابل ہوئے کہ مسجد تک جانے لگیں، صحت بحال ہو گئی اور جسم کے زخم مندمل ہو گئے۔ ۔۔۔ اگرچہ ان کے آثار و نقوش اب تک درد اور کرب کی صورت میں موجود تھے ۔۔۔ تو وہ پھر مسجد میں مسند درس پر بیٹھ گئے یہاں تک کہ معتصم کا انتقال ہو گیا۔

معتصم کے بعد، واثق مسند آرائے خلافت ہوا، اور اب پھر امتحان و ابتلا کا ایک نیا دور شروع ہوا، اگرچہ یہ عہد معتصم کی طرح کوڑوں کی مار، اور جسمانی ایذا رسانی سے خالی تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا اگر سختی کی گئی تو عوام کی نظر میں امام احمد کی منزلت اور وقعت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی، اور ان کے افکار و خیالات لوگوں کے دلوں میں اور زیادہ جڑ پکڑ جائیں گے اور خلیفہ کی طرف سے خلق قرآن کی جو دعوت دی جاتی ہے اس کی ناکامی میں اور اضافہ ہو جائے گا، اور ان سب پر بالا عوام کا غم و غصہ الگ انتہا کو پہنچ جائے گا۔ جنہیں ابن ابی دواد "حشوات" سے تعبیر کیا کرتا تھا، بس عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ عوام کی

جسمانی ایذا رسانی کا اعادہ نہیں کیا، لیکن انہیں لوگوں میں گھلنے ملنے سے منع کر دیا۔ واثق نے امام احمد کے لیے حکم صادر کر دیا۔

"تمہارے پاس کسی کو آنے اور ملنے جلنے کی اجازت نہیں ہے، اور نہ تم اس شہر میں اقامت اختیار کرو جہاں ہمارا قیام ہو۔"

اس حکم کے بعد امام احمد گھر میں محصور ہو گئے، حتیٰ کہ نماز وغیرہ کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے، یہاں تک کہ واثق کا بھی انتقال ہو گیا۔

واثق کے انتقال کے بعد، امام احمد کی تکلیف اور امتحان و آزمائش کا سلسلہ جو تقریباً پانچ سال تک، یعنی سنہ ۲۳۲ھ تک جاری رہا تھا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ پہلے سے زیادہ عزت و مکرمت کے ساتھ درس و تحدیث کی مسند پر رونق افروز ہوئے، ان کی پیرانہ سالی، تقویٰ، قناعت، زہد، اور آفات و مصائب کی برداشت نے ان کا مرتبہ اور زیادہ بلند کر دیا تھا۔

دوسرے ستم رسیدہ اصحاب علم

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امتحان و ابتلا کے آماجگاہ صرف امام احمد ہی نہ تھے، اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ احمد کو ان سب پر سبقت کا فخر حاصل ہے، یہ مصیبت دوسروں پر بھی نازل ہوئی۔ متعدد شہروں سے فقہا بغداد میں کھینچ بلائے گئے، تاکہ اس مسئلہ میں ان کا امتحان ہو اور انہیں آزمائش میں ڈالا جائے۔ اور ان کے دل کی پوشیدہ باتوں کی کرید کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں میں جن پر یہ مصائب نازل ہوئے، ایک فقیہ مصر امام یوسف بن یحییٰ البویطی تھے، جو امام شافعی کے شاگرد تھے، انہیں حکم دیا گیا کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کریں لیکن انہوں نے انکار کر دیا، چنانچہ انہیں پابجولاں کر کے قید کر لیا گیا، اور حالت قید ہی میں ان کا انتقال ہو گیا، اسی طرح نعیم بن حماد بھی تھے، انہیں بھی اسی الزام میں واثق نے گرفتار کیا تھا اور قید ہی کی حالت میں انہوں نے بھی اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اس معاملہ نے اتنا طول کھینچا کہ لوگ اس سے اکتا گئے اور یہ موضوع ایک مذاق بن کر رہ گیا چنانچہ ایک دفعہ عبادہ نامی ایک مسخرا واثق کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا:

"اے امیر المومنین قرآن کے بارے میں خدا آپ کو بہت بڑا اجر دے۔"

واثق نے کہا:

"بدبخت، قرآن بھی مرنے کی چیز ہے؟

عبادہ نے کہا،

یا امیر المومنین، ہر مخلوق چیز پر موت طاری ہوگی۔ خدا کی قسم قرآن کے مرجانے کے بعد لوگ تراویح کس طرح پڑھیں گے؟

واثق ہنسنے لگا، اور اس نے کہا

"خدا تجھے غارت کرے — چپ!"

دمیری نے اپنی کتاب "حیاۃ الحیوان" میں ایک حکایت درج کی ہے کہ واثق نے اپنی زندگی کے آخری دور میں عقیدۂ خلقِ قرآن سے اختلاف رکھنے والے لوگوں پر سختی اور تشدد کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک شخص اس کی خدمت میں حاضر ہوا، جس پر اس عقیدہ کے سلسلہ میں نزولِ بلا ہو چکا تھا، اس نے ابن ابی دؤاد سے بحث و مجادلہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایک ایسی بات کی جانب جس کی طرف، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی، نہ حضرت ابوبکرؓ نے، نہ حضرت عمرؓ نے، نہ حضرت عثمانؓ نے، نہ حضرت علیؓ نے، آپ لوگوں کو بلاتے ہیں۔ اب دو صورتیں ہیں۔ یا تو یہ حضرات اس عقیدہ سے واقف تھے یا ناواقف۔ اگر آپ یہ کہیں کہ واقف تھے لیکن اس پر سکوت اختیار کیا تو پھر آپ کو بھی سکوت اختیار کرنا چاہیے۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ وہ اس سے ناواقف تھے اور آپ جانتے ہیں تو کیا یہ مان لیا جائے کہ ایک بات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین تو ناواقف تھے، مگر آپ اس سے واقف ہیں؟"

واثق نے جب یہ بات سنی تو اپنی نشست سے اچھل پڑا، اور بار بار یہ الفاظ دہرانے لگا، اس شخص کو معاف کر دیا، اور اب تک جو کچھ کرتا آیا تھا اس سے رجوع کر لیا، جیسا کہ اس کے بیٹے مہتدی باللہ نے روایت کی ہے۔

تقیہ کیوں نہیں کیا؟

یہ ہے تفصیل اس سفاکانہ امتحان کی جس سے امام احمد جیسے متقی، پرہیزگار، اور باخدا آدمی کو دوچار ہونا پڑا، جس نے اس کے اطمینانِ نفس پر چھاپہ مارا۔ اس طرح تقریباً چودہ سال تک، سختی و تشدد، اور ظلم اور جور کا ہدف وہ مرد پارسا بنا رہا،

کہا جاسکتا ہے، کیا اس مردِ متقی کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ اس عقیدہ کے اظہار میں تقیہ سے کام لیتے، جس کا ان سے مطالبہ کیا جا رہا تھا؟ چنانچہ ان کے بعض ہم عصروں نے انہیں رائے دی بھی کہ تقیہ اختیار کریں، یعنی اپنے عقیدہ کے برخلاف اپنے آپ کو ظاہر کریں تاکہ اپنے آپ کو تلف و ہلاکت سے بچا سکیں۔

لیکن امام صاحب نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا، جب کہ بہت سے لوگ اس پر گامزن تھے۔ انہوں نے یہ بات گوارا نہ کی کہ دوسروں کی طرح، اپنے فکری تنزل کا اظہار کریں۔ اور ہم امام احمد کے جلالتِ شان، اور معاملاتِ دینی میں ان کی احتیاط اور خوفِ خدا کا اعتراف کرنے کے باوجود اگرچہ خلقِ قرآن کے معاملہ میں، ان کے ہم رائے نہیں ہیں، پھر بھی ہماری رائے یہ ہے کہ دار الاسلام میں تقیہ درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ دار الاسلام میں امر منکر کا انکار واجب ہے، ورنہ اس کی حقیقت بدل جائے گی۔ اور اس کا نام باقی نہیں رہ جائے گا، اور یہ معلوم ہے کہ استنکار کے کئی درجے ہیں، تقیہ صرف اس وقت جائز ہے جب کسی ملک میں اسلام قوت و شوکت سے محروم ہو، اور مسلمان وہاں سے نکل بھی نہ سکتے ہوں تو ایسی صورت میں یہ جائز ہے کہ آدمی اپنے دین کا اخفا کرے، یہ اجازت آسانی اور سہولت کے لیے عطا کی گئی ہے، جو شخص جیسا حوصلہ اور جیسی ہمت رکھتا ہو ویسے کرے،

اور ایسے ائمہ کے لیے تو تقیہ کسی درجہ میں بھی جائز نہیں ہے، جن کی لوگ پیروی کرتے ہوں، اور جن سے ہدایت حاصل کرتے ہوں، تاکہ ان کے معتقد اور پیرو گمراہ نہ ہوں، کیونکہ اماموں اور ہادیوں نے اگر ایسی باتیں کہیں، جن پر ان کا اعتقاد نہیں ہے، تو عوام تو جانتے نہیں کہ ان کے دل میں کیا ہے۔ وہ ان کی پیروی کرنے لگیں گے، اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ (اگر وہ تقیہ ہی سے ہو) اسے ماننے لگیں گے، وہ خیال کرنے لگیں گے کہ وہی حق ہے جس پر عمل کرکے وہ اپنے آپ کو سنوار سکتے ہیں، اس طرح خرابی عام ہو جائے گی۔ لہٰذا، امام پر لازم ہے کہ وہ امتحان و ابتلا سے دوچار ہو، آفات و مصائب کو لبیک کہے، تاکہ اس کی فکرِ سلیم پھلے پھولے، اور اس کا ابتلا، حق و صداقت کے نشر و ذیوع میں معین و مددگار ہو

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ امام احمد نے راہِ حق میں جو سختیاں جھیلیں، ان کے لیے یہی بہتر اور یہی مناسب تھا۔

امام احمدؒ کی معیشت اور طرزِ بود و ماند

ہم نے امام احمد کی حیاتِ علمی کا جائزہ لے لیا، دیکھ لیا کہ علم اور حدیث کے طلبگار کی حیثیت سے انہوں نے اسلامی ممالک کا گشت لگایا، درس و تحدیث کی مسند پر بیٹھے۔ ایسے امام بنے جس کی لوگ پیروی کرتے، اور جس کے نقشِ قدم پر چلنا موجبِ فخر سمجھتے تھے۔ اُن مصائب و نوائب کا ذکر بھی ہم تفصیل سے کر چکے ہیں۔ جو حصولِ علم کی راہ میں امام صاحب کو برداشت کرنا پڑے۔

لیکن اب تک ہم نے اس مسئلہ پر گفتگو نہیں کی کہ ان کی معیشت و گذران کیسی تھی؟ وہ آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے یا قوتِ لایموت پر زندگی کا انحصار تھا؟ نیز یہ کہ ان کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ معاش کے ذرائع کم تھے یا زیادہ؟ پھر یہ کہ آیا وہ خلفاء کے تحفوں اور ہدیوں کو امام مالک، اور قاضی ابو یوسف اور امام محمد کی طرح قبول کر لیتے اور انہیں پسند کرتے تھے یا امام ابو حنیفہ کی طرح ان سے پرہیز کرتے تھے؟ یا امام شافعی کی طرح اس باب میں میانہ رو تھے؟

یہ ہیں وہ سوالات جن کا ہمیں جواب دینا ہے۔ اب ہم اختصار کے ساتھ ان پر گفتگو کریں گے، چنانچہ سب سے پہلے ہم امام صاحب کے ذریعہ معاش پر گفتگو کریں گے۔ پھر خلفاء کے تحفوں اور ہدیوں کو زیرِ بحث لائیں گے، جن سے انہیں دورِ ابتلاء سے پہلے اور اس کے بعد سابقہ پڑا۔

خودداری اور خود نگری

امام احمد کی زندگی فقر و فاقہ، غربت و فلاکت سے عبارت تھی، انہوں نے کبھی بھی فراغت اور بے فکری کی زندگی بسر نہیں کی۔ وہ بھوک کے ہینے کو ایسی مالداری پر ترجیح دیتے تھے جس میں یہ امتیاز نہ ہو کہ یہ مال حلال خالص ہے یا اس میں کسی حیلے [illegible]

مزدوری کرکے اپنا کام چلائیں، جبکہ جیب خالی ہو اور دور دراز کی منزل سامنے ہو، یہ بات ان پر گراں گزرتی تھی کہ کسی کا عطیہ قبول کریں۔ وہ اپنے جسم کو تکلیف پہنچانا گوارا کر لیتے تھے۔ لیکن اپنے نفس کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔ زندگی بھر وہ اسی طرح دن کاٹتے رہے، انہوں نے اپنے نفس کو آزاد رکھا، اور جسم کی تکلیف برداشت کر لی۔

امام صاحب کی جائداد اور اس کی آمدنی

امام احمد کے والد ماجد نے جو تھوڑی بہت جائداد چھوڑی تھی، اس کے کرایہ پر وہ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ مناقب ابن جوزی میں آیا ہے:

امام احمد کے والد نے کپڑے بننے کا ایک کارخانہ ترکہ میں چھوڑا تھا، اس کے کرایہ پر امام صاحب کی گزر بسر ہوتی تھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ لوگوں سے کرایہ نہیں لیتے تھے معاف کر دیتے تھے، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس کچھ دکانیں تھیں جنہیں انہوں نے کرایہ پر چڑھا دیا تھا، چنانچہ حلیۃ الاولیاء میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"امام احمد کے ہاتھ سے ایک قینچی کنوئیں میں گر پڑی، اتنے میں ان کا ایک کرایہ دار آیا، اسے وہ کنوئیں سے نکالی اور حوالہ کر دی، امام صاحب نے قینچی لے کر اسے لگ بھگ ایک رقم دی، اس نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا کہ قینچی ایک تیر (؟) کے برابر تو ہوگی، اس کا معاوضہ کیا لوں؟ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد امام صاحب نے اس سے دریافت کیا،

"دوکان کا کرایہ کتنے دنوں کا تم پر باقی ہے؟"

اس نے کہا

تین ماہ کا! ——— یہ دوکان تین درہم ماہوار پر اس کے پاس تھی۔ اس نے تین ماہ کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ امام صاحب نے اس کو یہ کرایہ معاف کر دیا ——!

اس قصہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک تو امام صاحب کسی کا بارِ احسان نہیں اٹھاتے تھے۔ اور اگر کسی کے ممنون ہوتے تھے تو دو گنا تگنا معاوضہ کر دیتے تھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دوکانوں کے مالک تھے، جو کرایہ پر اٹھا رکھی تھیں، ان سے اگرچہ فارغ البالی تو نہیں حاصل تھی، لیکن قوتِ لایموت

گزر ہو ہی جاتی تھی، اس بات میں اختلاف ہے کہ ان دو کانوں کا کرایہ کم آتا تھا، یا زیادہ ابن کثیر اس سلسلہ میں بیان ہے کہ :-

"امام احمد کو اپنی جائداد کے کرایہ سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ سترہ درہم ماہوار تھی جسے وہ اپنے اہل وعیال پر صرف کرتے تھے، اور اسی پر قناعت کرتے ہوئے صبر وشکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔"

کوئی شبہ نہیں یہ آمدنی بہت کم تھی، حافظ ابن کثیر کی روایت مقدار آمدنی کے بارے میں صحیح ہو یا نہ، یہ بات بہر حال ثابت ہے کہ ان کی آمدنی اتنی ہی تھی کہ اگر ان میں محنت مشقت کرکے روزی کمانے کا حوصلہ نہ ہوتا اور اگر ان کے پاس صبر وقناعت کی دولت نہ ہوتی تو ضروریات زندگی کا پورا ہونا بھی مشکل تھا، نہیں صرف ایک بات کی حرص تھی کہ ان کی آمدنی کا وسیلہ غیر مشکوک اور حلال ہو، اور یہ آبائی جائداد بھی جو ان کے رزق محدود کا سبب تھی، اس لیے قبول کر لی تھی کہ ان کا خیال تھا کہ اس میں غیر حلال کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ورنہ اگر کوئی شخص اس کا مدعی بن کر سامنے آتا، تو بے تامل وہ اسے سونپ دیتے، چنانچہ مناقب ابن جوزی میں آیا ہے :-

"ایک آدمی نے امام احمد سے اس جائداد کے بارے میں جس کے کرایہ پر ان کا مدار معاش تھا، اور اس مکان کے بارے میں جہاں وہ بود وباش رکھتے تھے، دریافت کیا، انہوں نے جواب دیا، یہ وہ چیز ہے جو مجھے اپنے والد سے ورثہ میں ملی ہے، اگر میرے پاس کوئی شخص آئے، اور ثابت کردے کہ یہ اس کی ہے تو بے تامل میں اسے سونپ دوں گا۔"

امام احمد کے وسائل حیات

یہ بہت تھوڑی سی آمدنی تھی، جس پر وہ صبر وشکر کے ساتھ گزر بسر کرتے تھے، لیکن باایں ہمہ وہ اس پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے کہ دوسروں کے عطیے قبول کریں، یا دوسروں سے امداد لیں، کبھی کبھی تو حالات سخت نازک ہو جاتے تھے، کیونکہ کرایہ کی آمدنی ناکافی تھی، اس سے اہل وعیال کے مصارف پورے نہیں ہوتے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ وہ صبر کے ساتھ برداشت کرتے تھے، کبھی کبھی عسرت کی یہ شدت بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی، خاص طور پر سبب وہ حالت سفر میں ہوں، اور زادراہ ختم ہو چکا ہو، مگر کیا مجال ہے کہ حوادث کے حوصلہ میں پستی اور تیور میں فرق آجائے۔ وہ

ایسا بھی ہوا ہے کہ حالات نے زیادہ نازک صورت اختیار کر لی، فاقہ کشی کی حالت پیدا ہو گئی پھر بھی دوسروں کے عطیے، یہ جانتے ہوئے انہوں نے رد کر دیئے کہ کسی کا ممنون کرم بننا زیادہ تکلیف دہ ہے، بہ نسبت فقر وفاقہ کی زندگی بسر کرنے کے، چنانچہ وہ شدت اور عسرت کو قبول کر لیتے تھے، اور تحائف وعطایا کے قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

سد رمق، قوت لایموت، اور اہل وعیال کی حاجت برآری کے لیے مندرجہ ذیل تین طریقوں میں سے ایک پر وہ عمل کرتے تھے۔

(۱)۔ کھیتی باڑی کے بعد کوڑا کرکٹ سمجھ کر جو کچھ چھوڑ دیا جاتا تھا، جو حکم مباح میں ہوتا ہے لسے وہ چن لیتے تھے، اور اس سے اپنی ضروریات پوری کرتے تھے، چنانچہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ یہ عالم جلیل، اور محدث بے بدل رسّی کاندھے پر رکھے ہوئے جا رہا ہے، اور کھیتوں کی بچی کھچی چیزیں جن پر کسی کا دعویٰ نہیں ہوتا، چن چن کر لا رہا ہے، امام احمد اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ کسی کی زمین پر بغیر اس کی اجازت کے قدم نہ رکھیں، نہ کسی کے کھیت کو پامال اور خراب کریں، چنانچہ ان سے روایت ہے کہ :-

"میں پاپیادہ ایک سرحد پر گیا، پھر ہم بچی کھچی چیزیں چننے لگے، میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا، جو دوسرے لوگوں کے کھیت کھلیان خراب کر رہے تھے، کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے کھیت میں بغیر اس کی اجازت کے قدم رکھے۔"

(۲) ——— اور یہ کام بھی وہ اس وقت کرتے تھے، جب محنت مزدوری کے لیے کوئی کام نہیں ملتا تھا، اگر کوئی مشقت کا کام مل جاتا تھا، تو پھر وہ اسی کو ترجیح دیتے تھے کہ کام کریں، اور روزی پیدا کریں، یہ حلال معیشت کا دوسرا طریقہ تھا۔ انہیں کسی طرح کا کام کرنے سے عار نہیں تھا، خواہ وہ کسی نوعیت اور کسی طرح کا کیوں نہ ہو، بشرطیکہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو، اور ان کی اپنی ضرورت پوری ہو جاتی ہو۔

وہ راستہ گلی میں بار برداری کا کام بھی، اگر کوئی دوسری مزدوری ممکن نہ ہو کر لیتے تھے، اجرت پر کپڑے بننے کا کام بھی کرتے تھے۔ تاریخ ذہبی میں جہاں امام احمد کا حال بیان ہوا ہے۔ علی بن الجہم کی یہ روایت بھی ہمیں ملتی ہے :-

ہمارا ایک پڑوسی تھا، وہ ہمارے پاس ایک خط لے کر آیا، اور کہنے لگا، کیا تم اس خط کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا، یہ تو احمد بن حنبل کا خط ہے، تمہیں انہوں نے کیوں لکھا تھا؟ کہنے لگا، ہم مکہ میں سفیان بن عیینہ کے ہاں مقیم تھے، احمد بھی ہمارے ساتھ تھے، ایک مرتبہ کئی دن تک وہ لاپتہ رہے، آخر ایک دن خود ہی ان کے یہاں آئے تو دروازہ بند تھا۔

میں نے پوچھا،

"کیا بات ہے کیوں غائب رہے؟"

کہنے لگے:

"میرے کپڑے چوری ہو گئے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"میرے پاس کافی دینار ہیں، چاہو یونہی لے لو، خواہ قرض کے طور پر،" لیکن انہوں نے نہ یونہی لینا پسند کیا، نہ قرض کے طور پر، تو میں نے کہا،

"اُجرت پر میرے لیے کچھ لکھ دو گے؟"

اس پر راضی ہو گئے۔ میں نے انہیں ایک دینار دیا، کہنے لگے، میرے لیے اس رقم کا کپڑا خرید لاؤ، اور اس کے دو ٹکڑے کر دو، ایک تہبند، ایک چادر، اور ایک درزی کا غذ لا دو۔ میں نے کپڑا لا دیا، اور کاغذ لا کر دے دیا، تو انہوں نے یہ لکھ دیا۔

احمد کبھی کبھی کپڑا بھی بنا کرتے تھے، اور جو کچھ بنتے اسے فروخت کر دیتے، اور اسی سے کھا لیتے تھے۔"

حافظ ذہبی نے امام اسحٰق بن راہویہ سے ایک اور حکایت بھی نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"یمن میں عبدالرزاق کے پاس میں اور احمد ساتھ ساتھ تھے۔ میں مکان کے بالائی حصہ میں رہتا تھا، اور احمد نچلے حصہ میں، وہاں سے جب میں ایک جگہ پہنچا تو میں نے ایک کنیز خریدی، وہاں معلوم ہوا کہ احمد کا زادِ راہ ختم ہو چکا ہے، میں نے کچھ رقم پیش کی، لیکن انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا، میں نے کہا چاہے قرض لے لیجیے خواہ یونہی، لیکن انہوں نے اس سے

[illegible]

اپنا کام چلایا؟

ان تصریحات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ جلیل الشان امام کسی کام میں بھی اپنی توہین اور سبکی نہیں محسوس کرتا تھا، بشرطیکہ کام کی نوعیت جائز، اور حلال ہو، اور اس سے لوگوں کی نفع رسانی ہوتی ہو، اور حیات انسانی کا بھی وہ قانون ہے جو انسان کی سربلندی کا ضامن ہے، حقیقت یہ ہے کہ امام احمد ایک نیک آدمی تھے، وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ لوگ کسی کام کو نیک سمجھتے ہیں، وہ اپنی نزاہت نفس کو پیش نظر رکھتے تھے، اور اس اصول پر سختی سے عامل تھے کہ کوئی ایسا مال نہیں لیں گے جو حلال نہ ہو، وہ کام کے چھوٹے پن کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، اس لیے کہ انسان کا شرف ذاتی، اس کے نفس کی نزاہت پر مبنی ہوتا ہے یا پھر اس سے کہ وہ پست ور کیک باتوں اور منت خلق سے اپنا دامن بچائے رکھے، اور وہ لوگ جو چھوٹے کاموں کو انجام دینے میں عار اور ننگ محسوس کرتے ہیں در حقیقت ان کا شمار کمزور، اور پست لوگوں میں ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شرف نفس سے محروم رکھا ہے، اس کی تلافی وہ اس مصنوعی اور مادی ڈھنگ سے کرنا چاہتے ہیں، و کل میسر لما خلق لہ۔

(۳) —— ضروریات زندگی پوری کرنے کے سلسلہ میں امام صاحب جس تیسرے اصول پر عامل تھے، وہ تھا قرض لینا، لیکن اس سلسلہ میں بھی اس بات کو سختی سے ملحوظ خاطر رکھتے تھے کہ بہ ضرورت اور احتیاج کے موقعہ پر بے دھڑک قرض لینا پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ قرض اسی وقت لیتے تھے جب ان کے کرایہ اور جائداد کی آمدنی قریب الوصول ہو، اور اپنی جگہ پر یہ اعتماد ہو جائے کہ قرض دینے والا واقعی قرض دے رہا ہے، قرض کے پردہ میں عطیہ نہیں دے رہا ہے، ایک اصول یہ بھی تھا کہ قرض حالت سفر میں نہیں لیتے تھے، اس لیے کہ جہاں مستقل قیام ہو وہاں قرض کی ادائی امن و قرار کی وجہ سے زیادہ یقینی اور قریبی ہوتی ہے، اس کے برعکس سفر میں یہ سہولت نہیں ہوتی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ قرض اس فیصلہ کے ساتھ لیتے تھے کہ اسے آسانی اور سہولت کے موافق ادا کر دیں گے، لیکن قرض دینے والا یہ نیت رکھتا تھا کہ یہ عطیہ ہے قرض نہیں ہے لہٰذا اسے واپس نہیں لے گا، ایسی صورت میں دونوں میں کشمکش ہونے لگتی تھی، امام احمد اپنی رائے پر ڈٹے رہتے تھے کہ قرض ادا کریں گے، اور آخر انہی کی بات بالا رہتی تھی، اور قرض دار کو قرض کی رقم واپس لینا پڑتی تھی۔

[illegible] ... احمد شاکر

تقویٰ میں ہوتا تھا، اور جن کے مال کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ وہ مال حلال ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ یہ رقم واپس دینے کے لیے آپ کے پاس گئے، اس نے کہا۔

"اے ابو عبداللہ، میں نے جب یہ رقم تمہیں دی تھی، تو یہ نیت کر لی تھی کہ واپس نہیں لوں گا۔"

امام احمد نے جواب دیا۔

"میں نے جب یہ رقم لی تھی تو نیت کر لی تھی کہ اسے ضرور واپس کر کے رہوں گا۔"[1]

معیشت اور کسب رزق

یہ تھی کیفیت امام احمد کی معیشت اور کسب رزق کی، اگرچہ وہ غربت اور فلاکت کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن عطیوں کے قبول کرنے سے محترز رہتے تھے، وہ اس امر کا بڑی سختی سے لحاظ رکھتے تھے کہ جو مال ان کے ہاتھ میں آرہا ہے وہ ہر طرح کے شبہ سے خالی ہو، اگر اس کے حلال ہونے میں ذرا بھی شبہ ہوتا تھا تو بے تامل اسے واپس کر دیتے تھے، ایسے مواقع پر اپنی مالی دشواریوں کے باوجود جواز کے پہلو پر حرمت کے پہلو کو ترجیح دیتے تھے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک قرض کے سلسلہ میں انہوں نے سونے کی ایک چیز رہن رکھ دی جب ان کے پاس روپے کا بندوبست ہو گیا تو وہ دائن کے پاس گئے کہ اسے رقم دے کر اپنی چیز واپس لے لیں، دائن جب رہن شدہ چیز واپس دینے لگا تو اسے کچھ شبہ ہو گیا، کیونکہ اس کے پاس ویسی ہی ایک اور چیز بھی رہن تھی، اس نے دونوں چیزیں امام احمد کی طرف بڑھا دیں، اور کہا، ان میں سے جو آپ کی ہو وہ لے لیجیے، لیکن امام احمد کی حد درجہ احتیاط پسندی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے دونوں چیزیں واپس کر دیں، اور کچھ نہیں لیا، یعنی انہوں نے اپنے ایک جائز حق سے دست بردار ہونا اور نقصان اٹھانا گوارا کر لیا، لیکن یہ گوارا نہیں کیا کہ کوئی ایسی چیز لے لیں جو ممکن ہے کسی اور کی ہو، اس شبہ کی بنیاد پر کہ کسی دوسرے کی بغیر معاوضہ وہی چیز لی جا سکتی ہے، جو رضاء کامل سے حاصل نہ ہوئی ہو، اور یہاں چونکہ ایسی صورت نہیں تھی لہٰذا انہوں نے اپنا نقصان گوارا کر لیا، اور دستبردار ہو گئے۔

اس طرح آپ دیکھیں گے کہ یہ جلیل القدر عالم اپنی معاش اور گزر بسر کے سلسلہ میں اس راستہ پر چلتا تھا جس سے اس کا نفس پست ہونے کے بجائے بلند ہو، ہر طرح کی تنگ دستی کے باوجود ان کا

[1] حلیۃ الاولیاء ص۱۸۱ ج ۹۔

وہ اپنی وسعت کے مطابق کشادہ دست اور سخی تھے، انہیں صرف اسی بات کی لگن رہتی تھی کہ جو مال ان کے پاس ہے، یا جو ان کے پاس آئے وہ حلال اور طیب ہو، اس میں خبث، اور حرمت کا ذرا سا شائبہ بھی نہ ہو، نہ اس میں غیر کی ملکیت ہونے کا کسی طرح کا اندیشہ ہو، ان دونوں میں سے کوئی صورت بھی ہو وہ ہنسی خوشی اس سے دستبردار ہو جایا کرتے تھے، اپنے اس وصف کریم کے اعتبار سے وہ خاص طور پر ممتاز تھے کہ اپنے قرض کے معاملہ میں چوکس تھے، اور اگر کچھ پلّے ہوتا تھا تو بے دھڑک اسے لٹا دیتے تھے۔

خلفا کی مالی امداد قبول کرنے سے انکار

آپ نے دیکھ لیا، اس بارے میں امام احمد اپنے نفس کے ساتھ کتنے بخیل تھے کہ دوسروں کے تحائف اور عطایا قبول کرنے کا احسان برداشت کریں، اور اس بات کا کتنی سختی کے ساتھ لحاظ رکھتے تھے کہ کوئی ایسا مال اپنے ہاتھ میں نہ آنے دیں جس کی حلت مشکوک ہو، یا اس میں ذرا بھی خبث اور حرمت کا شائبہ ہو، زکوٰۃ کے معاملہ میں انہوں نے آپ پر شدید پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، اس سلسلہ میں وہ اپنی ذات کی حد تک "یُسر" کے بجائے "عُسر" کو پسند کرتے تھے، یہاں تک کہ نہ صرف اپنی جائداد کے کرایہ، اور آمدنی کی زکوٰۃ دیتے تھے، بلکہ مکان مسکونہ کی (کرایہ کا اندازہ کرکے) بھی پابندی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے تھے، حضرت عمرؓ کے اس فتوے کے مطابق جو انہوں نے سوادِ عراق کی فتح کے وقت دیا تھا۔

جب امام احمد کی عفت کردار، اور حزم و احتیاط، اور ذاتی سخاوت اور کشادہ دستی کی یہ کیفیت تھی، پھر کیا یہ ممکن تھا کہ وہ خلفاء سے مالی امداد قبول کرتے؟ جو مسلمانوں کی زکوٰۃ سے جمع کیا گیا تھا اور جس کے مصارف خدا نے متعین کر دیئے تھے کہ مصالح امت پر صرف کیا جائے؟ کوئی شبہ نہیں علماء اور محدثین کی دستگیری، اور مالی امداد بھی اس ذیل میں آتی تھی، اور اگر وہ یہ مال قبول کر لیتے، تو یہ خلفا کا مال نہ ہوتا، بلکہ قوم کا مال ہوتا، جس کی خدمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں وہ زندگی بھر کرتے رہے۔

لیکن امام صاحب کا مسلک دوسرا تھا، وہ خلفاء سے مال لینے کے سلسلہ میں بہت زیادہ [illegible]

ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ ایسے مال کے قبول کرنے سے شدید نفرت کرتے تھے، انہوں نے خلفاء کا دیا ہوا کوئی منصب، یا ان کا بخشا ہوا کوئی عطیہ قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا، بلکہ اس مسلک پر ان کی سختی کا یہ عالم تھا کہ وہ ایسے لوگوں کا مال قبول کرنے سے بھی انکار کرتے تھے جنہوں نے کبھی اور کسی وقت بھی کسی سلطانِ وقت کے مال سے فائدہ اٹھایا ہو، وہ ایسے لوگوں کے مال سے فائدہ اٹھانے سے ہر صورت اور ہر حالت میں قطعاً احتراز کرتے تھے۔

یہ اجمال ہے جس کی مختصر تفصیل "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہم درج کرتے ہیں،

امام شافعی کی پیشکش رد کر دی

امام شافعی جب دوسری مرتبہ بغداد تشریف لائے، اور وہاں قیام فرما ہوئے، اور اپنے نظریات اور مسلک کی نشر و تبلیغ میں مصروف ہوئے تو امام احمد بھی بغداد ہی میں موجود تھے، اور امام شافعی کی مجلس میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے، یہ حاضری انہوں نے کبھی ناغہ نہیں کی، سوا کوئی سفر پیش آجانے کے سبب سے، یا حدیث ہی کے سلسلہ میں کسی اور مصروفیت کے باعث۔

امام شافعی نے دیکھا کہ احمد، عبدالرزاق بن ہمام سے طلب حدیث کے سلسلہ میں یمن جانے ہیں، جیسا کہ ہم یہ واقعہ اس سے قبل بیان کر چکے ہیں۔ امام شافعی کو یہ بھی معلوم تھا کہ احمد روپے کی کمی کے باعث کیسی کیسی مشقت اور تکلیف پر مجبور ہو ہو جاتے ہیں، اسی زمانہ میں امین نے امام شافعی کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ یمن کے لیے کسی قاضی کا انتخاب کریں، انہوں نے محسوس کیا اگر احمد کو یمن کا قاضی بنا دیا جائے تو ان کی یہ دشواری ختم ہو جائے گی، بغیر کسی زحمت اور مصیبت سے دوچار ہوئے وہ عبدالرزاق بن ہمام سے حدیث کی سماعت کر سکیں گے، یہ سوچ کر انہوں نے احمد کو اس منصب کی پیش کش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا، دوبارہ پھر اصرار کے ساتھ یہ پیش کش دوہرائی، اس کے جواب میں امام صاحب نے امام شافعی سے، جو ان کے استاد اور شیخ تھے، اور جن کا وہ بے حد اجلال و احترام کرتے تھے،

"اے ابو عبداللہ!
اگر اس پیش کش کی بات میں نے آپ سے پھر دوبارہ سنی، تو پھر آپ مجھے کبھی اپنے حضور میں حاضر ہوتے نہیں دیکھیں گے"[1]

[1] المناقب ابن الجوزی ص ۲۷۱۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس وقت امام شافعی امین کے ہاں فروکش تھے۔

امام احمد نے اپنے استاد کی یہ معزز اور نہایت مختار پیش کش مسترد کردی، اس لیے کہ وہ اس عزم پر سختی کے ساتھ قائم تھے کہ اپنے آپ کو صرف علم کے لیے وقف رکھیں، دوسری چیزوں میں اپنا دامن نہ الجھائیں، نیز یہ کہ اپنے پاس کسی ایسے مال کو نہ پھٹکنے دیں، جس میں حرمت کا ذرا سا بھی شائبہ ہو، اس لیے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ علم کے راستہ میں مشقتیں اور اذیتیں آتی ہیں، انہیں خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔ اور پھر یہ بات بھی تھی کہ امام ابو حنیفہ کی طرح وہ اپنے لیے اسے جائز نہیں سمجھتے تھے کہ قضا کا منصب قبول کریں۔

قناعت اور استغنا

جب صورت حال یہ تھی کہ امام احمد کوئی ایسا مال نہیں قبول کرتے تھے، جو شک و شبہ سے خالی نہ ہو، تو ظاہر ہے ان کی عفت کردار خلفا کا مال قبول کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہو سکتی تھی، اگرچہ وہ مالی دشواری میں مبتلا تھے اور عسرت و فلاکت کی زندگی بسر کر رہے تھے

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ائمۂ وقت تین قسموں میں منقسم تھے۔

(۱) ——— پہلی قسم وہ تھی جو خلافت، اور سلطانِ وقت کے مال سے اجتناب کرتی تھی، ان کے ہدایا اور تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیتی تھی، اور اپنے انکار پر شدت کے ساتھ قائم رہتی تھی، اس گروہ میں امام ابو حنیفہؒ اور امام ثوریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امام ابو حنیفہؒ اس حقیقت کے رمز آشنا تھے کہ ان لوگوں کا مال نہ قبول کرنا اپنے نفس کو ہلاکت سے بچا لینا ہے۔ اس لیے کہ منصور انہیں منصب بلند کی پیش کش کر کے ان کی وفاداری کا امتحان کرنا چاہتا تھا، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا، منصور کے بعض حاشیہ نشین یہ چاہتے تھے کہ امام ابو حنیفہ منصور کے عطایا قبول کر لیں، اور اس کو اپنے صرف میں نہ لائیں، بلکہ صدقہ کر دیں، تاکہ منصور خفا نہ ہو، لیکن انہوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ چند لمحات کے لیے بھی اس طرح کا مال ان کی ملکیت میں آئے، خواہ اس انکار کے نتائج اور عواقب کچھ ہی کیوں نہ ہوں؛

(۲) ——— دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو خلفاء کے عطایا قبول کر لیتے تھے، اور اس طرح جو رقم حاصل ہوتی تھی اسے محتاجوں اور طبقۂ اہل علم کے حاجت مندوں پر بھی صرف کر دیتے تھے اور خود بھی استعمال میں لے آتے تھے تاکہ وہ ایسی باعزت زندگی بسر کر سکیں جو اہلِ علم اور اہلِ دین کے شایانِ شان ہو، اور بغیر اسراف و تبذیر کے ...

اس گروہ کے سربراہوں میں امام حسن بصری اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اسماء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، امام مالکؒ خلفاء سے عطایا لینے میں کوئی برائی نہیں سمجھتے تھے، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کا مال تھا، اور اس مال کا مستحق ان اہلِ علم سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا جنہوں نے اپنی زندگی لوگوں کو امورِ دین کی تعلیم دینے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے وقف کر رکھی تھی، ان کی مثال اس فوج کی سی تھی، جو اپنی زندگی سرحد کی حفاظت و صیانت کے لیے وقف رکھتی ہے کہ سرحد کے کسی روزن سے دشمن داخل ہو کر امت کو نقصان نہ پہنچا سکے، پس جب وہ فوج اس کی مستحق ہے کہ اس پر ملت کا روپیہ صرف ہو، تو وہ علماء جو گمراہی کو روکتے اور اس کے ہر رخنہ کو بند کرتے ہیں تاکہ گمراہ کن عقائد دین کو مجروح نہ کر سکیں، جو امت کے قلب تک پہنچکر اس کی گمراہی کے موجب بنیں، کیوں مالی اعانت اور دستگیری کے سزاوار نہیں ہیں؟

کوئی شبہ نہیں۔ امام مالکؒ کے یہ خیالات ایک اہم نقطۂ نظر کے حامل اور اپنی ایک بنیاد رکھتے ہیں۔ امام مالکؒ کی خصوصیت یہ تھی کہ جو بھی نظامِ حکومت ہو اور حاکم جیسا کچھ بھی ہو وہ اس کا احترام کرتے تھے، اس کے اطوار و حالات میں موعظۂ حسنہ اور پند و نصیحت کے ذریعہ اصلاح و تغیّر کی کوشش کرتے تھے، اور یہ پالیسی اتصال کی متقاضی تھی، نہ مقاطعہ کی، اور اتصال کا تقاضا یہ ہے کہ عطایا قبول کیے جائیں، انہیں رد نہ کیا جائے!

(۳) ——— تیسرا گروہ، مذکورہ دونوں گروہوں کے بین بین تھا۔ یہ لوگ خلفاء کی مرضی کے مطابق ذمہ دارانہ مناصب بھی قبول کرتے تھے، اور ان کے عطایا بھی قبول کرتے تھے، اور حاصل کردہ رقم میں سے کارِ خیر پر بھی خرچ کرتے تھے۔ اس گروہ میں امام شافعیؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، انہوں نے رشید کے دورِ حکومت میں منصب قبول کیا، اور اس کے عطایا بھی قبول کیے، اور ان میں سے صدقات و خیرات پر بھی رقم خرچ کی، مالِ غنیمت میں سے بھی وہ اپنا حصہ لیتے تھے، کیونکہ بنو عبدالمطلب کا اس میں سے ایک حصہ مقرر تھا۔ ان لوگوں نے بنو ہاشم کا ہر دور میں ساتھ دیا تھا، خواہ وہ امن و جنگ کا زمانہ ہو، یا جاہلیت اور اسلام کا!

امام احمدؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا فرق

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام احمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا مسلک اس باب میں اختیار کیا، لیکن امام احمد اور امام ابو حنیفہ کے حالات

میں فرق تھا۔ امام احمد کا حال یہ تھا کہ انہوں نے فاقہ مست ہو کر بھی خلفاء کے عطایا اور ہدایا پوری شان استغنا سے واپس کر دیئے۔ وہ محنت مزدوری کرتے، اجرت پر کتابت کر کے اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس اعتبار سے خلفاء کے امدادی عطیوں سے انکار کر کے انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ بہت ہی صابر اور قانع مزاج تھے۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ ایک دولت مند آدمی تھے۔ ایک اچھے اور بڑے کاروبار تجارت کے مالک تھے، جس سے خاصا نفع کما لیتے اور اپنے اس سرمایہ سے ان فقہاء اور محدثین کی ضرورتیں پوری کیا کرتے تھے، جنہیں ان سے تقرب حاصل تھا۔ غرض امام ابوحنیفہؒ کی مالی حالت امام احمد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بہتر تھی۔

امام احمد اپنے اس مسلک میں اتنے سخت تھے کہ خلفاء کے ان عطایا کو بھی قبول نہیں کرتے تھے جو ان کی ذات سے مخصوص نہیں ہوتے تھے، بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عام ہوتے تھے۔ روایت ہے کہ مامون الرشید نے ایک مرتبہ ایک رقم خطیر شیوخ حدیث میں سے ایک بزرگ کے پاس بھیجی، تاکہ وہ اسے اہل حدیث کے مابین تقسیم کر دیں، اس لیے کہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کی مالی حالت کمزور تھی، اور وہ ان کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے حسب ضرورت روپیہ نہ لیا ہو سوا احمد بن حنبل کے۔ انہوں نے اس طرف نظر بھی نہیں اٹھائی۔

یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب مامون فقہاء اور محدثین کے پیچھے نہیں پڑا تھا، اور انہیں مصیبت میں اس نے مبتلا نہیں کیا تھا، نہ انہیں یہ کہنے پر مجبور کیا تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔ اس بار میں اس کی مت تو اس وقت پلٹی جب وہ بغداد سے طرسوس چلا گیا، اور یہی اس کی زندگی اور خلافت کا آخری سال تھا۔

بلاشبہ، معتصم اور واثق کے عہد میں امام احمد کو مالی پیش کش نہیں کی گئی، بلکہ ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے، اور لرزہ خیز اذیتوں کا ہدف بنایا گیا۔ ان دونوں کے دور میں ان کا ابتلا "عطا" سے نہ تھا، "بلا" سے تھا۔ نعمت ان سے دور رکھی گئی اور مصیبت ان کے سامنے پیش کی گئی، اور یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ اس ابتلاء و آزمائش کے دور سے وہ طیب نفس اور قلب مطمئن کے ساتھ راضی برضاء الٰہی ہو کر گزر گئے۔ انہوں نے اگر مدد چاہی تو اس کی، رحمت کے طلبگار ہوئے تو اسی کی!

خلیفہ متوکل اور امام احمدؒ

پھر وہ وقت آیا کہ امتحان و ابتلا کا دور ختم ہو گیا اور قرار و اطمینان کا دور شروع ہو گیا۔ یہ متوکل کا زمانہ تھا۔ متوکل نے امام صاحب کو جس آزمائش میں ڈالا وہ پہلی سے بھی زیادہ سخت تھی۔ پہلے جسم کا امتحان درپیش تھا، اب نفس کے لیے آزمائش کی گھڑی آ پہنچی تھی۔ متوکل نے مال و دولت کے ڈھیر امام احمد کے قدموں پر لا ڈالے۔ اس پیش کش کو اس نے اصرار کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے حاشیہ نشینوں نے زور دیا کہ وہ اسے قبول کریں، لیکن امام صاحب نے اسی شدت اور اصرار کے ساتھ ہر قسم کی مالی پیش کش قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے یہ بات بھی نہیں مانی کہ یہ روپیے لیں، اور بطور خود صدقہ کر دیں۔ امام صاحب اس کے بھی روادار نہیں تھے کہ اس طرح کے مال کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی ملکیت میں لائیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مال اہل ثروت کے لیے جائز اور مباح نہیں ہے۔ اس کے دوسرے لوگ زیادہ مستحق ہیں۔ وہ لوگ جو سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں اس مال کا مصرف ہے فوج کی تیاری، سامان جنگ کی فراہمی، محتاجوں کی دستگیری، فقیروں اور فلاکت زدہ لوگوں کی امداد و اعانت۔ اور امام احمد اس گروہ میں اپنے آپ کو شمار نہیں کرتے تھے، کرایہ کی صورت میں جو قلیل سی آمدنی انہیں ہوتی تھی اسے وہ اپنے اوپر خدا کا احسان سمجھتے تھے اور اسی میں گزر بسر کرتے تھے۔

امام صاحب نے متوکل کا پیش کیا ہوا مال رد کر دیا، اور اسے کسی صورت میں بھی قبول کرنا گوارا نہ کیا۔ اور اگر کبھی بالکل مجبور ہو کر اس طرح کی پیش کش انہوں نے قبول بھی کی تو ایک لمحہ کے لیے بھی اسے اپنے پاس رکھنا گوارا نہ کیا، فوراً محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح کے واقعات متوکل کے ابتدائی دور خلافت میں پیش آئے۔ بات یہ ہوئی کہ ورانداز وں نے امام احمد اور متوکل کے مابین غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور چھوٹی چھوٹی باتیں اور افواہیں اڑانا شروع کر دیں۔ مشہور یہ کیا کہ انہوں نے اپنے گھر میں ایک علوی کو پناہ دے رکھی ہے، جو خلافت کا دشمن اور مخالف ہے۔ اس فضا میں وہ غلط فہمی کے بادل چھانٹنے، اور بدگمانی کی بنیاد ڈھانے کے لیے مجبور ہو گئے کہ بادل نخواستہ خلیفۂ وقت کی مالی پیش کش قبول کر کے یہ باور کرا دیں کہ وہ خلافت کے دشمن نہیں، مخالف۔ لیکن اس طرح کا مال جیسے ہی آتا تھا، فوراً ایسے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے جو اپنی مالی زبوں حالی کو عام طور پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ متوکل کے وزیر نے انہیں کہا:

"امیر المؤمنین نے آپ کی خدمت میں تحفہ کی رقم بھیجی ہے، وہ آپ کو اپنے دربار میں شرف باریابی بخشنا چاہتے ہیں، خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے گا کہ آپ نہ آئیں، اور مال واپس کر دیں، اگر ایسا کیا، تو وہ لوگ جو آپ سے بغض رکھتے ہیں سچے ثابت ہوں گے۔

یہ خط پاکر امام صاحب مجبور ہو گئے کہ یہ رقم قبول کر کے لگائی بجھائی کا پردہ چاک کر دیں، لیکن اس رقم کو انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اپنے صاحبزادے صالح کو حکم دیا کہ اسے لے لیں، اور صبح ہوتے ہی مہاجرین اور انصار، اور دوسرے اہلِ حاجت کے مابین تقسیم کر دیں، گویا ان کی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے مال کے خود ان کے مقابلہ میں وہ زیادہ مستحق ہیں۔

اور جب متوکل کو، امام احمد کے زہد و اتقا، ایمان، امن پسندی کا یقین آگیا تو وہ پورے طور پر ان کی طرف سے مطمئن ہو گیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب کوئی چغل خور اور دراندازِ متوکل سے امام احمد کی شکایت کرتا اور کہتا:—

"احمد نہ آپ کے کھانے میں سے کچھ کھانا پسند کرتے ہیں، نہ آپ کے فرش پر بیٹھنا گوارا کرتے ہیں، بلکہ یہ نبیذ جو آپ پیتے ہیں، اسے بھی حرام کہتے ہیں؛"

تو وہ جواب دیتا:

"اگر معتصم پھر سے زندہ ہو جائے، اور وہ امام احمد کی شکایت مجھ سے کرے تو اسے بھی میں نہیں ماننے کا؛"

اور یہ کہہ کر چغل خوروں، اور دراندازوں کی زبان پر قفل لگا دیتا۔

جب متوکل کی نظر میں، امام احمد نے یہ منزلت حاصل کر لی، تو اس نے انہیں اس امر کی پوری پوری اجازت دے دی کہ اس کے عطایا کو خواہ قبول کریں، خواہ رد کر دیں، وہ برا نہیں ماننے کا، چنانچہ اس کے بعد وہ ایسی رقمیں لینے سے بھی انکار کرنے لگے جو انہیں اس لیے بھیجی جاتی تھیں کہ انہیں اہلِ حاجت اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیں، چنانچہ ایک مرتبہ متوکل نے ایک ہزار دینار ان کی خدمت میں بھیجے تاکہ اس رقم کو وہ حاجتمندوں اور اہلِ ضرورت میں تقسیم کر دیں تو انہوں نے فرمایا:

"میں اپنے گھر میں لوگوں سے منقطع ہو کر بیٹھ گیا ہوں، اور امیر المؤمنین نے مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ جو بات مجھے اچھی نہ لگے، وہ نہ کروں، اور اس رقم کو قبول کرنا میں ناپسند کرتا ہوں؛"

اولاد اور رشتہ داروں کا مقاطعہ

صورتِ حال یہ تھی کہ امام احمد خلیفہ کا مال لینے سے تو ظاہر ہے انکار کرتے ہی تھے اور اس سے بھی انہیں راحت مل چکی تھی کہ بادلِ نخواستہ اسے قبول کریں، لیکن یہ عالم تھا کہ بسا اوقات ایسے مال میں بھی ہاتھ لگانا گوارا نہیں کرتا تھا جس میں حکومت کے عطایا کی آمیزش ہو، امام احمد کی اولاد، اور قرابت مند، خلیفہ کے عطایا قبول کر لیتے تھے۔ امام صاحب نے اس فعل سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن انہوں نے یہ بات نہیں مانی، امام صاحب ان سے فرمایا کرتے تھے:—

"تم یہ مال کیوں لیتے ہو، جب کہ سرحدیں معطّل اور غیر آباد ہیں، اور نہ مستحق لوگوں میں تقسیم نہیں ہو پاتی ہے؛"

پھر جب امام صاحب کے فرزند اور قرابت مند خلیفہ کے عطایا قبول کرنے سے باز نہیں آتے، تو آپ نے ان کا مقاطعہ کر دیا۔ نہ ان کا کھاتے تھے نہ پیتے تھے، حتیٰ کہ وہ روٹی بھی نہیں کھاتے تھے، جو ان کے تنور میں ان کی آگ سے پک کر آتی تھی۔ ایک مرتبہ انہیں معلوم ہوا کہ دستر خوان پر جو روٹی سامنے رکھی ہے یہ ان کے ایک صاحبزادے کے گھر کے تنور میں پک کر آئی ہے، انہوں نے اسے کھانے سے انکار کر دیا، اس لیے کہ یہ فرزند سلطان کے انعامات اور عطایا قبول کر لیا کرتے تھے، پہنچانے والوں نے یہ بات خلیفہ تک پہنچا دی، لیکن یہ معلوم کر کے نہ وہ برہم ہوا، نہ آمادۂ انتقام ہوا، اس لیے کہ وہ ان کے ایمان اور اخلاص کا قائل ہو چکا تھا، یہ سن کر اس نے کہا تو یہ کہ "امام احمد نے ہمیں منع کیا ہے کہ ان کے فرزند کو بھی مال و انعام سے سرفراز نہ کیا کریں۔" اور اس کے بعد سے اس نے حکم نافذ کر دیا کہ امام احمد کے بیٹوں اور قرابت مندوں کو آئندہ سے خفیہ طور پر رقم دی جایا کرے، احمد کو اس کا پتہ نہ چلا کرے۔"

لیکن ان باتوں سے کیا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ امام احمد خلفا کے عطایا اور ہدایا کو حرامِ مطلق سمجھتے تھے، نہیں یہ بات نہیں تھی، وہ ان کے مال و دولت کو مشکوک سمجھتے تھے، حرام نہیں سمجھتے تھے لیکن امام احمد صاحب کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ کوئی چیز مشکوک ہو، اس لیے کہ ان کی تنزیہِ نفس اسے گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ وہ مشکوک مال استعمال کریں۔ اس کا تقاضا یہ بھی تھا کہ صرف وہ مال ان کے تصرف

میں آئے، جس کے بارے میں انہیں یقین واثق ہو کہ اس میں حرمت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ امام صاحب کچھ بیمار ہوئے، ان کے صاحبزادے عبادت کے لیے حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"میرے پاس کچھ روپیہ ہے جو متوکل نے مجھے دیا تھا، کیا میں اس سے خرچ کر لوں؟"

آپ نے فرمایا۔

"ہاں، کر لو۔"

صاحبزادے نے فرمایا،

"اگر اس طرح کی رقم آپ کے پاس ہوتی تو آپ اسے اس مصرف میں کیوں نہ لاتے؟"

یہ سنکر آپ نے فرمایا:

"بیٹے، میں خلیفہ کے عطایا کو حرام نہیں سمجھتا، لیکن اسے قبول کرنا نزہت نفس کے خلاف سمجھتا ہوں!"

اس سے ثابت ہوا کہ امام احمد خلفاء کے عطایا کو حرام اور ناجائز نہیں خیال کرتے تھے۔ البتہ انہیں مشتبہ ضرور سمجھتے تھے اور جب کسی چیز کے بارے میں یہ گمان ہو جائے کہ یہ مشتبہ ہے تو پھر اس کا استعمال وہ نزہت نفس کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے کہ زہاد کا مسلک یہی ہے کہ وہ شک و اشتباہ کی صورت میں مال و دولت سے اپنے نفس کو الگ رکھتے ہیں، جو چیز شک میں ڈالے اس سے الگ رہتے ہیں، جو غیر مشکوک ہو اسے قبول کر لیتے ہیں، حضرت امام کے تکرو تقلب اور ایمان کا تقاضا بھی یہی تھا!

امام احمدؒ کا علم

حضرت امام کی زندگی ہی میں آپ کے علم کی شہرت چار دانگ عالم میں پہنچ گئی، بلکہ حدیث و اثر میں ان کی شہرت اسی وقت سے شروع ہو گئی، جب ابھی وہ نوجوان تھے، اور شیوخ وقت سے کسب فیض کر رہے تھے۔ احمد بن سعید الرازی ان کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"میں نے کسی نوجوان کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پختہ مغز حافظ اور فقہ کا نکتہ رس عالم احمد بن حنبل سے زیادہ نہیں دیکھا!"

حضرت امام کے استاد، امام شافعی اپنے اس قابل شاگرد سے فرمایا کرتے تھے،

"احادیث صحیحہ کے تم ہم سے زیادہ عالم ہو، جب تم تک کوئی صحیح حدیث پہنچے تو مجھے اس سے ضرور باخبر کرو، تاکہ میں اس کے مطابق مسلک اختیار کروں، خواہ حدیث کسی شامی کی ہو یا مصری کی!"

امام مزنیؒ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے ایک مرتبہ فرمایا،

"دنیا کے عجائبات میں تین چیزیں ہیں،

۱۔ ایک شخص عرب ہے، لیکن عربی کا ایک کلمہ بھی صحیح نہیں بول سکتا۔ وہ ہے ابو ثورؒ،

۲۔ دوسرا شخص عجمی ہے، لیکن عربی کا ایک جملہ بھی غلط نہیں بول سکتا، وہ ہے حسن زعفرانیؒ

۳۔ ایک نو عمر ہے، لیکن جب کوئی بات کہتا ہے تو وقت کے اکابر اس کی تصدیق کرتے ہیں، وہ ہے احمد ابن حنبلؒ!"

"میں بغداد سے رخصت ہوا وہاں میں نے اپنے پیچھے کسی شخص کو بھی احمد بن حنبل سے
زیادہ خدا ترس، پارسا، اور فقیہ نہیں چھوڑا"

امام شافعی اپنے اس لائق شاگرد کو علم روایت اور فقہ کا ماہر تو سمجھتے ہی تھے، لیکن ان کی فراست پر بھی بہت بھروسہ کرتے تھے، چنانچہ ان کے ایک شاگرد محمد بن صباح ان سے روایت کرتے ہیں:-

"میں نے احمد بن حنبل، اور سلیمان بن داؤد الہاشمی سے زیادہ دانا اور صاحب فراست
کوئی اور شخص نہیں دیکھا"

یہ وقت کے ایک بہت بڑے عالم، مجتہد، اور امام —— شافعیؒ —— کے اقوال ہیں، امام احمدؒ کے بارے میں جو ابھی بالکل نوجوان ہی تھے، اور کوئی شبہ نہیں کہ پھر ماہ و سال کے گزرنے کے بعد بھی، وہ حدیث و فقہ کی تحصیل و طلب سے ایک دن کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے، ان کا علم ماہ و سال کی گردش کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا، فراست اور دانائی میں اضافہ ہوتا رہا، ان کا نام مشہور ہوتا، اور ان کا چرچا پھیلتا رہا، اور دورِ ابتلا کے بعد تو ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا، کیونکہ انہوں نے نہایت شان کے ساتھ تکلیفوں اور مصیبتوں کو جھیلا، اور پوری استقامت اور صبر جمیل کے ساتھ انہیں برداشت کیا۔ اس سلسلہ میں ہم ان کے معاصرین میں سے کچھ کے افکار و آراء قدرے تفصیل، بطور شہادت کے پیش کرتے ہیں:-

حافظ علی بن المدینی، امام صاحب کے ایک معاصر فرماتے ہیں:

"ہم میں ابو عبداللہ احمد بن حنبل سے زیادہ حافظ حدیث کوئی نہیں ہے میں انہیں پچاس سال سے جانتا ہوں، اس مدت میں ان کی خوبی اور بھلائی بڑھتی ہی رہی ہے"

آپ کے ایک دوسرے ہم عصر اور ہم جلیس امام قاسم بن سلام کہتے ہیں:-

"علم چار آدمیوں پر ختم ہو گیا ہے، احمد بن حنبل، علی بن المدینی، یحییٰ بن معین، اور ابو بکر بن شیبہ، اور احمد ان سب سے زیادہ فقہ کے ماہر تھے، میں نے احمد سے زیادہ سنت رسول کا عالم کوئی اور نہیں دیکھا"

یحییٰ بن معین کا آپ کے بارے میں ارشاد ہے:-

عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے:

"سفیان ثوری کی مرویہ حدیثوں کا سب سے بڑا عالم احمد بن حنبل ہے، جب بھی میں احمد کو دیکھتا ہوں بے ساختہ سفیان ثوری یاد آجاتے ہیں"؛

اور یہ سفیان ثوری، اپنے وقت کے بہت بڑے فقیہ و محدث، زاہد اور نفس عفیف کے مالک تھے، آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ امام صاحب کی شخصیت اور سیرت پر ان کا کتنا گہرا اثر تھا۔

عوامل مؤثرہ اقتباسات بالا سے جو امام صاحب کی ثنا و صفت میں دوسرے اجل علماء سے منقول ہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ آپ نے کس طرح اپنے عقیدے پر اپنے نفس کو قربان کر دیا، کس طرح انہوں نے اپنے نفس کی تربیت اور تکمیل کی، کس طرح احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے فتووں کو یاد کیا، کس طرح ان کی روایت کی اور انہیں مدوّن کیا، انہیں سمجھا اور سمجھایا، ان سے مسائل کا استنباط کیا، اپنی فقہ کی بنیاد ان پر رکھی، غرض کہ احادیث نبویہ اور آثار صحابہ ہی آپ کا منتہائے مقصود تھے۔

وہ عوامل جنہوں نے امام احمد کی شخصیت اور کردار کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیا، چار ہیں:

(۱) ——— خصائل حمیدہ، خواہ وہ کسبی ہوں یا خلقی،

(۲) ——— شیوخ حدیث کی توجہات اور ان کا حلقۂ درس،

(۳) ——— حیات شخصی، اور دراسات خاصہ،

(۴) ——— وہ زمانہ جس میں انہوں نے زندگی بسر کی، وہ ماحول جس میں ان کے شب و روز گذرے،

اب ان میں سے ہر ایک عامل کا ہم الگ الگ بیان کرتے ہیں تاکہ قارئین کتاب پر وہ مؤثرات ظاہر اور روشن ہو جائیں، جو اس نفس کریم پر کار فرما رہے، اور واضح ہو جائے کہ یہ ثمرات نور س نتیجہ تھے علم حدیث و اثر کا، ان کی فقہ بھی اسی اثر کی تابع تھی، اور وہ افکار جن میں علماء علم کلام زیادہ سے زیادہ غور و خوض کرتے ہیں، امام احمد کی زبان پر آ کر ایسا بیان خاص بن جاتے تھے جس کی سادگی میں حق کی جلوہ نمائی نظر آتی تھی، اور سچ پوچھیے تو یہی ان کی تفکیر اور دراسات کا خلاصہ تھا۔ اب ہم ان عوامل کا جدا گانہ طور پر ذکر کرتے ہیں:

ابن جوزی کی "المناقب" اور حلیۃ الاولیاء، اور تاریخ الاسلام ذہبی، اور طبقات ابن السبکی اور دوسری کتابوں میں بہت سے علمائے کرام کے اقوال امام احمد کی تحسین و توصیف میں منقول ہیں ہم نے صرف چند مختصر طور پر نقل کیے ہیں جسے تفصیل مطلوب ہو

امام احمد کے صفات

حضرت امام ان صفات سے متصف تھے، جو ان کی شہرت اور ہر دل عزیزی کا سبب بنیں اور ان کی بنیاد تھی اس گراں مایہ علم پر جسے اپنے بعد وہ ایک نہ مٹنے والی یادگار کی صورت میں چھوڑ گئے، جس کے باعث ان کا چرچا دیار و امصار میں پھیل گیا، ان صفات عالیہ میں کچھ تو ایسی تھیں جو موہبۂ الٰہی کی صورت میں انہیں عطا ہوئی تھیں، اور جو صرف انہی لوگوں کو ملتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے ان کے لیے پسند کرے، اور بعض صفتیں ایسی تھیں جنہیں انہوں نے مشق و تربیت سے اپنے اندر پیدا کیا تھا،

قوت حفظ و ضبط ان صفات میں پہلی، اور اہم ترین صفت ان کا قوی حافظہ تھا، قوی الحافظہ ہونا محدثین کی عام خصوصیت ہے، لیکن وہ لوگ جو مرتبۂ امامت پر فائز ہونے والے ہوتے ہیں ان کا حافظہ خاص طور پر بہت زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس صفت سے امام مالک اور امام شافعی بھی پورے طور پر متصف تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ نقہ و آثار اور استنباط و نظر کے سلسلے میں وہ ایسی گراں بہا دولت چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ موجود رہے گی۔

اور غور کیجیے تو یہ حافظہ ہی ہر علم و نظر کی اساس و بنیاد ہے، اور اللہ تعالیٰ نے امام احمد کو یہ صفت بڑی فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی تھی، اس سلسلے میں جو کثیر روایتیں ہم تک پہنچی ہیں وہ ایک دوسرے کی تائید و توثیق کرتی ہیں، اس سلسلے میں ایک روایت خود امام احمد سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:

گھر کی طرف جانے لگتے تھے تو میں ان سے تُو دِش سُن کر یاد کر لیتا تھا، جب وہ گھر میں داخل ہو جاتے تھے تو مجھے طالبانِ حدیث فرمائش کرتے تھے کہ انہیں املا کرا دوں، چنانچہ میں املا کرا دیتا تھا، اور وہ انہیں لکھ لیتے تھے۔"

امام صاحب کی قوتِ حفظ و ضبط کو ان کے ہم عصروں نے تسلیم کیا ہے، بلکہ انہیں سب سے زیادہ قوی الحافظہ مانا ہے، چنانچہ امام احمد کے ایک ہم عصر ابوزرعہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا:

"مشائخ اور محدثین میں سب سے زیادہ قوی الحافظہ آپ نے کسے پایا؟"

فرمایا: "احمد بن حنبل کو۔"

کمالِ علم صرف یہی نہیں تھا کہ امام احمد کا حافظہ ہی اچھا ہو، بلکہ وہ جو کچھ پڑھتے تھے اسے سمجھتے بھی تھے۔ وہ احادیث کے حافظ تھے۔ صحابہ و تابعین کے فتاویٰ انہیں ازبر تھے اور یہ تابعین وہ لوگ تھے جو اپنے زہد و ورع اور فقہ و افتا میں مشہور امام تھے۔ امام صاحب ان سب چیزوں کے ایسے اچھے عالم تھے کہ انہی بنیادوں پر ان کے استنباطِ مسائل کی عمارت قائم تھی۔ اپنے اس فہم کے اعتبار سے وہ اپنے عہد کے محدثین میں مرتبۂ امتیاز پر فائز تھے۔ وہ حضرات عام طور پر فقہ و درایت سے قطع نظر کر کے صرف روایت پر اکتفا کرتے تھے، گویا انہوں نے استنباطِ مسائل کا کام فقہا پر چھوڑ دیا تھا، جو فنِ استنباط میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، اور شاید ایسے لوگ امام ابوحنیفہ کی اس تشبیہ کا مصداق تھے کہ یہ "دوا ساز" ہیں اور فقہا "طبیب"۔ لیکن امام احمد ان دونوں چیزوں پر عبور رکھتے تھے۔ وہ روایت کے اگر اونچے درجے کے حافظ تھے تو فقہ آثار کی طرف بھی اُن کی خاص توجہ تھی۔

امام اسحٰق بن راہویہ امام صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں عراق میں احمد بن حنبل و یحییٰ بن معین، اور دوسرے علمائے حدیث کی مجالس میں بیٹھا کرتا تھا، ہم لوگ حدیث کو ایک طریقہ یا دو دو تین تین طریقوں سے زیرِ بحث لایا کرتے تھے، پھر جب کسی حدیث کے بارے میں میں سوال کرتا تھا کہ اس کی تفسیر کیا ہے؟ اس میں فقہ کا کون سا مسئلہ نکلتا ہے؟ تو سوا احمد بن حنبل کے سب خاموش ہو جاتے تھے۔"

اس لیے کہ وہ فنِ حدیث کے امام تھے، اور فقہ کا جہاں تک تعلق تھا، ان کے شاگرد ابراہیم حربی کہتے ہیں

"میں نے تین آدمی ایسے دیکھے کہ ان کا مثل میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں نے ابوعبید قاسم ابن سلام کو دیکھا، وہ علم کا پہاڑ تھے جس میں روح پھونک دی گئی تھی۔ میں نے بشر بن حارث کو دیکھا، میں انہیں ایسے شخص سے تشبیہ دے سکتا ہوں جو از فرق تا بہ قدم عقل ہی عقل تھے۔ میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا خدا نے ان میں اگلوں اور پچھلوں کا علم جمع کر دیا ہے"[1]

اور یہ جو اگلوں پچھلوں کا علم ان میں جمع ہو گیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حدیث اور آثارِ سلف کے حافظ تھے اور اس دور کی فقہ پر مہارت رکھتے تھے۔

دوسرا وصف، صبر و ضبط امام احمد کا دوسرا وصف جو ان اوصاف میں بہت زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور جو ان کی شہرت و ناموری کا بہت بڑا سبب ہے وہ ہے ان کا وصف صبر و ضبط، قوتِ برداشت۔ دراصل یہ وصف ان کے تمام فضائل کریمہ، اور صفاتِ عالیہ کا اساس و بنیاد ہے، اور یہ مبنی تھا قوتِ ارادی، صدقِ عزیمت اور عالی ہمتی پر۔ جس کے باعث انہوں نے اپنے جسمِ ناتواں کو آماجگاہ مصائب بنانے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ درحقیقت یہ وصف امام صاحب کا مزاج اور عادت بن گیا تھا، اس نے ان کی طبیعت میں فقر و جو، عفت و عزتِ نفس، اذیتوں کے برداشت کرنے کی سکت اور عفو و درگزر کا مادہ پیدا کر دیا تھا، یہی چیز تھی جس نے ان میں یہ امنگ پیدا کی کہ بغیر ضعف اور تھکن محسوس کیے ہوئے طلبِ علم کی راہ میں انہوں نے صحرا اور وادی، میدان اور نشیب و فراز کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کر لیں۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو سواری پر، زادِ راہ کی کمی ہوئی تو پا پیادہ۔ انہوں نے اسی طرح بصرہ اور کوفہ کا سفر کیا، یمن اور حجاز پہنچے۔ طلبِ حدیث کے سلسلہ میں بعض مقامات کے سفر کئی کئی بار کیے، راستے میں ان پر ایسی گھڑیاں بھی پڑیں کہ حمّال کی حیثیت سے کام کیا، تاکہ سدِ رمق کا بندوبست کر سکیں، کبھی اجرت پر لکھنے پڑھنے کا کام کیا، بلکہ موقعہ ملا تو کہیں کاریگری کے جوہر بھی دکھائے۔ اس لیے کہ جو لقمہ منہ میں

---

[1] ... تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المناقب لابن الجوزی، حلیۃ الاولیاء، اور تاریخ ذہبی و

جائے وہ محنت سے کمایا ہوا ہو، اور یہ سب کچھ انہوں نے نبیوں کی اقتدا اور منہاجِ صالحین کی اتباع کے جوش اور جذبہ سے متاثر ہو کر کیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ اونچا دینے والا ہاتھ، نیچے لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔ الید العلیا خیر من الید السفلیٰ۔

پھر جب وہ عالم و فاضل بن کر، شان اور شکوہ کے حامل اور مسندِ درس و افتاء پر متمکن ہوئے تو ان پر امتحان و آزمائش کی ایسی بلائے اکبر نازل ہوئی جس نے ان کے اس وصف کو اور زیادہ اجاگر کر دیا۔ انہوں نے ہر قسم کی اذیتوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیا، اور مومن صابر کی شان سے تمام دکھوں اور تکلیفوں کو جھیلا۔ مخالفین آخر میں ضرور تھک گئے، لیکن خود انہوں نے تکان محسوس کی نہ خستگی، انہوں نے ہر تکلیف انگیز کی مگر قرآن کے مخلوق ہونے کا اعتراف نہیں کیا، اس لیے کہ ایسا کہنا ان کے نقطۂ نظر سے اگر کفر نہیں تو بدعت، اسلام سے خروج نہیں تو الحاد ضرور تھا، اور اگر ان میں قوتِ ارادی، اور عزیمت کا جوہر نہ ہوتا تو ان مصائب کا برداشت کرنا ان کے لیے آسان نہ ہوتا۔

پھر جب خدا تعالیٰ نے ان پر کرم کیا، اور تشدد کا دور ختم ہوا تو انتقام کی بجائے نعمت اور دولت کا ابتلا شروع ہوا۔ حضرت امام کی سرشت کا تقاضا یہ تھا کہ اس دورِ ابتلا سے بھی وہ کامیابی کے ساتھ گزر جائیں جیسے تشدد کے دورِ ابتلا کو انہوں نے استقامت اور عزیمت کے ساتھ جھیل لیا تھا۔ اب ان کے پاس اس حالت میں کہ تنگ دست اور پریشان حال تھے، دولت کے ڈھیر عطیوں کی صورت میں لگنے لگے، وہ، ان کی اولاد، اور پوتے، کون تھا جو حاجت مند نہ تھا؟ لیکن اپنی قوتِ ارادی، صدقِ عزیمت اور عالی ہمتی سے، اس پہلے سے زیادہ کٹھن دورِ ابتلا کو بھی انہوں نے برداشت کیا، اپنی نزاہتِ نفس کی خاطر، ہر عطیہ انہوں نے نہایت سیر چشمی کے ساتھ واپس کر دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو صرف اللہ کے در کا بھکاری رکھا، اس کے کسی بندے کے مال و دولت سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ ان کا یہ جہاد، پہلے جہاد سے ہرگز کسی طرح کم نہ تھا، اگرچہ اس کی نوعیت بدلی ہوئی تھی، لیکن خدا ان سے راضی ہو، پہلے سے بھی زیادہ عالی ظرفی، بلند حوصلگی، اور استقلال کے ساتھ اس دور سے بھی گزر گئے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہمیں ماننا پڑے گا کہ امام احمد کا یہ وصف، ان کے تمام صفاتِ عالیہ میں کہیں زیادہ ممتاز اور نمایاں تھا ...

یہی ان کا طرۂ امتیاز تھا!

صبرِ جمیل امام احمد کی جس صفت صبر کا ہم نے بیان کیا ہے، یہ صبر وہ ہے جسے قرآن نے "صبر جمیل" سے تعبیر کیا ہے، جس کی حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو دعوت دی تھی، جسے خدائے بزرگ و برتر "صبر جمیل" کے نام سے یاد فرماتا ہے۔

اور صبر جمیل کیا ہے؟ ——— ایسا صبر جو شکوہ و شکایت، صدمہ و قلق سے، رنج و الم سے یکسر خالی ہو، امام احمد قدس اللہ روحہٗ کا صبر اسی طرح کا تھا، ان پر مصیبتوں اور اذیتوں کے پہاڑ ٹوٹے لیکن نہ ان کی زبان حرف شکایت سے آشنا ہوئی، نہ انہوں نے صدمہ و قلق کا اظہار کیا۔ انہوں نے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ ہر بلا جھیلی، ہر دکھ برداشت کیا، نہ طیش و غضب، نہ التجائے رحم و کرم ——

نہ ستم کا کبھی شکوہ، نہ کرم کی خواہش

دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

اس موقعہ پر ہم حضرت امام کے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہو گا کہ وہ کس ثبات و استقامت کا پیکر تھے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ اپنے دور ابتلا میں وہ کسی سلسلہ میں خلیفہ کے پاس گئے، وہاں انہیں مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ بھی وہی کہنے لگیں جو خلیفہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کی مرضی تھی، یعنی قرآن کے مخلوق ہونے کا اعتراف و اقرار، چنانچہ ان کی موجودگی میں ان کی نظر کے سامنے دو آدمیوں کی گردن قلم کر دی گئی، لیکن وہ اس لرزہ خیز منظر کے دوران میں بھی اتنے مستقل مزاج رہے کہ جب ان کی نظر امام شافعی کے ایک شاگرد پر پڑ گئی تو اس سے دریافت کیا،

"موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں امام شافعی کا کوئی قول آپ کو یاد ہے؟"

اس وحشتناک منظر میں اطمینان اور بے پروائی کی یہ بات سن کر امام احمد کے بدترین مخالف اور دشمن احمد بن ابی دؤاد نے تعجب کے ساتھ کہا:

"اس شخص کو دیکھو جو ضرب شمشیر سے اتنا قریب ہے پھر بھی فقہی مسائل میں الجھا ہوا ہے۔"

لیکن یہ امام احمد کا قوی ارادہ و عمیق ایمان اور وہ یقین تھا جو قضاء الٰہی اور مشیت خداوندی کی

حاکمی میں اپنے آپ کو تسلیم و رضا کے ساتھ دے چکا تھا، یہی وہ صبر جمیل تھا جسے انہوں نے اپنی سرشت بنا لیا تھا، یہاں تک کہ بیماری کے عالم میں بھی انہوں نے اس ڈور سے کو تسلیم و رضا کے خلاف نہ ہونے دیا اور آہ تک نہ کی!

صرف خدا پر بھروسہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ احمد کی اس قوت صبر کا راز کیا تھا؟ وہ کون سی چیز تھی جس نے ان میں یہ مادہ پیدا کر دیا تھا؟ جس نے انہیں اس قابل کر دیا کہ بڑھ کر بہادری کے ساتھ جھیلیں، اور شدائد کا خندہ جبینی کے ساتھ استقبال کریں؟ میرے خیال میں تو یہ راز صرف اتنا ہے کہ اس مرد جلیل کا صرف خدا پر بھروسہ تھا، اور اسی پر توکل۔ اللہ تعالیٰ کے سوا وہ کسی کی عظمت کے قائل نہیں تھے، چونکہ یہ بات دل میں بیٹھ چکی تھی لہٰذا ہر چیز آسان ہو گئی، شدائد اور مصائب بھی آسان ہو گئے، آفات و نوائب بھی سہل معلوم ہونے لگے، زندگی کی زینت ہیچ معلوم ہونے لگی، اس کے مناظر نظر سے گر گئے، متاع قلیل پر راضی ہو گئے، اور خدا کے لیے، خدا کے واسطے عمل کثیر سے کم پر قناعت نہ کر سکے۔

اس سرشت نے زندگی کے عام امور میں احمد کو بہت اونچا کر دیا تھا۔ نہ ان میں حسد کا مادہ تھا، نہ جذبِ انتقام، یہی وجہ تھی کہ جو لوگ ان کے ساتھ برائی کرتے تھے وہ سیر چشمی کے ساتھ انہیں معاف کر دیتے تھے، چنانچہ ایک آدمی نے ان کی غیبت کی، پھر ان کے پاس آکر عرض گزار ہوا:

"میں نے آپ کی غیبت کی ہے، مجھے معاف کر دیجیے!"

آپ نے فرمایا:

"میں تمہیں معاف کرتا ہوں، لیکن اب ایسی حرکت نہ کرنا!"

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ امام احمد نے کسی موقعہ پر امام ابو حنیفہ کی فقہ سے اختلاف منہاج کے باعث عدم توافق کا اظہار کیا، اس پر ایک متعصب شخص نے غضبناک ہو کر کہا۔

"تم جیسے بے مایہ لوگوں سے ابو حنیفہ کا پیشاب زیادہ دبیز رہے گا!"

پھر چلا گیا، لیکن تھوڑی دیر بعد وہ نادم ہو کر حاضر ہوا، اور معذرت کے لہجہ میں اس نے کہا

"جو الفاظ آپ کی خلاف شان میرے منہ سے نکلے وہ غیر ارادی تھے، میری آرزو ہے کہ آپ

امام احمد نے جواب دیا

"میں نے تو بھائی تمہیں اسی وقت معاف کر دیا تھا"

امام صاحب چونکہ صرف خدا ہی کی بڑائی کے قائل تھے، لہٰذا عامۃ الناس کے ساتھ ان کا برتاؤ تواضع اور فروتنی کا رہتا تھا، کیونکہ جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ مغرور، اور متکبر ہوتا ہے، اور اللہ سے ڈرنے والا منکسر اور متواضع ہوتا ہے۔ امام احمد کے ایک شاگرد امام مروزی ایک بڑی اچھی روایت بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"کسی کم مایہ آدمی کو میں نے کہیں بھی اتنا معزز نہیں دیکھا، جتنا ابو عبد اللہ (احمد بن حنبل) کی مجلس میں دیکھا۔ وہ ایسے لوگوں کی طرف دل و جان سے مائل رہتے تھے، اور اہل دنیا سے گریز کرتے تھے، ان میں بردباری تھی، وہ جلد باز نہیں تھے، بہت ہی متواضع تھے۔ وقار و تمکنت آپ پر چھائی رہتی تھی۔ نماز عصر کے بعد جب وہ مسند افتاء پر بیٹھتے تھے تو اس وقت تک خاموش رہتے تھے، جب تک ان سے کچھ سوال نہ کیا جائے۔ جب مسجد میں جاتے تھے تو آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، بلکہ جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جاتے تھے"

نزاہت نفس وایمان

حضرت امام کا تیسرا وصف جس میں آپ ممتاز تھے، وہ نزاہت تھی، اس کے اشکال و صور مختلف اور متعدد مظاہر کے حامل تھے، آپ بڑے خوددار تھے، کسی دوسرے کا مال قلیل یا کثیر کسی صورت میں بھی لینا وہ پسند نہیں کرتے تھے، اس اعتبار سے وہ عفت کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز تھے، دوسرے اس کے ساتھ ہی آپ میں نزاہت ایمان بھی تھی، انہوں نے اپنے افکار و معتقدات پر کسی کی فرماں روائی بھی تسلیم نہیں کی، انہوں نے کوئی ایسی بات منہ سے نہیں نکالی، جس پر ان کا اعتقاد نہ ہو، نہ انہوں نے وقت گزاری کے لیے ایچ پیچ سے کام لیا اگرچہ ان کے سر پر انہیں مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے لیے تلوار ہی کیوں نہ لٹک رہی ہو۔ وہ اس پر تو راضی ہو گئے کہ کوئی خلاف عقیدہ بات نہ کہہ کر شدائد اور مصائب برداشت کر لیں، لیکن دین کے معاملہ میں پستی اور مداہنت کے مظاہرہ پر وہ کبھی اور کسی صورت میں راضی نہیں ہوئے، تیسری چیز نزاہت عقل تھی، وہ اپنے آپ کو اس پر بھی کبھی آمادہ نہیں کر سکے کہ جن امور و مسائل پر سلف صالح نے غور و خوض نہیں کیا، یا غور و خوض کرنا مناسب نہیں سمجھا، ان پر وہ غور و خوض کریں، اپنی فقہ میں بھی وہ اسی مسلک پر عامل تھے، ان کی نزاہت عقل کی ایک مثال یہ تھی کہ جس مسئلہ میں انہیں صحابہ میں سے کسی کا فتویٰ نہیں ملتا تھا، وہ بھی اس میں فتویٰ نہیں دیتے تھے، بلکہ اگر یہ دیکھتے تھے کہ کسی مسئلہ میں صحابہ کے افکار و آرا مختلف ہیں، تو وہ ان کے اقوال کا موازنہ بھی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان میں سے کوئی قول اختیار کر لیتے تھے۔ اس روشنی میں جو فکر مستقیم اور قیاس دقیق کی بنیاد پر ان کی رہنمائی کرتی تھی، امام احمد کا اس بارے میں مسلک یہ تھا کہ اگر کوئی نص موجود نہ ہو، یا حدیث صحیح دستیاب نہ ہو، اور صحابۂ کرام کے اقوال ایک سے زائد ہوں تو اختیار ہے کہ ان میں سے جس قول پر چاہے عمل کرلے، اور جب ان اقوال متعددہ میں سے کوئی قول نص سے قریب نہ نظر آئے تو پھر نزاہت فکر، اور نزاہت فقہ کا اقتضا یہ ہے کہ سلف صالح کا اتباع مطلق طور پر کیا جائے۔ اور اتباع مطلق کی شان یہ نہیں ہے کہ کسی قول کی تصویب اور کسی کی تغلیط کی جائے، اس لیے کہ صحابہ میں سے ہر ایک جو کچھ کہتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ماخوذ ہے!

گدازِ قلب کیونکر پیدا ہوتا ہے؟

یہی تھی وہ نزاہت مطلقہ جس سے اس امام جلیل کے نفس اور شخصیت کی تعمیر ہوئی، اس کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کی عفتِ نفس اور نزاہتِ طبع حدِ بیان سے باہر تھی، یہاں تک کہ انہوں نے اپنی ذات اور نفس کے لیے بعض حلال چیزیں بھی ترک کر رکھی تھیں، وہ خلفا کے عطایا قبول نہیں کرتے تھے، حالانکہ اپنے صاحبزادے سے وہ اس کی تصریح کر چکے تھے کہ یہ عطایا حلال ہیں، اور ان سے حج بھی صحیح ہے، لیکن صرف تنزیہ نفس کے لیے، نہ کہ حرمت کے باعث اپنے لیے انہوں نے ان چیزوں کو ترک کر رکھا تھا۔

حضرت امام نے اپنے اوپر جو یہ سختی اور تنگی اختیار کر رکھی تھی یہ وقارِ نفس کی بنا پر تھی، حتیٰ کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں کھاتے تھے جو ان کے ہاتھ کی کمائی ہوتی، یا ان کی موروثی جائداد کے نفع اور کرایہ کی نہ ہو، لہٰذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ زاہد تھے، لیکن ان کے زہد کی بنیاد طیباتِ حیات سے نفرت پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد طلبِ حلال تھی، وہ کوئی ایسا مال نہیں قبول کرتے تھے جو ذرا بھی مشکوک اور مشتبہ ہو، جس کے قبول کرنے سے ان کی نزاہت اور عزتِ نفس پر حرف آتا ہو، یا بندگانِ خدا میں سے کسی کا ممنونِ کرم بننے کی صورت پیش آتی ہو۔

وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ زہد ہی ہے جو دل میں گداز اور نفس میں رقت پیدا کرتا ہے لہٰذا اس زہد کا مقصود یہ نہیں کہ حلال چیزیں حرام کر لی جائیں، بلکہ یہ تھا کہ نفس کو پستی اور دناءت سے بچایا جائے۔ چنانچہ ابو حفص عمر بن صالح الطرسوسی سے منقول ہے۔ انہوں نے کہا:

”میں ایک مرتبہ ابو عبداللہ (احمد بن حنبل) کے پاس گیا، اور ان سے سوال کیا کہ

”گداز قلب کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟“

یہ سن کر آپ نے اپنے اصحاب کی طرف دیکھا، پھر تھوڑی دیر تک سر جھکائے رکھا، پھر سر اٹھایا اور فرمایا۔

”بیٹا گداز قلب صرف اکل حلال سے پیدا ہو سکتا ہے!“

اس کے بعد میں ابو نصر بشر بن حارث کے پاس گیا، ان سے بھی میں نے وہی سوال دریافت کیا، انہوں نے کہا،

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد) — دیکھو! خدا کے ذکر ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں؛

میں نے عرض کیا، ابھی ابھی میں ابو عبداللہ کے پاس سے آ رہا ہوں، فرمایا تو بتاؤ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کیا کہا؟ میں نے کہا وہ تو فرماتے ہیں گداز قلب اکل حلال سے پیدا ہوتا ہے، کہنے لگے، بڑے پتے کی بات کہی، پھر میں عبدالوہاب بن ابی الحسن کے پاس گیا، ان سے بھی میں نے وہی سوال کیا، جواب میں انہوں نے کہا، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

میں نے عرض کیا، میں یہی پوچھنے ابو عبداللہ کے پاس بھی گیا تھا، یہ سنکر فرط مسرت سے ان کے رخسار سرخ ہو گئے، اور دریافت کیا ”تو انہوں نے کیا جواب دیا؟“

میں نے کہا ”وہ تو اکل حلال کو گداز قلب کا سبب بتاتے ہیں، یہ سنکر فرمایا

”انہوں نے تمہیں وہ چیز بتائی جو اصل اور جوہر ہے، یہی اصل ہے جیسا کہ انہوں نے کہا، یہی اصل ہے جیسا کہ انہوں نے فرمایا۔“!

... کا کیا عالم تھا؟ وہ

حلال کی جستجو میں رہتے تھے، حلال ہی کھاتے تھے، ہر مشتبہ چیز کو خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ترک کر دیتے تھے، صرف انہی چیزوں پر اکتفا کرتے تھے، جو غیر مشکوک اور غیر مشتبہ ہوں، گو وہ کم ہی کیوں نہ ہوں، اور دائرۂ حلال میں کوئی شبہ نہیں وہ زندگی کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان لوگوں سے مانوس ہو جاتے تھے جو اصحاب رفق و مروت ہوتے تھے، فرمایا کرتے تھے:

”کھانے کا لطف تین طرح کے آدمیوں کے ساتھ ہے، بھائیوں کے ساتھ بہ مسرت، فقراء کے ساتھ بہ ایثار، اور ابنائے دنیا کے ساتھ بہ مروت؟“

امام احمد دوستی، اور دوستوں کو پسند کرتے تھے، دوستی کے گہرے اور دقیق معنی کے رمز آشنا تھے، وہ جانتے تھے، سچے اور مخلص دوستوں کے بغیر زندگی ہیچ اور بے مزہ ہے، فرمایا کرتے تھے، ”جب کسی شخص کے دوست مر جائیں تو وہ ناکارہ ہو جاتا ہے“!

اور اکل حلال کے طور پر، جو کچھ تھوڑا بہت انہیں حاصل تھا، وہ ان کے جود و سخا کا مصرف بن جاتا تھا، وہ فرمایا کرتے تھے اگر دنیا اتنی قلیل ہے کہ اسے کوئی مسلمان شخص بقدر ایک لقمہ کے حاصل کر سکے، اور اس لقمہ کو وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کے منہ میں رکھ دے تو اسے مسرف نہیں قرار دیا جا سکتا۔“! یہ ہے سخاوت و جود کی انتہا!

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ حلال خالص پر اکتفا کرنا، جو ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک صاف ہو، انسانیت کا سب سے بلند تر مرتبہ ہے، اور اس پر صرف وہی لوگ فائز ہو سکتے ہیں جو شدائد برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، امام احمد کا یہ خیال بھی تھا کہ انسان کی قوت حقیقی، تن اور جسم کی قوت ہی نہیں ہے، بلکہ نفس پر قدرت اور اقتدار اور صرف اکل حلال پر اکتفا ہے، ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا گیا، فتوت کی تعریف کیا ہے، فرمایا ”اس چیز کا ترک جو تمہارا منتہائے آرزو ہو“ یعنی ہوا و ہوس، اور خواہش و آرزو پر مکمل اقتدار، اور قوت عزیمت ہی اصل قوت ہے، یہی وہ قوت ہے جس سے انسان کو متصف ہونا چاہیے، تاکہ وہ جملہ حیوانات پر امتیاز حاصل کر سکے۔

نزاہت عقل و عقیدہ

اب رہی نزاہت عقل اور نزاہت ایمان تو اس سلسلہ میں وہ مواد کافی ہے جو ہم حضرت امام کے دور ابتلاء امتحان و آزمائش کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ کس طرح انہوں نے آفات و مصائب کا مقابلہ صبر سے کیا، کس طرح مجاہدۂ نفس سے

عہدہ برآ ہوئے ؟ آپ نے یہ بھی دیکھ لیا، کہ خلفاء کے جبر و تشدّد کے مقابلہ میں تقیہ سے کنارہ کشی کرکے کس طرح انہوں نے اپنے ایمان کی نزاہت قائم رکھی ؟ اس لیے کہ یہ وہ منزل ہے جہاں وہی لوگ پڑاؤ کر سکتے ہیں جو ایمان و یقین کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ شدائد برداشت کر سکتے ہوں، اس منزل سے گریز وہی لوگ کرتے ہیں جو کمزور اور قوتِ صبر و برداشت سے محروم ہوں، لیکن صاحبانِ عزیمت اپنے ایمان کو ان کمزوریوں سے پاک رکھتے ہیں اور لوگ ایمان کے سلسلہ میں مختلف درجات پر فائز ہیں اور ہر مومن صرف اپنی قوت و طاقت اور صلاحیت و استعداد ہی کے بقدر مکلّف کیا گیا ہے۔

متکلمین سے اجتناب

امام احمد اپنی نزاہت عقل و ایمان کے باعث اہل اہواء و بدع سے جدال و مناظرہ اور بحث و گفتگو سے دور رہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ جدل و مناظرہ کے دوران میں بھی دونوں رزم آرا ایک دوسرے کے افکار و آراء سے متاثر ہوتے ہیں جس طرح امراض جسمانی اختلاط و احتکاک سے، ایک دوسرے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اصحاب کو جدل و مناظرہ سے روکا کرتے تھے، تاکہ ایمان کی نزاہت قائم رہے۔ اور شک و ریب سے زیادہ سے زیادہ دوری رہے۔

ایک مرتبہ آپ کے ایک شاگرد نے ان سے سوال کیا کہ "یہاں ایک شخص ہے جو جہمیہ سے مناظرہ کرتا ہے اور ان کی لغزشیں و انکشاف کر دیتا ہے، اور ان کے مسائل پر بڑی گہری نظر رکھتا ہے، آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں ؟" اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

"میں اس طرح کی باتوں پر بحث و گفتگو پسند نہیں کرتا، اور نہ اسے مناسب سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی ان سے مناظرہ کرے، کیا معاویہ بن قرہ کا یہ قول تمہیں یاد نہیں کہ خصومات سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، اور کلام ایک بیکار فن ہے جس میں خیر کا کوئی پہلو نہیں، تمہیں اہلِ جدال اور اہلِ کلام سے بچنا چاہیے، اور سنتِ نبوی کا دامن مضبوطی سے تھامے رہنا چاہیے، تم سے پیشتر جو اہلِ علم تھے وہ بھی فنِ کلام کو ناپسند کرتے تھے، اور اہلِ بدعت کے مسائل پر غور و خوض کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بلاشبہ سلامتی ان چیزوں کے ترک کر دینے میں ہے، لہٰذا کسی طرح بھی جدال اور خصومات کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔

کنارہ کشی اختیار کر لو۔[1]

ایک مرتبہ کسی شخص نے ایک خط لکھ کر اہلِ کلام سے مناظرہ، اور ان کے ساتھ نشست برخاست کرنے کے سلسلہ میں سوال کیا، اس کے جواب میں امام احمد نے حسبِ ذیل خط املا کرایا:۔

"خدا تمہاری عاقبت سنوارے، ہم نے جو کچھ سنا ہے، اور جو کچھ پایا ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف فنِ کلام کو ناپسند کرتے تھے، اور اہلِ زیغ و بدعت کے ساتھ نشست برخاست کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، اصل بات جو ہے وہ تسلیم و رضا ہے کتاب و سنت کے سامنے، اس سے تجاوز کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اسلاف دین میں ہر نئی چیز کو، اور بدعتیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کو ناپسندیدہ سمجھتے رہے ہیں کہ دین کے نام سے جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تاثر نہ پیدا ہو۔"[2]

اس طرح امام احمد کا مسلک گویا وہی تھا جو امام مالکؒ کا تھا۔ امام مالک معاملاتِ دین میں جدل و مناظرہ کا طریقہ ناپسند کرتے تھے، اور ان چیزوں کو دین کی حقیقت اور مغز کے خلاف قرار دیتے تھے، اور بلاشبہ یہ اہلِ جدل وہ لوگ ہیں جنہوں نے لوگوں کو امورِ دین میں مبتلائے فساد کر دیا ہے، پس یہی وہ راستہ تھا جس پر امام احمد گامزن رہے۔

لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا یہ مسلک نہیں تھا، چنانچہ امام ابو حنیفہ، جہمیہ وغیرہ سے مجادلہ و مناظرہ کرتے تھے، ان کے دلائل کا تار و پود بکھیرتے تھے، اور ان کے لیے راہِ فرار بند کر دیتے تھے، اور امام شافعی تو بہت قوی الجدل تھے، حریفِ مقابل کا پوری شدت کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے، لیکن طلبِ حق کے لیے، نہ کہ محض غلبہ حاصل کرنے کے لیے۔ چنانچہ ان کی تصانیف عمدہ اور معقول قسم کے مناظرہ کی اعلیٰ مثال ہیں۔

نزاہتِ فقہ

اب رہی نزاہتِ فقہ، تو اس معاملہ میں ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اس بات کے حریص تھے کہ ہر مسئلہ سنتِ نبوی سے نکالیں، اپنی ساری فقہ میں وہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام ہی کی پیروی کرتے ہیں، دوسرے افکار و آراء سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، ان کی فقہ کی بنیاد وہ مسائل تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور صحابہ و تابعین سے مروی تھے۔

---

[1] تاریخ المذاہب الاسلامیہ / الفقہ بحوالہ مسند ص ۲۲ طبع معارف مصر
[2] ایضاً

وہ اس بات کے بڑے حریص تھے کہ اپنی فقہ میں کسی ایسی حدیث کو رد نہ کریں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت دی گئی ہو، سوا اس صورت کے کہ کوئی دوسری حدیث پہلی سے قوی مل گئی ہو۔ وہ فرمایا کرتے تھے :—

"جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث رد کرتا ہے وہ ہلاکت کے کنارے کھڑا ہے۔"

وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے :

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث نہیں لکھی جس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔"

اور جب کبھی ایسی مشکل پیش آتی کہ حدیث یا سنت نہ ملتی، تو تخریج مسائل کے سلسلہ میں وہ اجتہاد سے کام لیتے تھے، لیکن یہ اجتہاد منہاجِ سلف پر ہوتا تھا، بدعت سے بری اور تغیر راہ سے الگ، وہ ایسے اجتہاد سے رو کتے تھے جس کے بارے میں سابق میں کہیں کوئی قول نہ ملتا ہو یا اسلاف میں سے کسی کا نقشِ قدم نظر نہ آتا ہو، چنانچہ وہ اپنے شاگرد ابن رشید سے فرمایا کرتے تھے :

"خبردار، کسی ایسے مسئلہ میں سخن طرازی نہ کرنے لگنا جس میں تمہارا کوئی امام اور رہبر نہ ہو۔"

اس طرح آپ نے دیکھ لیا کہ امام احمد اس بات کے حریص تھے کہ اپنی فقہ کو دائرۂ سنت سے خارج نہ ہونے دیں، اور اسے ان بندھنوں میں جکڑے رہیں جن کی پروا دوسرے حضرات اپنی فقہ کے سلسلہ میں نہیں کرتے تھے۔

صفتِ اخلاص

امام احمد کی وہ چوتھی صفت جس میں وہ اپنے اقران و اماثل کے اندر امتیاز خاص رکھتے ہیں وہ ہے ان کی صفتِ اخلاص، اور حقیقت کی طلب میں اخلاص ، کا وجود نفس کو شائبۂ اغراض سے پاک کر دیتا ہے، بصیرت کی روشنی بڑھ جاتی ہے، ادراک میں استقامت پیدا ہو جاتی ہے، قلب نورِ حق و ہدایت سے جگمگا اٹھتا ہے، امام احمد سے قبل تین شخص اور گزرے ہیں جو اجتہاد فقہی میں درجۂ امامت پر سرفراز تھے، یہ سب کے سب اس صفت میں شریک تھے اور

سے معمور ہو، اس لیے کہ خدا کے ساتھ اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ پسند اور ناپسند کا معیار خدا کی خوشنودی اور ناخوشنودی بن جائے، علم کی طلب، جدال و رزم کے لیے نہ ہو، نہ مجلس طرازی کے لیے ہو، نہ صاحبان جاہ و تمکین کی نظر میں اعزاز و منزلت پیش نظر ہو، پس جو شخص علم کی جستجو میں اس طرح حظ کرے کہ ان مزخرفات اور لغویات پر متوجہ نہ ہو، بلکہ فکر مستقیم کے ساتھ حقیقت کی طرف متوجہ رہے، جس میں کوئی کجی نہ ہو، گمراہی نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ جو شخص حق کی طلب اس طرح کرے گا، تو وہ نور الہٰی کی روشنی میں اس تک پہنچ جائے گا، ہدایت الہٰی کے باعث جو کچھ کہے گا وہ کلمۂ حکمت ہو گا، اور اپنے مقصود تک وہ قریب ترین راستہ سے پہنچ کر راہ ہدایت پر گامزن ہو جائے گا۔

خدائے بزرگ و برتر نے امام احمد کو علم کتاب و سنت کی تحصیل و طلب کے سلسلہ میں اخلاص کی نعمت سے مالا مال کیا تھا، یہ علم انہوں نے جاہ و دنیا، اور شہرت و ناموری کے لیے نہیں حاصل کیا تھا، وہ ایسی چیزوں سے متنفر تھے، ان کی تمنا تھی کہ لوگوں میں ان کا چرچا ہو نہ تذکرہ، ریا و نمائش سے وہ دور دور رہتے تھے، حتی کہ یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں بلکہ اسے وہ ایک طرح کی ریاکاری سمجھتے تھے، وہ اسے ترجیح دیتے تھے کہ کوئی ان کا نام بھی نہ لے، وہ فرمایا کرتے تھے۔

"میں چاہتا ہوں مکہ جا کر وہاں کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ رہوں تاکہ میرا کسی کو پتہ نہ چلے۔"

اس مرتبہ بلند پر پہنچ جانے کے باوجود وہ چاہتے تھے کہ ان کا چرچا کم سے کم ہو، فرمایا کرتے تھے۔

"وہ شخص کتنا اچھا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شہرت نہیں دی؟"

امام احمد کی زندگی ان خیالات کی عملی تفسیر تھی۔ آپ ہضم نفس اور تواضع کے طبیعت پر زیادہ غلبے کی بنا پر اپنی بہت عبادت کو نہایت ہی کم خیال کرتے تھے، اور حق تعالیٰ کی راہ میں اٹھائی ہوئی اذیتوں اور شدائد و مصائب کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ اپنے "محنتی وہ" کا ذکر نہ کرتے، بلکہ اس کے علامات تک کو مخفی رکھتے، اور یہ بات پسند نہ فرماتے کہ لوگوں کو اس کا علم ہو۔ غرض کہ آپ فخر سے دور، عجب سے الگ، اور اپنی کوئی خوبی جتانے سے غایت درجہ محترز تھے۔

[illegible]

"میں نے احمد بن حنبل جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا، پچاس سال تک میں ان کا ہم جلیس رہا، اس طویل مدت میں اپنے صلاح و خیر کے برتنے پر ہم میں سے کسی پر بھی انہوں نے فخر اور گھمنڈ کا اظہار نہیں کیا۔"

ہیبت اور جلالت شان

امام احمد کا پانچواں وصف جس نے انہیں ممتاز اور نمایاں کر رکھا تھا، ہیبت تھی، ان کی ہیبت اور جلالت شان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے اساتذہ تک کی یہ کیفیت تھی کہ گو وہ اپنے تلامذہ سے عام طور پر ہنسی مذاق کی باتیں کر لیا کرتے تھے، لیکن احمد کی موجودگی میں اس سے اجتناب کرتے تھے اور اگر نادانستہ طور پر کبھی ایسا ہوا تو اپنے دوسرے شاگردوں کو ڈانٹتے تھے کہ انہوں نے امام احمد کی موجودگی سے باخبر کیوں نہیں کیا کہ وہ ان کی موجودگی میں ایسا نہ کرتے،

پولیس کے سپاہی تک جوان کی نگہداشت پر مامور تھے، [illegible] کی ہیبت سے وحشت زدہ رہتے تھے، روایت ہے کہ ایک سپاہی اپنے فرض کی بجا آ[illegible]ات کو انہیں آواز دینے کے لیے گیا، لیکن دہشت کے باعث ان کا دروازہ نہ کھٹکھٹا سکا۔ ان کے چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور اپنے آپ کو ان کی بارعب ملاقات سے مانوس کرنے کے بعد چچا کے دروازے سے گزر کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اور جہاں تک امام احمد کے شاگردوں کا تعلق ہے وہ تو بہت زیادہ ان سے مرعوب اور دہشت زدہ رہتے تھے، اگرچہ خود ان کا برتاؤ اپنے تلامذہ کے ساتھ رفق و الفت کا تھا۔ چنانچہ ایک شاگرد کا بیان ہے:۔

"ہم اس بات سے خوف زدہ رہتے تھے کہ احمد کی کسی بات کا رد کریں، یا کسی بات پر ان سے حجت کریں؟"

امام صاحب کے ایک ہم عصر کا بیان ہے:

"میں اسحٰق بن ابراہیم اور فلاں فلاں سلاطین سے ملا، لیکن میں نے احمد سے زیادہ بارعب کسی کو نہیں دیکھا۔ میں ان کے پاس اس لیے گیا تھا کہ ان سے کچھ بات چیت

کروں گا، لیکن جیسے ہی میں نے انہیں دیکھا دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔"

ابوعبیدہ قاسم بن سلام ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ابو یوسف، محمد بن الحسن، یحییٰ ابن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی کی مجالس میں بیٹھنے کے مجھے مواقع ملے۔ ان میں سے کسی سے بھی میں اتنا مرعوب اور دہشت زدہ نہیں ہوا جتنا احمد بن حنبل سے۔

لیکن اس جلال و ہیبت کے باوجود امام احمد حسن معاشرت کے حامل تھے، نہ ان میں تند خوئی تھی، نہ درشت مزاجی، خوش باش، خوش مزاج، کریم الخلق، خوش معاملہ، نرم دم گفتگو، پیکر شرم و حیا، وہ خدا سے بھی حیا کرتے تھے جتنا اس کا حق ہے، اور لوگوں سے بھی، نہ وہ ان سے نفرت کرتے تھے، نہ جھگڑا، ایک شخص نے جو ان سے ملا تھا، ذیل کے الفاظ میں ان کی تصویر کھینچی ہے:۔

"احمد کے عہد میں ان کے سوا میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو ان سے زیادہ صاحب دیانت و امانت ہو، جو ان سے زیادہ اپنے نفس پر اقتدار رکھتا ہو، حامل فقہ ہو، ادب نفس جس کی سرشت ہو، اخلاق بزرگانہ سے متصف ہو، ثبات قلب کی دولت رکھتا ہو۔[1]"

ایک اور اعتراف یہ ہے:۔

"احمد لوگوں میں سب سے زیادہ باحیا، بہت زیادہ کریم النفس اور ادب و حسن معاشرت کے حامل تھے، برائیوں اور لغویتوں سے مجتنب رہتے تھے، نظر نیچی، سر خمیدہ، حدیث، ذکر صالحین، تذکرہ زہاد کے سوا ان کے لب کسی اور بات سے آشنا نہ ہوتے تھے، جو ان سے ملتا خوش ہوتا، وہ اس سے خندہ پیشانی سے پیش آتے، بزرگوں کی تواضع بہت زیادہ کرتے، ان کا احترام کرتے اور زیادہ سے زیادہ ان کی بزرگ داشت میں انہاک کا اظہار کرتے تھے۔[2]"

یہ تھے امام احمد کے اخلاق و عادات، امام احمد نے رسالت مآب کا راستہ اختیار کیا، اسی کی روشنی میں بڑی کی، اور خدائے بزرگ و برتر کے اس ارشاد پر عمل کیا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب)

یعنی رسول اللہ کی زندگی تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔

---

[1] المناقب ص۲۱۴ [2] المناقب ص۲۱۵

امام احمدؒ کے شیوخ اور اساتذہ

حافظ ہشیمؒ ——— امام شافعیؒ

امام احمدؒ کے شیوخ اور اساتذہ میں ان تمام لوگوں کا شمار ہے، جن سے انہوں نے فقہ کا فن یا سنت نبوی کا علم حاصل کیا، یا کوئی حدیث روایت کی، خواہ ان کی مجلس درس میں پہنچنے کے لیے انہوں نے سفر اختیار کیا ہو، یا وہ ان کے شہر بغداد میں مقیم ہوں۔ حافظ ابن جوزی نے اپنی کتاب "المناقب" میں ان کے شیوخ کی جو تعداد گنائی ہے وہ کم و بیش سو تک پہنچتی ہے۔ جب شیوخ واتنی زیادہ ہے، لہٰذا ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان سب نے امام احمد کو متاثر کیا، پس ہم چند ہی خاص اساتذہ کے ذکر پر اکتفا کریں گے، جس طرح امام ابوحنیفہ کے شیوخ کے ذکر کے سلسلہ میں یہ کافی ہے کہ حماد اور ان کے شیخ ابراہیم نخعی کا ذکر کر دیا جائے، یا حیات امام شافعیؒ کے سلسلہ میں یہ کفایت کرتا ہے کہ امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہ کو زیر بحث لے آیا جائے، اسی طرح امام احمد کی حیات علمی کے سلسلہ میں بھی اتنا کافی ہے کہ ان اساتذہ کا ذکر کیا جائے جنہوں نے ان کے شوق حدیث کی نشوونما کی، یا جن کے فیض صحبت سے ان میں فقہ کا ذوق پیدا ہوا، اس اصول کو پیش نظر رکھنے کے بعد ہمیں دو شخصیتیں ایسی نظر آتی ہیں، جنہوں نے امام احمد میں علم حدیث نبوی کا ولولہ اور فقہ کا ذوق و شوق پیدا کیا، یہی وہ دو شخصیتیں ہیں جن کا رنگ امام احمد کی شخصیت میں رچ گیا، یہاں تک کہ بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، کوئی یہ سمجھنے لگا کہ وہ صرف فقیہ ہیں، اور کوئی یہ سمجھنے لگا کہ وہ صرف عالم سنت ہیں، فقہ سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔

ان میں سے پہلی شخصیت حافظ ہشیم ابن بشیر بن ابی حازم کی ہے، امام احمد سولہ سال کی عمر میں

ہشیم کے پاس پہنچے، اور چار (اور ایک دوسری روایت کے مطابق پانچ) سال تک ان کے حلقۂ درس میں شریک رہے، اور فن حدیث میں عبور حاصل کر لیا، احمد نے ہشیم سے، اور بغداد کے دوسرے محدثین اور شیوخ حدیث سے روایت کی، لیکن ہشیم وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے اس چار، پانچ سال کی مدت میں ان کی زندگی پر غیر معمولی اور گہرا اثر ڈالا۔

حافظ ہشیم | ہشیم سنہ ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۸۳ھ میں وفات پائی، انہوں نے بعض تابعین مثلاً عمرو بن دینار اور زہری وغیرہما سے علم حدیث حاصل کیا، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے آثار پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے۔ بغداد میں ان کے گرد طالبان حدیث کا ایک حلقہ جمع ہو گیا۔ امام احمد جب ان کی طرف متوجہ ہوئے تو اس حلقہ کا انہیں سرگروہ پایا۔ وہ اسلام کی روح اور تعلیمات کا بڑا دل آویز پیکر تھے۔ امام احمد کے مزاج اور طبیعت پر ان کا بہت گہرا اثر پڑا۔ کیفیت یہ تھی کہ ان کی جلالت و ہیبت کے باعث ساری مدت طالب علمی میں دو ایک مرتبہ سے زیادہ کوئی بات نہیں پوچھی۔ وہ درس حدیث کے اثنا میں لا الٰہ الا اللہ، سبحان اللہ والحمد للہ کا ورد کیا کرتے تھے۔ جب وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے تھے تو وفور تاثر سے ان کی آواز بلند ہو جاتی تھی، گویا وہ جلال خداوندی کا ذکر کر رہے ہیں، اور یہ ذکر ان کے نفس و قلب پر چھایا ہوا ہے۔

حافظ ہشیم نے یہ علم حاصل کرنے میں بڑے دکھ جھیلے تھے اور بڑی مشقتیں گوارا کی تھیں، احمد نے ان سے صرف علم حدیث ہی نہیں حاصل کیا تھا، بلکہ راہ علم میں مشقتوں کا جھیلنا اور تکلیفوں کا اٹھانا بھی سیکھا تھا۔

حافظ ہشیم بخارا کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد واسط میں مقیم تھے۔ روایت ہے کہ حجاج بن یوسف کے باورچی تھے۔ پھر جب ان کا خاندان بغداد آ گیا تو اس فن میں اور زیادہ انہوں نے مہارت حاصل کر لی۔ مچھلی خاص طور پر کئی طرح سے پکاتے تھے۔ اس میں پُر لطف جدتیں کی تھیں۔ جب ان کے بیٹے ہشیم نے خاندانی ڈگر سے ہٹ کر اپنے لیے علم کا راستہ تجویز کیا تو یہ اس خاندان میں بالکل نئی اور پہلی بات تھی، باپ نے بیٹے کو علم حاصل کرنے سے روکا، ملامت کی، ڈانٹ ڈپٹ کی۔ لیکن بیٹے پر علم کا نشہ چڑھ چکا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ ہر ملامت کو برداشت کرتا، اور ایک مجاہد کی شان سے طلب حدیث کی راہ میں [illegible] کرتا تھا۔

حافظ ہشیم قاضی وقت، ابو شیبہ کی مجلس درس میں پابندی سے شریک ہوتے اور فقہ کی تحصیل و تکمیل کرتے رہتے، ایک مرتبہ یہ بیمار ہو گئے، اور مجلس درس میں حاضر نہیں ہوئے، ابو شیبہ کو فکر ہوئی انہوں نے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا، بیمار ہیں، اپنے شاگردوں سے کہا

"چلو ہشیم کی عیادت کر آئیں چل کر۔"

تمام اہل مجلس کھڑے ہو گئے، اور قاضی کے ساتھ ہشیم کی عیادت کے لیے بشیر طباخ کے گھر پہنچے۔ جب قاضی صاحب فرض عیادت سے فارغ ہو کر اپنے شاگردوں کے ساتھ واپس چلے گئے تو بشیر نے اپنے بیٹے ہشیم سے کہا،

"میرے بچے، میں تجھے طلب حدیث سے منع کیا کرتا تھا، لیکن آج سے اپنی ممانعت واپس لیتا ہوں۔ قاضی ابو شیبہ جیسا شخص اور میرے دروازے پر — بھلا میں اس کی آرزو بھی کر سکتا تھا کبھی؟"

اس کے بعد ہشیم طلب حدیث کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس سلسلہ میں متعدد سفر کیے۔ سب سے پہلے وہ مکہ پہنچے، اور وہاں زہری کی شاگردی اختیار کی، ان سے تقریباً سو حدیثیں حاصل کیں۔ (ایک روایت کے مطابق تین سو حدیثیں حاصل کیں) پھر وہ بصرہ اور کوفہ پہنچے، اور ان کے علاوہ بھی کئی شہروں کا سفر طلب حدیث کے لیے کیا، اور رجال حدیث سے یہ علم حاصل کیا۔ طلب و تحصیل کا کام اتنی استقامت کے ساتھ کیا کہ وہ ایک خاص منزلت کے حامل ہو گئے، اور پھر بغداد میں رئیس فن حدیث بن کر وہ بیٹھ گئے، ان کے گرد ایک حلقہ جمع ہو گیا۔ یہاں اگرچہ کچھ لوگ ان کے مخالف بھی تھے جیسے وکیع، جنہیں ہشیم کی یہ منزلت گراں گزری، اور انہوں نے اس مرتبہ سے انہیں گرانے کی بھی کوشش کی، بلکہ تدلیس سے بھی دریغ نہیں کیا، لیکن وہ جس مقام پر پہنچ چکے تھے وہ بہت اونچا تھا، اس سلسلہ میں یہ جان لینا کافی ہے کہ ان کے حواریوں میں مالک بن انس جیسے لوگ شامل تھے، حماد بن زید کہتے ہیں:

"محدثین میں میں نے ہشیم سے زیادہ بلند پایہ کوئی اور شخص نہیں دیکھا، بعض محدثین تو انہیں امام حدیث سفیان ثوری پر بھی فضیلت دیتے تھے، امام مالک بن انسؒ ان کی بہت زیادہ توصیف کرتے تھے، وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے تھے کہ عراق میں ہشیم کے علاوہ بھی کوئی عالم حدیث ہے"

وہ فرماتے تھے، کیا اس واسطی (ہشیم) سے بڑھ کر بھی عراق میں کوئی محدث ہے؟[1]

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

جب ہشیم اس منزلت کے حامل تھے کہ اور جمہور محدثین کی نظر میں ان کی اس درجہ وقعت تھی، یہاں تک کہ امام مالک جیسا امام جلیل بھی ان سے روایت کرتا تھا، تو احمد کے لیے اُن کی مجلس درس سے بڑھ کر اور کونسی جگہ موزوں اور مناسب ہو سکتی تھی؟ چنانچہ اپنے وقت کے اس بہت بڑے امام حدیث کی بارگاہ میں احمد پہنچے، اور زانوئے شاگردی تہ کر کے بیٹھ گئے۔ امام احمد کی سیرت اور شخصیت پر سب سے زیادہ اثر انداز جو ذات ہوئی وہ ہشیم ہی کی ذات گرامی تھی، وہ جو کچھ استاذ کی زبان سے سنتے تھے اسے ازبر کر لیتے تھے، چنانچہ وہ خود فرمایا کرتے تھے:۔

"میں نے ہشیم سے جو کچھ سنا وہ سب ان کی زندگی میں ازبر کر لیا۔"

اگرچہ امام احمد کا حافظ ایک خداداد نعمت تھی، لیکن مرویات ہشیم کا ازبر کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے دل میں اپنے جلیل القدر استاذ کی کتنی منزلت تھی، یہی منزلت تھی جس نے سرتاسر حدیث کی طلب و تحصیل کے لیے وقف کر دیا تھا، اور بالآخر وہ سنت اور فقہ کے امام بن گئے۔

امام احمد نے حافظ ہشیم سے حدیث زیادہ سیکھی، اور فقہ کم، ضروری تھا کہ اس کوتاہی کی تلافی وہ کسی دوسری شخصیت کی بارگاہ فضل و کمال میں حاضر ہو کر کرتے، یہ شخصیت انہیں امام شافعی رحمۃ اللہ عنہ کی صورت میں حاصل ہوئی، چنانچہ ہشیم کی وفات کے بعد وہ امام شافعی کے شاگرد بن گئے، وہ حج کرنے کے ارادہ سے بیت اللہ الحرام پہنچے۔ وہیں امام شافعی سے ملاقات ہو گئی، وہ ان کی فقہی ژرف نگاہی، قوت استنباط، اصول استنباط کے سلسلہ میں انہوں نے جو ضوابط اور مقاییس وضع کیے تھے، ان سے امام احمد بہت متاثر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امام شافعی مسجد حرام میں بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے، وہ بغداد میں محمد بن الحسن سے حنفی فقہ حاصل کر کے مکہ واپس آئے تھے، اور استنباط کے اصول وضع کرنے میں فکر و تامل سے کام لے رہے تھے، امام احمد نے امام شافعی سے استماع کے بعد خود ہی تصریح کی ہے کہ وہ شافعی کی فقہی ژرف نگاہی سے متاثر تھے نہ کہ ان کی روایت حدیث سے امام اسحٰق بن راہویہ سے بھی اس طرح کی روایت مروی ہے، انہوں نے احمد سے کہا "اس شخص سے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۹۲

اس سلسلہ میں سفیان بیچ میں ہیں، اور احمد سب سے آخر میں، حالانکہ امام احمد، سفیان ثوری سے کبھی نہیں ملے تھے، بلکہ ان کا علم، ان کے تلامذہ سے انہوں نے حاصل کیا تھا، اور ان کے روایات کا علم ان لوگوں سے لیا تھا جنہوں نے یہ علم ان سے براہ راست حاصل کیا تھا، لیکن ان دونوں میں صوری ملاقات نہ ہونے کے باوجود ایسی نفسی مشاکلت تھی کہ اس نے ان دونوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ سفیان ثوری کے علاوہ ایک اور شخصیت ہے جو امام احمد سے مشاکلت اور مماثلت رکھتی ہے، وہ شخصیت ہے عبداللہ بن المبارک رضی اللہ عنہ کی، چنانچہ احمد بن الحسن ترمذی کہتے ہیں:۔

"احمد بن حنبل، ابن مبارک سے، صورت اور اخلاق میں بہت زیادہ مشابہ تھے"[1]

امام احمد کے دو اور استاذ

ہم دیکھتے ہیں امام احمد کے دل میں تحصیل علم کے آغاز ہی میں مذکورہ دونوں بزرگوں ———— سفیان ثوری، اور عبداللہ بن المبارک ———— میں سے دوسرے سے ملاقات کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، لیکن موت نے جلدی کی، اور یہ آرزو نہ پوری ہونے دی، چنانچہ "المناقب" میں ابن جوزی نے اس سلسلہ میں خود امام صاحب کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"میں نے تحصیل علم شروع کی، میرا سن ابھی صرف ۱۶ سال کا تھا، پہلے پہل میں نے حدیث کی سماعت ہشیم سے کی، یہ سنہ ۱۷۹ھ کا واقعہ ہے، ابن مبارک بھی اسی سال تشریف لائے تھے اور یہ ان کی آخری تشریف آوری تھی، میں بڑے شوق سے ان کی مجلس میں حاضر ہوا، وہاں پہنچا تو لوگوں نے بتایا، وہ طرسوس تشریف لے گئے ہیں۔ ان کا انتقال سنہ ۱۸۱ھ میں ہوا۔"[2]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اماموں کے احوال و سوانح کا اختصار و ایجاز کے ساتھ ہم ذکر کریں، جن کے اور امام احمد کے مابین ذہنی اور نفسی مشاکلت اور مماثلت تھی، اور آپ ان دونوں بزرگوں کی سیرت، کردار، شخصیت اور مرویات سے بہت زیادہ مستفید ہوئے تھے، اور انہوں نے ان کے نقوش قدم کو اپنی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے دیا۔

سفیان ثوری

ان دونوں اماموں میں پہلے ہم سفیان ثوری کا ذکر کرتے ہیں، یہ ہیں سفیان بن سعید بن مسروق الثوری، یہ کوفہ میں رہتے تھے، اور بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے، نیز امام ابو حنیفہ کے ہم عصر بھی تھے، ان میں اور ابو حنیفہ میں فرق یہ تھا کہ امام ابو حنیفہ کی فقہ پر قیاس اور

استحسان کا غلبہ تھا۔ اور سفیان ثوریؒ کی فقہ پر حدیث وسنت کا، جس کی اتباع اور اقتدا کا جذبہ ان پر طاری تھا، ان دونوں میں اشتراک یہ تھا کہ دونوں منصب قضا قبول کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اور ارباب اقتدار سے دُور دُور رہتے تھے، ایک دوسری بات بھی تھی، امام ابوحنیفہ کا جیسا کہ ہم ان کی سوانح عمری میں بیان کر چکے ہیں۔ حضرت علیؓ کی طرف میلان تھا۔ اور سفیان اس کے برعکس تھے لیکن ان کی منزلت کو وہ مانتے تھے، چنانچہ جب وہ شام میں تھے تو مناقب علیؓ کا ذکر کیا کرتے تھے، کیونکہ وہاں حضرت علیؓ کا کوئی حامی نہیں تھا، عراق میں وہ حضرت عثمانؓ کے مناقب بیان کرتے، اس لیے کہ وہاں ان کی مدح کرنے والا کوئی نہ تھا، کوفہ میں وہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے مناقب سنایا کرتے تھے، اور خوارج کے سامنے بے دھڑک وہ حضرت علیؓ کے فضائل بیان کرتے رہتے تھے۔

سفیان کا ذریعۂ معاش وہ میراث تھی جو انہیں اپنے چچا سے جو بخارا میں مقیم تھے ملی تھی اس میراث نے انہیں اکل حلال مہیا کیا، اور انہیں گھٹیا طریقے سے طلب مال اور خلفاء کے عطایا اور ہدایا قبول کرنے سے بچالیا۔ مال موروثی کے نفع پر زندگی بسر کرنے میں امام احمد، اور سفیان دونوں ایک تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ امام احمد کو وراثت میں جو کچھ ملا وہ قلیل تھا، اور سفیان کو جو کچھ ملا وہ بہت زیادہ تھا۔

سفیان، خلفاء کے سامنے کھری اور بے لاگ بات کہنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتے تھے۔ خدا کے معاملہ میں وہ لومۃ لائم کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے تھے، مسجد حرام میں خلیفہ ابوجعفر منصور سے مڈبھیڑ ہوئی، اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کعبہ کی طرف ان کا رُخ کرتے ہوئے کہا،

"قسم ہے اس عمارت (کعبہ) کے رب کی، مجھے آپ نے کیسا آدمی پایا؟"

سفیان نے بے جھجک اور بے تامل جواب دیا،

"اس عمارت (کعبہ) کے رب کی قسم میں نے تجھے بدترین آدمی پایا۔"

منصور نے ایک مرتبہ سفیان کو منصب قضا سونپنے کے لیے طلب کیا، تو وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے اور موقع پاکر راہ فرار اختیار کی، اس وقت تک روپوش رہے، جب تک مہدی کا دور خلافت شروع ہو گیا، لیکن مہدی کا رویہ بھی ان کے لیے منصور سے کچھ مختلف نہ ثابت ہوا۔ سفیان نے ایسے موقع پر اپنے "کرے ہوئے" کا نعرہ لگایا جس ... کے سامنے تعریف و تحسین کی باتیں ... تھیں

...ج کے وقت دونوں کی ملاقات ہوئی، سفیان نے خلیفہ مہدی سے کہا،

"عمر بن الخطابؓ نے حج کیا، اور صرف سترہ دینار خرچ کیے، تم نے حج کیا، اور اپنے حج میں پورا بیت المال خرچ کر دیا۔"

یہ سن کر مہدی کو غصہ آگیا، اور وہ سفیان سے اپنے باپ کی طرح خفا ہو گیا، سفیان اس کے سامنے سے ٹل گئے، یہاں تک کہ غریب الوطنی کی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا، یہ واقعہ ۱۶۱ھ کا ہے، یعنی امام احمد کی ولادت سے تین سال پہلے، لیکن بایں ہمہ وہ اپنی سیرت، اور علم حدیث کے اعتبار سے امام احمد کے استاذ تھے، طلب علم کی راہ میں جو کھکھیڑ امام احمد نے جھیلے تھے وہی سفیان کو بھی اپنے عہد میں جھیلنا پڑے تھے، سفیان نے بھی طلب حدیث کے سلسلہ میں، عراق، شام، حجاز، اور یمن کا سفر اختیار کیا تھا، چنانچہ کہنے والے نے ان کی یہ مشقتیں دیکھ کر کہا تھا۔

"درندوں کے لیے بھٹ ہیں جن میں وہ پناہ گزیں ہوتے ہیں، مگر تمہارے لیے کہ نہیں؟"

امام سفیان بھی، گمنامی، اور عزلت کی زندگی کو، شہرت اور ناموری کی زندگی پر ترجیح دیتے تھے، بعد میں یہی جھلک ہم نے امام احمد میں دیکھی، سفیان بھی خلفا اور ارباب اقتدار کے قرب سے کنارہ کش رہنے کو حاضر باشی اور درباداری پر ترجیح دیتے تھے، امام سفیان نے اپنے ایک شاگرد کو جو خط بھیجا تھا، وہ اس دعوت کا بولتا ہوا ثبوت ہے، وہ خط یہ ہے:

"تم جس زمانہ میں ہو یہ وہ زمانہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ خدا کی پناہ مانگتے تھے کہ اس زمانہ کو پائیں، اور خدامت کے باعث انہیں وہ کچھ حاصل تھا، جو ہمیں حاصل نہیں ہے۔ پھر امور خیر میں قلت علم، قلت صبر، اور قلت اعوان، لوگوں کی فساد انگیزی، اور دنیا کی گندگی اور ناپاکی کے باوجود ہم نے جس زمانہ کو پایا ہے اس سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ پس تم پر واجب ہے کہ گمنامی کی زندگی بسر کرو کہ یہ زمانہ گمنامی ہی کے لیے موزوں ہے، تم پر لازم ہے کہ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرو، اور لوگوں سے میل جول کم رکھو، پہلے ... کوشش کرتے تھے لیکن

اب وہ صورت نہیں رہی، لہٰذا راہِ نجات یہی ہے کہ ترکِ تعلق کے اصول پر عمل کیا جائے۔

اور ہاں، — خبردار، امراء کا قرب نہ اختیار کرنا، نہ ان سے کسی معاملہ میں اختلاط رکھنا، اور ہاں خبردار، بتلائے فریب بھی نہ ہونا، تم سے کہا جائے گا: "اس شخص کی سفارش کر دیجئے"، "مظلوم کی دستگیری کیجئے"، "ظلم کے مٹانے میں سعی کیجئے"۔ یاد رکھو، یہ سب باتیں ابلیس کی فریب کاریاں ہیں، وقت کے تاجروں نے اپنی سربلندی کے لیے ان باتوں کو سیڑھی بنالیا ہے، اور وہ جو کہا گیا تھا "جاہل عبادت گزار اور فاجر عالم کے فتنے سے بچو، اس لیے کہ ان دونوں کا فتنہ فتنہ زدہ شخص کے لیے بہت بڑی مصیبت ہے، جو مسئلے اور فتوے تمہیں معلوم ہو جائیں بس انہیں غنیمت سمجھو اور ان معاملات میں جنگ و جدال کی روش نہ اختیار کرو۔

اور ہاں خبردار، تم اس آدمی کی طرح نہ بن جانا جو یہ چاہتا ہے کہ اس کے قول پر عمل کیا جائے، اس کی باتوں کی اشاعت کی جائے، اور اس کا کلام سنا جائے۔

اور ہاں خبردار، حکومت اور ریاست کی محبت سے بچنا، کیونکہ لوگ اقتدار کو سونے اور چاندی سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔"

اس خط کی روشنی میں آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ امام سفیان گمنامی اور عزلت، اور ترکِ اقتداریات کی طرف دعوت دیا کرتے تھے، یہی چیز امام احمد نے اپنے لیے اختیار کر لی تھی۔ گویا وہ اپنے عمل سے اس امام جلیل — سفیان ثوری — کی دعوت کا جواب دے رہے تھے۔

گزشتہ اوراق میں آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ امام احمد، خاموش رہنے کے عادی تھے، ہنسی، دل لگی کی باتوں کو ذرا بھی پسند نہیں کرتے تھے، ان کی یہ عادت بھی گویا سفیان کی ایک دعوت کا جواب تھی، کیونکہ سفیان ہی فرماتے ہیں:

"علم حاصل کرو، اور جب علم حاصل کر چکو تو اس کی رکھوالی کرو، اسے ہنسی مذاق اور کھیل کود سے مخلوط نہ کرو، کیونکہ اس طرح دل کی دنیا سونی ہو جاتی ہے۔"

اس طرح آپ نے دیکھ لیا، امام احمد کا اخلاق و مزاج بالکل وہی تھا جو امام جلیل سفیان ثوری کا۔

اسی لیے ہم سفیان کو امام احمد کا استاد قرار دیتے ہیں، اگرچہ دونوں میں زمانی بُعد کی دیوار حائل ہے اور ایک نے دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا۔ امام احمد نہ صرف احادیثِ سفیان ہی کے حافظ تھے، بلکہ انہوں نے سفیان کو اپنا استاذ اور امام بنا لیا تھا، اسی لیے وہ سفیان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

"میرے دل میں سفیان سے زیادہ منزلت کسی کی نہیں ہے۔"

امام احمد صرف سفیان ہی کو "امام" کے لقب سے یاد کرتے تھے، اپنے ایک شاگرد سے انہوں نے فرمایا:

"جانتے ہو امام کون ہے؟ امام ایک ہی ہے اور وہ ہے سفیان ثوریؒ"

یہ تھے سفیان ثوری، جن سے امام احمد نے کبھی ملاقات نہیں کی، لیکن وہ بہرحال ان کے شاگرد تھے!

امام عبداللہ بن المبارکؒ

امام احمد کو ابن مبارک سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ ورع و اخلاق میں ان کا مسلک وہی تھا جس پر امام احمد چلے۔ اربابِ جاہ و اقتدار سے دوری کا جذبہ دونوں میں مشترک تھا، لیکن ابن مبارکؒ دولت مند آدمی تھے، رزقِ واسع کی نعمت خدا تعالیٰ نے انہیں عطا کر رکھی تھی، آسائش اور فراخی کی زندگی بسر کرتے تھے، داد و دہش اور جود و عطا ان کی فطرت تھی، اور امام احمد نادار ہونے کے باوجود اخلاقِ کاملہ کے حامل تھے۔ حدیثِ پاک کے لفظوں میں ابن مبارکؒ "غنی شاکر" تھے تو احمد "فقیر صابر"۔ فقر و غنا میں اختلاف کے باوجود دونوں کی مجالس میں فقیر اور کنگال کی منزلت بہت زیادہ تھی۔ ان کی مجلس میں ایک غریب اور فقیر شخص جس اعزاز اور منزلت کا حامل تھا وہ کسی اور کو حاصل نہیں تھی۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ دونوں ایک ہی کان کے دو ہیرے ہیں۔

ابن مبارکؒ کی شخصیت علمی جلال کی جامع تھی، وہ مجاہد و غازی تھے اور ایسا بلند پایہ عالم بھی، جو فقہ و حدیث میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو، وہ ایسے مجاہد تھے جس نے میدانِ جہاد میں دادِ سپہ گری دی، جس نے اسلام کی نشر و تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے متعدد حج کیے تھے، وہ اپنی ذات پر محتاجوں اور ضرورت مندوں کی احتیاج کو ترجیح دیتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ حج کو جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک مزبلہ پر انہوں نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک مری ہوئی چڑیا تھی جسے وہ (کھانے کے لیے) چیر پھاڑ رہی تھی۔ ابن مبارک نے لڑکی سے پوچھا،

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ بولی:

"میں اور میرا بھائی یہاں بے سہارا پڑے ہوئے ہیں، اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ کھانے اور پیٹ بھرنے کا کوئی سامان ہے، سوا اس کے کوئی صورت نہیں رہ گئی کہ اس مزبلہ سے جو کچھ مل جائے وہی کھا لیں، ہمیں فاقہ سے تین دن گزر چکے ہیں، اب مردہ بھی ہمارے لیے حلال ہے، ہمارا باپ مال دار آدمی تھا، اس پر ظلم کیا گیا، مال چھین لیا گیا اور اسے قتل کر ڈالا گیا۔

ابن مبارک نے اپنے ایجنٹ سے پوچھا،

"زادِ راہ کی مد میں اب تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟"

اس نے جواب دیا

"ایک ہزار دینار!"

ابن مبارک نے اسے حکم دیا،

"اس رقم میں سے بیس دینار اپنے پاس رکھ لو، وہ ہمیں مرو تک کفایت کرینگے۔ باقی رقم اس لڑکی کو دے دو، ہمارا یہ کام حج سے زیادہ کارِ ثواب ہے!

پھر مرو واپس چلے گئے[1]

امام ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ خود روزہ رکھتے تھے، مگر دوسرے فاقہ مستوں کو شکم سیر کر کے کھانا کھلاتے تھے، دنیا کی چیزوں سے وہ بہت کم فائدہ اٹھاتے تھے، ان کا مال فقیروں کے لیے وقف تھا، اپنی دولت سے وہ غریب طالب علموں کی مدد کیا کرتے تھے، ان کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ سے کسی طرح کم نہیں تھی، اور یہ ساری کی ساری رقم وہ خدا کے بندوں پر صرف کر دیتے تھے، یا پھر اس کا مصرف اہلِ علم اور اہلِ ضرورت کی حاجت روائی تھا، اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ آمدنی صرف

[1] تاریخ ابن کثیر

ہو جاتی، اور ان کی داد و دہش کا سلسلہ جاری رہتا، وہ راس المال میں سے بھی صرف کر ڈالتے تھے، اور اس سے اپنے نفس کو آلودہ نہیں ہونے دیتے تھے کہ معیشت سدھر جائے اور دین خاسد ہو جائے، یہی وجہ تھی کہ علماء کی ایک بہت بڑی جماعت انہیں اس ورع اور حدیث و فقہ کا امام قرار دیتی ہے جسے سفیان ثوری نے اپنے بعد آنے والوں کے لیے چھوڑا تھا، معتمر بن سلیمان سے پوچھا گیا،

"اہلِ عرب میں سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟"

انہوں نے جواب دیا

"سفیان ثوری!"

پھر پوچھا گیا،

"اور سفیان کے بعد فقیہ کون ہے؟"

جواب میں فرمایا

"عبداللہ بن المبارک!"

ابن مبارک علم آثار و سنن کی تحصیل میں بہت زیادہ جد و جہد کرتے تھے، وہ ساری ساری رات تحقیق و مطالعہ میں صرف کر دیتے تھے، ایک مرتبہ ان سے کہا گیا،

"جب آپ نماز پڑھ چکتے ہیں تو ہماری مجلس میں کیوں نہیں بیٹھتے آکر؟"

جواب میں آپ نے فرمایا،

"میں اپنا وقت صحابہ اور تابعین کے ساتھ صرف کرتا ہوں!"

پوچھا گیا،

"اب صحابہ اور تابعین کہاں ہیں؟"

فرمایا،

"میں علم کی دنیا میں ان سے ملاقات کرتا ہوں، ان کے آثار و احوال سے مستفید ہوتا ہوں، تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کیا کروں، تمہارا کام ایک دوسرے کی غیبت کرنے کے سوا اور کیا ہے؟"

ابن مبارک ویسے شخص تھے جیسے خدائے تعالیٰ نے رزقِ حسن وافر اور عطا فرمایا تھا، وہ لوگوں

"جس کے دل میں دنیا کی محبت بس جائے، اور جو گناہوں سے پیار کرے، پھر بھلا خیر اور نیکی کا اس کے پاس کہاں گزر؟"

ابن مبارک کا خیال تھا زاہد خود سب سے بڑا سلطان ہے، اس کے سامنے دوسرے سلاطین و ملوک ہیچ ہیں، اس لیے کہ زاہد خدا کے سوا کسی اور کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا، اس کے برعکس ملوک و سلاطین لوگوں سے بے نیاز ہو ہی نہیں سکتے۔

ایک مرتبہ ابن مبارک سے پوچھا گیا،

"الناس" انسان کون لوگ ہیں؟ جواب میں فرمایا،

"علماء!" پوچھا گیا، بادشاہ کون ہیں؟ فرمایا "زہاد"! پوچھا گیا کمینے کون لوگ ہوتے ہیں؟ ارشاد فرمایا، وہ لوگ جو دین کے بدلے میں دنیا حاصل کرتے ہیں!

یہ تھے وہ ابن مبارک، جن سے ملنے کی تمنا امام احمد کے دل میں موجزن تھی، جن سے کچھ حاصل کرنے کے لیے وہ بے چین تھے، لیکن کم عمری کے علاوہ حالات بھی ناموافق تھے، یہی وہ مثالی شخصیت تھی جس سے امام احمد مشابہت رکھتے تھے، آپ نے دیکھ لیا امام احمد نے ابن مبارک میں وہ کمالات پائے، جن سے بعد میں وہ خود متصف اور مشہور ہوئے، جود و زہد، تھوڑی پونجی پر گذر بسر کرنا، بادشاہوں اور ارباب اقتدار سے دُور دُور رہنا، دین کو اپنے رزق کی سبیل نہ بنانا، دین کے معاملات میں سختی اور دنادت کا اظہار نہ کرنا، یہ تمام باتیں امام احمد میں فضائل اور کمالات کی حیثیت سے موجود تھیں، اور یہی ساری باتیں ابن مبارک کی ذات گرامی میں بھی پائی جاتی تھیں، لہٰذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ابن مبارک، احمد کے استاذ تھے، اگرچہ وہ اپنے اس "استاذ" کی زیارت سے شاد کام نہیں ہوئے تھے۔

امام احمد کے دوسرے اساتذہ

اور جب ہم ان بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی زیارت تک امام احمد نہیں کر سکے تھے، تو ہم ان بزرگوں کی حق تلفی نہیں کرتے جن کی زیارت سے وہ بہرہ مند ہوئے تھے، اس لیے کہ یہ وہ لوگ تھے جو زاہد تھے، صاحب ورع تھے، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق تھے، اور بدعت سے دُور رہتے تھے، ان لوگوں نے احمد کے لیے ایک مثال قائم کی، ایک راستہ بنایا، انہوں نے ان لوگوں کا علم لیا، اور پھیلایا، جن کا زمانہ احمد نے نہیں پایا تھا جنہیں

نہیں دیکھ سکے تھے، جن سے ملاقات کا موقع انہیں نہیں ملا تھا، پس سفیان بن عیینہ، ابوبکر بن عیاش، وکیع بن الجراح، عبدالرحمٰن بن محمد، اور یحییٰ بن سعید القطان، اور دوسرے بہت سے اکابر یہ سب امام صاحب کے استاد تھے، زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے، ان سب نے امام احمد کو روشنی کی راہ دکھائی —!

ہم نے سفیان ثوری، اور عبداللہ بن المبارک کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ امام احمد، اپنے اخلاق و عادت، سیرت و کردار، اور شخصیت کے اعتبار سے ان دونوں سے بہت زیادہ مشابہ تھے، اور جیسا کہ ان کے اقوال اور سیرت سے اندازہ ہوتا ہے، وہ ان دونوں کی طرف بہت زیادہ مائل تھے، پس ضروری تھا کہ وہ ان دونوں کی مثال عالی کو اپنے سامنے رکھ کر رہروی کرتے، انہی کے راستے پر استقامت اور عزیمت کے ساتھ گامزن ہوتے۔ اس لیے کہ ان کے اور ان دونوں بزرگوں کے درمیان ذہنی اور نفسی مماثلت پورے طور پر موجود تھی!

امام احمدؒ کا زمانہ اور اسکی کارفرمائیاں

امام احمدؒ نے جس دور میں زندگی بسر کی، یہ وہ زمانہ تھا جس میں عصرِ عباسی کے تمام عناصر پختہ ہو چکے اور برگ و بار لے آئے تھے، یہ تلخ بھی تھے اور شیریں و ترش بھی، اس دور نے ہر چیز میں پختگی پیدا کر دی تھی، خواہ وہ کسی حالت میں ہو اور اس کے خواص کچھ ہی ہوں، اس دور کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ دولت عباسیہ کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ اب کوئی ایسا حریف میدان میں باقی نہیں رہ گیا تھا جس سے کسی طرح کا اندیشہ ہو، خارجیوں کی قوت و شوکت دم توڑ چکی تھی۔ چنانچہ عباسیوں کے دور میں وہ پھر سر نہ اٹھا سکے، ہارون رشید کے بعد علویوں میں بھی یہ دم خم نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنے "بنی عم" کے خلاف صف آرا ہو سکتے۔

اگرچہ دولتِ عباسیہ، خارجی طور پر پوری طرح مستحکم ہو چکی تھی، لیکن خود اس کے اعضاء و جوارح ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے، اور اس پیکار باہمی کا سب سے بڑا مظہر ولی عہدی کا مسئلہ تھا، جب برسرِ اقتدار خلیفہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے سے سابق کی ولی عہدی کو توڑ ڈالے۔

امین اور مامون کے درمیان جو فتنہ و فساد پیدا ہوا وہ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی تھی، یہ ہنگامہ امین کے قتل اور مامون کی کامیابی پر ختم ہوا، لیکن یہ کامیابی اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے خوشگوار کم تھی، اور ناخوشگوار زیادہ، مامون نے یہ کامیابی ایرانیوں کی تلواروں کے بل پر حاصل کی تھی، کیونکہ امین اور مامون کی معرکہ آرائی درحقیقت عربی اور ایرانی فوج کی جنگ تھی، امین کی شکست عربوں کی شکست تھی، اس کے بعد پھر عباسی دورِ حکومت میں ان کو عروج نہیں حاصل ہو سکا۔

تعمیر میں تخریب کا پہلو | دولت عباسیہ کے اس استقرار و استحکام کے بعد مامون جہاد کی طرف متوجہ ہوا

اس کے بعد معتصم اور واثق بھی اسی ڈگر پر چلے اور گو دولت اسلامیہ عباسیہ ایک مرعوب کن قوت بن گئی، لیکن اس کے اندر ضعف و انحطاط کے آثار و عوامل بھی کارفرما رہے۔ (اگیا

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی)

یہ خلفاء اپنے اقتدار کے لیے عجمیوں پر اعتماد کرنے لگے، مامون نے اہل فارس پر بھروسہ کیا، اس کے بعد معتصم کی باری آئی، اس نے ترکوں کو سر چڑھا لیا، اور ان کے ذریعے قوت پائی، اور جنگ و پیکار میں کامیابی حاصل کی، اس کے بعد ہی حکومت کا نظام، ضعف و انحطاط کے عوامل سے متاثر ہو کر متزلزل ہونے لگا، چنانچہ ان عجمی طاقتوں کو جب قوت اور اقتدار کی چاٹ پڑی، تو انہوں نے خلفاء کو ذلیل کیا، ان کا شیشۂ ناموس توڑا، انہیں اپنا ہدفِ استبداد بنا لیا، اور ان کے نام پر عوام کو ستایا اور پریشان کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دولت اسلامیہ عباسیہ کی وحدت ختم ہو گئی، اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، اس کا سیاسی مرکز ختم ہو گیا، اور وہ ایک بکھری ہوئی قوت بن گئی۔

یہ تھے وہ سیاست کے مظاہر جن میں سے بعض کو احمدؒ نے دیکھا، محسوس کیا، پایا، وہ ایک عرب نژاد شخص تھے، شیبانی قبیلہ کے ایک فرد، ان کے دادا نے اس حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے سلسلہ میں مجاہدات کیے تھے، ان کے والد بھی ایک سپہ گر تھے، لیکن قبل اس کے کہ عربوں کی ذلت اور اہانت کا دور شروع ہو، انہوں نے اس دنیا سے آنکھیں موند لیں، امام احمدؒ نے عربوں کی یہ ذلت دیکھی جسے وہ کبھی پسند نہیں کر سکتے تھے، لیکن ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنے غم و غصہ کا اظہار جنگ و پیکار کی صورت میں کر سکتے، اس لیے کہ وہ اہل علم تھے، صاحبِ شمشیر نہیں تھے، نہ وہ کوئی ایسی جماعت بنانے پر تیار تھے، جو حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر دے، انتہائی خفگی اور برہمی کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس اسلامی حکومت کا ایوان زمین پر آ رہے، اور ایسی ہر سعی و کوشش کا لازمی طور پر انجام بھی ہوتا، ان کے غضب اور غصہ کا مظاہرہ، خلفاء اور عمال پر نکتہ چینی اور ملامت کی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا تھا، نہ حکومت کے حامیوں اور کارگزاروں پر تنقید و جرح کی صورت میں وہ اسے مناسب سمجھتے تھے، ان کے غیظ و غضب کا مظاہرہ جو ان کے شایانِ شان ہو یہی ہو سکتا تھا کہ وہ ان خلفاء اور عمالِ حکومت سے دور دور رہیں، ان کے قریب نہ پھٹکیں، اور اپنی ساری توجہ علم پر منعطف کر دیں، اور اپنے آپ کو سیاست،

امام احمد کا یہ مسلک ان کے پیش رو دو اماموں کے طریقِ عمل کے درمیان اعتدال اور توسط کا مسلک تھا، یعنی امام ابو حنیفہؒ تو اثنائے درس میں خلفاء اور عمالِ حکومت پر نکتہ چینی بھی کر لیا کرتے تھے. فتوے دیتے وقت ان کے قلم سے ایسی عبارت بھی معرضِ تحریر میں آجاتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عوام کو حکومت کے خلاف علویوں کی پشت پناہی، اور ان کی باغیانہ سرگرمیوں میں امداد و اعانت بھی جائز سمجھتے تھے، وہ ان کے بارے میں سکوت نہیں اختیار کرتے تھے، اگرچہ واضح اور صریح طور پر اعلانِ بغاوت بھی نہیں کیا تھا، لیکن سیاقِ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کو جائز اور مباح قرار دیتے تھے، امام ابو حنیفہ کے فتاویٰ کے سیاقِ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان خلفاء کے خلاف خروج کو بغاوت ہی نہیں مانتے تھے، اگر یہ دوسری بات ہے کہ عملی طور پر وہ ان لوگوں کے شریک نہیں تھے۔

اس کے برعکس امام مالکؒ خروج کو جائز نہیں سمجھتے تھے، نہ لوگوں کو حکومت کے خلاف اکساتے تھے، وہ حکومت کے والیوں اور کارفرماؤں سے تعلقات اس بنا پر رکھتے تھے کہ ان کی اصلاح کر سکیں اور مظالم اور حق تلفی سے روک سکیں۔

اب رہے امام احمد، سو وہ ان دونوں راستوں کے بین بین تھے، نہ وہ فتنہ کی دعوت دیتے تھے، نہ لوگوں کو حکومت کے خلاف اکساتے تھے، نہ ان کے خلاف کوئی بات کہتے تھے، نہ ان پر نکتہ چینی کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کے ساتھ تعاون بھی نہیں کرتے تھے، نہ ان کے عطایا قبول کرتے تھے، بلکہ ان کے مال سے بیزار رہتے تھے، ان کے عطایا سے منحرف رہتے تھے، اور پورے طور پر اپنے آپ کو علم کے لیے وقف کر چکے تھے۔

معتزلہ اور علمائے حق

ایرانیوں کے غلبہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی امور و معاملات میں وہ جماعت صاحبِ امر و نفوذ بن گئی جسے معتزلہ کہتے ہیں، امام صاحب اس جماعت کے عقائد و افکار کو منہاجِ سلف سے انحراف اور سنتِ نبوی سے روگردانی قرار دیتے تھے، اسی لیے وہ خلفاء اور امراء سے اور زیادہ اجتناب کرنے لگے، لیکن اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ جس چیز کو وہ بدعت سمجھتے ہوں، اس کے بارے میں سکوت اختیار کر لیا ہو، وہ لوگوں کو معتزلہ کے ساتھ نشست و برخاست یا ان کے طرز پر معاملاتِ دین میں غور و خوض کرتا ہے وہ بالآخر ان کا ہم خیال بن جاتا اور اپنے آپ پر بدعت کا دروازہ کھول لیتا ہے، اور پھر تابڑ توڑ بدعتیں اور گمراہیاں اس پر وارد ہونے لگتی ہیں۔

امام احمد اور معتزلہ کا اختلاف

اب ہم یہ بتائیں گے کہ امام احمد اور معتزلہ کے مناہجِ فکری میں اختلاف کس طرح پیدا ہوا؟ اور پھر ان دونوں میں مخالفت کیونکر بڑھی اور پروان چڑھی؟

جہاں تک ہمارا خیال ہے عباسی دور میں معتزلہ کا وجود ایک ناگزیر اور لابدی چیز تھا، یہی زمانہ تھا جب زندیق (گمراہ) لوگ پیدا ہوئے اور ابھرے، یہ لوگ ایسے افکار و آراء کا اظہار کرتے تھے جو اسلامی سوسائٹی کے لیے فتنہ و فساد کے موجب تھے، یہ ایسی سازشیں کرتے رہتے تھے جو اسلام کے لیے تباہ کن تھیں اور جن کی بنیاد مسلمانوں کے لیے کید و فریب اور اسلام کے لیے استخفاف پر تھی۔ انہی میں ایک گروہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل تھا جن کی خواہش تھی کہ اسلامی اقتدار ختم اور فارسی اقتدار بحال ہو جائے، جیسا المقنع خراسانی، مہدی کے عہد میں خروج کر کے ثابت کر چکا تھا، یہ رنگ دیکھ کر خلفاءِ عباسیہ نے ایک طرف تو تلوار میان سے نکالی، اور زنادقہ پر پل پڑے، اور دوسری طرف علماء کو اس طرف آمادہ کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ زیادہ تر معتزلہ ہی اس کے لیے میدان میں اترے، اور انہوں نے ان کے دلائل کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے، ان کے دلائل توڑ دیے، ان کے یہ کارنامے دیکھ کر خلفاء نے بھی انہیں اپنا مقربِ بارگاہ بنایا، اپنی مجالس میں بار دیا، قصرِ شاہی کے پھاٹک ان کے لیے کھول دیئے، یہ سب کچھ تو منصور اور مہدی کے زمانہ میں ہوا، پھر مامون، معتصم اور واثق کے دور میں ان کی قدر و منزلت اور زیادہ بڑھ گئی، انہیں وزارت کے منصب پر فائز کیا گیا، انہیں حجابت کا مرتبہ عطا کیا، کاتب اور سکرٹری مقرر کیا۔ مامون کا تو یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو انہی میں شمار کرتا تھا۔ انہی کے اصولوں اور دلیلوں کی روشنی میں مخالف افکار کا محاسبہ کرتا تھا۔ غرض معتزلہ نے عہدِ عباسی میں علمی افکار و خیالات پر بھی پورا پورا نفوذ اور اقتدار حاصل کر لیا تھا۔

زنادقہ اور مجوس وغیرہ کا رد و مقابلہ جب اس امر کا موجب ہوا کہ معتزلہ بزعمِ خویش اسلام کی طرف سے دفاع اور اس کے اسلامی عقائد ثابت کرنے کے لیے استدلال کا ایسا طریقہ اختیار کریں جو بالکل

اپنے آپ کو مسلح کیا، اور ہجوم و دفاع کے سلسلہ میں ان اسلحہ کا بے محابا استعمال شروع کر دیا اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ حریفِ مقابل کے افکار و خیالات خود ان میں سرایت کر گئے۔ اور ایسے فلسفیانہ مسائل پر انہوں نے سوچ بچار شروع کر دیا۔ سلف صالح کے عہد میں جن پر کبھی غور نہیں کیا گیا تھا۔ مثلاً انسان کے ارادہ اور اس کے عمل پر، اللہ تعالیٰ کہاں تک کار فرما ہے؟ پھر یہ خدائے بزرگ و برتر کے صفات پر بھی بحث کرنے لگے، یعنی صفاتِ الٰہیہ غیرِ ذات ہیں یا عینِ ذات؟ یہ اور اس طرح کی دوسری باتوں پر انہوں نے بحث و گفتگو شروع کر دی، وقت کے فقہاءؒ نے ان باتوں کا بُرا مانا، اور انہیں سخت ناپسندیدہ قرار دیا۔

عقائد کے سلسلہ میں استدلال کا جو طریقہ معتزلہ نے اختیار کیا تھا، محدثین اور فقہاء نے اسے مسلکِ صحابہ اور تابعین کے خلاف سمجھا اور اس کی مخالفت کی، اور یہ بالکل طبعی امر تھا کہ یہ دونوں فرقے جو دینِ اسلامی کی خدمت کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے تھے، اپنے اختلافِ عقلیت اور طرزِ فکر کی بنا پر ایک دوسرے سے قریب نہیں ہو سکتے تھے۔ فقہاء اور محدثین کا مسلک یہ تھا کہ وہ اپنے دین کو کتاب و سنت سے پہچانتے تھے۔ اور فہم نصوص کتاب و سنت، اور ان دونوں کی عبارت اور اشارت اور استنباطِ احکام کے سلسلہ میں ان کا عمل یہ تھا کہ اگر کوئی نص نہیں ملتی تھی تو اجتہاد سے کام لیتے تھے، بس زیادہ سے زیادہ وہ یہاں تک جا سکتے تھے، لیکن معتزلہ اتنے محتاط نہیں تھے، وہ اثباتِ عقائد کا کام عقلی موشگافیوں سے لیتے تھے، اور اس طرح وہ فلسفیانہ اصولوں، اور فنِ منطق سے حسبِ مرضی کام لیتے رہتے تھے۔

مامون اور اس کے بعد متوکل کے دَور میں اس کے حکام و عمال نے یہ کیا کہ خلقِ قرآن کے سلسلہ میں انہوں نے معتزلہ کے افکار و آرا قبول کرنے پر علماء کو مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریقوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ معتزلہ کو موقع مل گیا، وہ فقہاء اور محدثین کے مخالف تھے ہی، چل نکلے، اور انہوں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا۔ اس سلسلہ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ پر جو ستم ٹوٹے، جو مصیبتیں نازل ہوئیں، ان کی تفصیل صفحاتِ ماسبق میں گزر چکی ہے۔

تدوینِ فقہ و حدیث

اب ہم بتائیں گے کہ زیرِ بحث زمانہ میں علمِ حدیث اور فقہ کی کیا کیفیت تھی؟ اس سے قبل ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ وہ دَور ہے جب ہر چیز حدِ کمال کو پہنچ چکی

تھی، چنانچہ فقہ بھی تکمیل کے مراحل بدرجۂ اتم طے کر چکی تھی اور اس کے اصول وضع ہو چکے تھے، علماء کے حلقے اس کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر چکے تھے، اس زمانہ میں فقہ بصری، یا کوفی، یا شامی یا حجازی نسبت نہیں رکھتی تھی، بلکہ پوری فقہ مجموعی طور پر "اسلامی فقہ" مانی جاتی تھی، اس دور میں مختلف ممالک کے سفر و سیاحت کی منزلیں علماء جو طے کرتے تھے اس کا باعث یہ تھا کہ ہر شہر کے عالموں کا علم حاصل کر لیا جائے، اور پھر ان مساعی کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے جو آثار و نقوش حاصل ہوں، ان کی تدریس باہمی کا سلسلہ شروع کیا جائے، اس طرح فقہ حجازی، اور فقہ عراقی میں اشتراک پیدا ہوا اور ہم سمجھتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے اپنی کتابوں میں عراق، شام، اور حجاز کے علماء فقہاء کے ثمراتِ سعی و کوشش ایک جگہ جمع کر دیئے۔

اس کے بعد مجتہدین کی ہر جماعت کے لیے فقہی مجموعے مدوّن ہو گئے، امام مالکؒ نے اپنی مؤطا تصنیف فرمائی، بعدہ ان کے شاگردوں نے "المدوّنہ" کے نام سے مالکی فقہ کا ایک جامع مجموعہ مدوّن کر ڈالا۔ قاضی ابو یوسف نے حنفی فقہ پر کئی جامع کتابیں ترتیب دیں۔ امام محمدؒ نے فقہ عراقی پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا، ان سب کے بعد امام شافعیؒ نے ایک ایسی مبسوط اور ضخیم کتاب مرتب فرمائی، جسے اس دَور کی فقہ کی زندہ تصویر کہنا چاہیے، اس میں فقہ و استنباط کے تمام مسائل آ گئے ہیں، اس مبسوط کتاب کا نام انہوں نے "الام" رکھا، لیکن بعض متقدمین اسے "المبسوط" ہی کے نام سے پکارتے تھے۔

امام احمد کے سامنے یہ سارا فقہی مواد موجود تھا، جس کا بہت بڑا حصہ انہوں نے پڑھ ڈالا، کچھ حصہ حلقۂ درس میں شریک ہو کر باقاعدہ پڑھا، چنانچہ امام شافعی جب دوسری مرتبہ بغداد آئے تو امام صاحب نے ان سے "فقہ" حاصل کی۔ اس سے قبل فقہائے عراق کی کتابیں وہ دیکھ چکے تھے۔ لیکن مطالعہ کے بعد وہ اس سے بیزار ہو گئے تھے، لیکن چنانچہ امام احمد کا مسلک عام طور پر فقہاء عراق کے خلاف ہے، غرض اس طرح امام احمد نے تمام فقہی ثمرات سے پورے طور پر واقفیت پیدا کر لی، اس سے اپنی عقل و فکر کو غذا پہنچائی اور عام اس سے کہ ان کے نتائجِ فکر سے متفق ہوں یا مختلف، اس سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے انہوں نے اپنی عقل کا تغذیہ بہم پہنچایا، لیکن اگرچہ خود انہوں نے علوم سنت کی طرف توجہ کی یہی وجہ ہے کہ ان کی فقہ پر، اثر کا رنگ غالب ہے، یہاں تک کہ ان کے فتاویٰ کو آثار کہتے ہیں نہ کہ فقہ،

یہی وہ فن ہے جسے بعد میں "اصول فقہ" کا نام دے دیا گیا۔ یہ اہم کام امام شافعیؒ نے سرانجام دیا، فقہ کے اصولی کلیات کے وضع و تدوین کا سہرا انہی کے سر ہے، جبکہ اس سے قبل فقہ صرف فتووں اور جزئی مسائل کا نام تھا، انہوں نے اس سلسلے میں اپنی مشہور کتاب "الرسالہ" تصنیف فرمایا، جس میں استنباط کے وسائل و ضوابط اور حدود پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور ان قیاسات کی صحت پر دلائل قائم کیے ہیں، (امام شافعیؒ پر جو ہم نے لیکچر دیئے ہیں (جو "الشافعی" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں طبع ہو چکے ہیں)، ان میں ہم نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے امام ہی نے اس فن کی ابتدا کی جب کہ وہ مکہ شریف میں مقیم تھے جہاں انہوں نے فقہ مالکی، مدنی، اور فقہ عراقی پر عبور حاصل کیا، اور ان دو مکاتب فکر میں ایک ایسے باہوش دانش شخص کی طرح موازنہ شروع کیا، جو فروع کو اصل کی طرف لوٹاتا ہے، پھر ۱۹۵ھ کے بعد جب وہ بغداد واپس آئے تو ان کے ساتھ ان کے ثمرات تفکیر بھی تھے۔

امام احمد کو امام شافعی سے استفادہ کا دو مرتبہ موقع ملا، ایک مرتبہ مکہ میں دوسری مرتبہ بغداد میں جب کہ وہ اپنے ثمرات تفکیر کی نشر و اشاعت میں معروف تھے۔ امام شافعی جب تک بغداد میں مقیم رہے امام احمد ان سے استفادہ کرتے رہے، اس طرح انہوں نے چار سال ان کی خدمت میں گزار دیئے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امام احمد کے افکار و نظریات اور طریق تحقیق پر حضرت امام شافعی کا خاصا اثر ہے، اگرچہ آپ کا دینی و علمی ذہن بنانے میں دوسرے عناصر علمیہ بھی موثر تھے۔

دیار مختلفہ کی متفرق احادیث

امام احمد ہی کے زمانہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں علم حدیث بھی تکمیل کو پہنچا، امام احمد سے پہلے سنت اور آثار کی روایت نے تکمیل و نمو کے مراحل نہیں طے کیے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایتوں کا ایک ڈھیر لگا تھا، لیکن اس ذخیرہ میں سے صحیح اور غلط کے پہچاننے کا کوئی اصول اور ضابطہ مقرر نہیں ہوا تھا۔ نہ صادق کو غیر صادق سے ممتاز کرنے کا کوئی اصول موجود تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ارادہ کیا تھا کہ سنت صحیحہ کا مجموعہ تیار کریں اور اسے لوگوں میں پھیلا دیں، لیکن قبل اس کے کہ ان کا ارادہ تکمیل تک پہنچے، قضا کا پیام آ گیا، اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے بعد علماء نے تدوین حدیث کی طرف توجہ کی، چنانچہ امام مالک نے "موطا" کے نام سے ایک مجموعہ تیار کیا، امام شافعی کی مسند مرتب

کے کام کیے، لیکن اب تک کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہیں ہوا تھا جو صحیح حدیثوں پر مشتمل ہوتا، امام مالک کی موطا میں وہ آثار تھے، جو امام مالکؒ کے نقطۂ نظر سے صحیح اور درست تھے۔ علاوہ ازیں اس میں ان صحابہ کے آثار تھے جو مدینہ میں اقامت اختیار کیے ہوئے تھے، اسی طرح فقہائے عراق نے جو آثار جمع کیے تھے وہ ان صحابہ یا تابعین کے تھے جو عراق میں قیام فرما تھے، اسی طرح شامیوں کے جمع کردہ آثار ان صحابہ کے آثار تک محدود تھے، جو شام میں تشریف رکھتے تھے، یہاں تک کہ ہجری سنہ کی دوسری صدی کا نصف گزر گیا، اور اب لوگ طلب حدیث کے سلسلہ میں مختلف دیار و امصار کا سفر کرنے لگے، جو لوگ بلاد حجاز کا رخ کرتے تھے، وہ اہل حجاز سے حدیثوں کی سماعت کرتے تھے، مکہ میں سفیان بن عیینہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتے تھے، اور مدینہ میں امام مالکؒ سے استفادہ کرتے تھے، جو لوگ بصرہ اور کوفہ کا سفر کرتے تھے، وہ ان مقامات کے صحابہ اور تابعین کے آثار کی جستجو میں رہتے تھے، اسی طرح یمن اور شام کا سفر اختیار کرنے والے لوگ، ان آثار اور احادیث کو حاصل کرتے تھے جو وہاں کے مقیم صحابہ اور تابعین پر منتہی ہوتے تھے —!

امام احمد کا عصر دراصل اقطار مختلفہ کی احادیث کو مجتمع کرنے کا دور تھا، اور اس جمع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ احادیث واردہ کا مختلف فقہی ابواب کے ماتحت احاطہ کر دیا جائے، اور دراست کا اسلوب یہ تھا کہ احادیث کے اسناد پر نظر ڈال کر جو کچھ اس سے مستنبط ہوتا ہے، وہ معلوم کر لیا جائے، ساتھ اس کے ضعف و قوت کا موازنہ اور ناسخ و منسوخ کا علم حاصل ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہ میں جو تحقیق و تدقیق ہو رہی تھی، چونکہ اکثر پیش آمدہ مسائل میں بُعد اقالیم کی وجہ سے حدیثیں نہیں ملتی تھیں، بنابریں اس خلا کو قیاس و استنباط سے پُر کرنا پڑتا تھا، محدثین کے ان سفروں کی وجہ سے مختلف ممالک کی روایات میں تبادلہ ہوا، اور اس طرح ان مسائل میں حدیثیں دستیاب ہو گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ الحدیث پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

امام احمد اس میدان میں پیش رو بنکر آئے، ان کی حیثیت ایک مجاہد کی تھی، وہ حافظ حدیث تھے، ان کی "مسند" سب سے پہلی کتاب ہے جو سب شہروں کی احادیث کی جامع ہے "مسند" کے متعلق مزید تفصیل ہم آئندہ کریں گے ان شاء اللہ۔

دتھی، اس کی دراست بھی ضروری اور لازمی چیز تھی، امام مالکؒ نے راویانِ حدیث کے تفحص کا کام ایسے شروع کیا جیسے ایک ماہر صرّاف کھرے اور کھوٹے سکّہ کو پرکھتا ہے، اس کے علاوہ انہوں نے ایسی حدیثوں پر بھی تنقید کی جو قرآن اور سنّتِ مشہورہ کے معارض تھیں، پھر امام شافعی آئے، اور انہوں نے احادیثِ مرسلہ، منقطعہ، اور متصلہ کی تحقیق شروع کی، اور ان کے استدلال و مراتب کی ترتیب کو پرکھا، اور یہ بتایا کہ تعارض کی صورت میں کون سی حدیث قبول کی جائے گی اور کون سی رد کر دی جائے گی، پھر راوی اوّل سے لے کر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کی سند کامل کی چھان بین کا دور شروع ہوا، امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ وغیرہ کے زمانے میں سند کامل پر زیادہ توجہ نہیں کی جاتی تھی، اس لیے کہ تابعین کا دور تھا، ظاہر ہے کہ اکثر رواۃ تابعین (صحابہ کے شاگرد) ہی تھے۔

یہی وجہ تھی کہ امام مالک پوری سند کل آنے پر زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے، اور احادیث مرسلہ کو قبول کر لیتے تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک وہ لوگ معتبر تھے جو ان سے نقل کرتے تھے، لیکن جب تابعین کا دور ختم ہو گیا، اور عصرِ شافعی میں اور اس کے بعد سند کا سلسلہ لمبا ہوا، تو علمائے وقت نے سند کی بلندی اور پستی، اتصال و انقطاع پر توجہ شروع کی، اور رجال سند کی دیکھ بھال پر متوجہ ہوئے اس لیے کہ اس کی ضرورت تھی کہ پہلے راوی سے لے کر صحابی تک تمام راویوں کی عدالت پر تعیین ہو جائے تاکہ روایت کی طرف سے دل مطمئن ہو، اور مروی عمل کے لیے حجت بن جائے۔

غرض امام احمد، ایسے زمانہ میں ابھرے، جب حدیث و سنّت کا فن اس درجہ تک پہنچ چکا تھا، انہوں نے حدیث کو حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، تحصیلِ حدیث کے سلسلہ میں وہ سند اور علّت کا کھوج لگانے میں، بہت زیادہ دقّتِ نظر سے کام لیتے تھے، وہ کوئی ایسی حدیث قبول نہیں کرتے تھے جس کا راوی زندہ ہو، اور اس سے ملاقات ممکن ہو، وہ راستہ کی تمام دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کے در تک پہنچتے تھے، اور وہاں جا کر وہ روایت جو اس کی طرف منسوب ہوتی تھی حاصل کرتے تھے، وہ حاصل شدہ روایت پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ امکانی کوشش صرف کر کے غایت یعنی راوی تک پہنچ کر دم لیتے تھے، اور ان کا یہ رویّہ تحصیلِ حدیث اور صحتِ حدیث کی توثیق کے سلسلہ میں احتیاط پسندی، اور تقوے کی انتہا تھی۔

پورا پورا فائدہ اٹھایا، انہوں نے نہ صرف احادیث و آثار کی تعلیم ان لوگوں سے لی، جو اس کے ماہر تھے، بلکہ فقہ بھی ان اکابر سے حاصل کی جو اپنے تفقہ میں ممتاز تھے، اس سعی و جستجو، اور احتیاط و تقویٰ نے امام احمد کو حدیث اور فقہ کا امام بنا دیا۔

مناظروں کا دَور

یہ دور ممالک اسلامیہ میں فقہی ثمرات و نتائج کے اختلاط و امتزاج کا تھا، اس اختلاط و امتزاج نے فکر و رائے کے تصادم کی صورت پیدا کر دی، یہیں سے مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا، کبھی ایسے مناظروں کا مقصد حق تک پہنچنا ہوتا ہے، کبھی اپنے فکری مسلک کو دوسرے مسلک پر غالب کرنا، یا ایک رائے پر دوسری رائے کو ترجیح دینا۔

جب امام شافعی اپنے ابتدائی ایام میں بغداد میں مقیم تھے، وہاں قدم رکھتے ہی انہوں نے جو بات دیکھی، وہ مناظروں کی گرم بازاری تھی، اس زمانہ میں فقہاء عراق اور فقہ مدنی کے طرفداروں میں "دو گواہ" اور "قسم" کے معاملہ پر مناظرے ہو رہے تھے، فقہ مدنی کی رُو سے مدعی کے پاس دو گواہ نہ ہوں، تو ایک گواہ ہونا کافی ہے، دوسرے گواہ کی بجائے ایک گواہ کی گواہی کافی تھی، اور حنفداروں کے لیے مدعی سے قسم (بیانِ حلفی) لے لی جائے گی، اور مدعا علیہ سے قسم اس وقت تک لی جائے گی جب مدعی کے پاس ایک شہادت بھی موجود نہ ہو۔ اس مسئلہ میں امام شافعی نے مدنی فقہ کے طرفداروں کا ساتھ دیا، اسی لیے ان کا لقب ہی "ناصر السنّت" پڑ گیا۔

یہ مجادلات زبانی بھی ہوتے تھے اور تحریری بھی، جیسے امام لیث بن سعد کے نام امام مالک کا مکتوب، یہ مجادلات فقہیہ موسمِ حج میں مکّہ کے کوچہ و بازار میں برپا رہتے تھے، نیز امصارِ اسلامیہ مثلاً بغداد، بصرہ، کوفہ، دمشق اور فسطاط وغیرہ میں بھی ان کا سلسلہ جاری رہتا تھا، خلفاء اور امراء کی مجلسوں میں بھی ان کا چرچا رہتا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ کوئی فقیہ جہاں بھی جاتا تھا اُسے ایسے دعوت مناظرہ دینے والے بعض لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا جو کسی پیش آنے والے مسئلہ میں فقہی حل کے تلاش کے لیے اس سے تبادلۂ خیالات کرتے تاکہ شرعی حکم کا پتہ چل سکے۔ اگرچہ بعض وقت ایسے فقہاء بھی مناظرہ کے لیے تیار رہتے تھے جن کی غرض امرِ حق معلوم کرنا نہیں بلکہ یہ کہ کسی خاص نظریے اور مسلک کو خواہ تائید حاصل ہو، یا اپنی جودتِ طبع اور ذکاوت و فراست کا لوہا منوا لیا جائے۔

وجہمیہ، ومرجئہ وغیرہم اور محدثین کے مابین بھی تھا، پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا تھا، یہ کلامی علماء خود باہم بھی جدل وپیکار میں مصروف رہتے تھے، جیسا کہ معتزلہ وجبریہ اور علماءِ علم کلام کے مابین سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یا کلامی علماء اور غیر مسلم فلاسفہ کے درمیان، ——— جو دیارِ اسلامیہ میں مقیم تھے ——— آویزش ہوتی رہتی تھی، ان لوگوں کے مانند، جو فسطائیت سے متاثر تھے، جیسا کہ نظّام، اور متکلمین کے درمیان جنگ و جدل قائم تھی، یا نظّام اور مانوی فرقہ کے لوگوں کے درمیان فکری تصادم ہوتا رہتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ مختلف فرقوں، اور جماعتوں کے مابین فکری تصادم کا زمانہ تھا، نہ صرف فرقوں اور جماعتوں کے مابین، بلکہ مختلف عقلی مذہبوں، اور آراءِ فقہیہ کے مابین بھی تصادم اور آویزش کا چکر چل رہا تھا، اور فکری تصادم کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ مناظروں کی گرم بازاری ہو، تاکہ متنازعہ فیہ مسائل کے سلسلہ میں راہِ حق وصواب تک پہنچنا آسان اور ممکن ہو جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض دفعہ ان مناظروں اور مجادلوں کا مقصد محض غلبہ اور فکری تسلط حاصل کرنا بھی ہوتا تھا ——— یعنی دونوں قسم کے مناظرین اس دَور میں موجود تھے۔

امام شافعیؒ کی کتاب "الام" اس دَور میں علمی روح، تصادمِ فکری، ذہنی آویزش، اور جدل وپیکار کا جامع نقشہ اگر کسی ایک شخصیت میں جلوہ گر نظر آتا ہے تو وہ امام شافعی کی ذات ہے۔ وہ اس عہد کی روح کے پیکر تھے، فقہ وسنّت کے سلسلہ میں جو فکری اشکال رونما ہوئے تھے، ان کی داستان بھی وہ خوب بیان کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ کی ذات بیانِ حال ہے اُن لوگوں کا جو سنّت سے دلیل لانے کے منکر تھے، ——— جیسے بعض علماءِ بصرہ ——— اور ان لوگوں کا بھی، جو خبرِ آحاد سے احتجاج کے قائل نہیں تھے، بلکہ صرف اس حدیث کو قبول کرتے تھے جو متواتر ہو یعنی جس کے روایت کرنے والے ایک جماعت ہوں۔

امام شافعیؒ نے ان کا رد کیا، ایسے بہت مضبوط طریقہ سے کہ ان کا ناطقہ بند کر دیا اور انہیں مجالِ دم زدن نہ رہی، یہاں تک کہ حق ان کی زبانوں پر جاری ہو گیا۔

امام شافعیؒ ان لوگوں کا بھی رد کرتے ہیں جو قیاس کو خبرِ آحاد پر ترجیح دیتے تھے یا بعض آحاد حدیثوں کو قرآن کے "عام" کے سلسلہ میں ناقابلِ قبول خیال کرتے تھے۔ امام شافعیؒ نے ان پر بھی تنقید کی ہے، جو آثارِ صحابہ

اور فقہ العراقیین، یا الرد علیٰ سیر الاوزاعی، اس میں ہمیں استحسان کے ابطال کے سلسلہ میں بعض دلچسپ اور کارآمد چیزیں ملتی ہیں، اس مسئلہ میں امام شافعی، مالکیوں اور عراقیوں، دونوں کا رد کرتے ہیں۔ بلکہ ان تمام لوگوں کا رد کرتے ہیں جو استدلالِ فقہی میں نص سے تجاوز کر جاتے ہیں، یا نص پر عمل کرنے کے سلسلہ میں راہِ صواب سے ہٹ جاتے ہیں۔

امام شافعی کی کتاب الام کے سوا، کوئی کتاب ایسی نظر نہیں آتی جس کے مطالعہ سے پڑھنے والا، اس عصر کے اجتہاد اور خاص طور پر اس زمانہ کی فقہی کیفیتوں اور صورتوں کا صحیح اندازہ کر سکے، جس میں امام احمد کی نشوونما ہوئی، صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں موافق ومخالف ہر طرح کے دلائل، ان کی تائید وتنقید کے سلسلہ میں تفصیلی مواد مل سکتا ہے۔

یہ کتاب (الام) صرف یہی نہیں کہ اپنے زمانہ کی روحِ فکری کی معنوی طور پر آئینہ دار ہے، بلکہ اس کی شکل وصورت کی وضاحت بھی بڑی خوبی سے کرتی ہے۔ اس میں ہمیں ان مناظروں کی داستانیں بھی ملتی ہیں جو امام شافعی اور ان کے مدمقابل لوگوں کے مابین ہوئے۔

مذکورہ حقائق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ دورِ بحث وجدل، اور فکری آویزش، نیز تکمیلِ علومِ دینیہ کا دَور تھا۔ اس میں ہمیں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو سنّت کا انکار کرتے ہیں، ایسے بھی جو خبرِ آحاد سے احتجاج کے قائل نہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مؤثرات کا امام احمد نے کیا اثر قبول کیا؟

بات یہ ہے کہ اس زمانہ کے مفکرین پر اپنے عہد کے مؤثرات، مختلف اور متنوع صورتوں میں اثرانداز ہوئے۔ خاص طور پر عہدِ عباسی کا وہ زمانہ جس میں امام احمد نے زندگی گزاری، مختلف قسم کے اثرات رکھتا تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ افکار وآراء کا تصادم جاری تھا۔ اگر ایک طرف وہ لوگ بات پاتے ہیں جو خبرِ آحاد کو قابلِ حجت نہیں سمجھتے تو دوسری طرف ایسے بھی ہیں جو خبرِ آحاد کو قبول تو کر لیتے ہیں لیکن قیاس کو اس پر مقدم رکھتے ہیں۔ پھر وہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو صحابہ کے فتاویٰ کو سنّت قرار دیتے اور ان میں اور اخبارِ آحاد میں موازنہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو سنّت سے تمسک کے معاملہ پر زیادہ مضبوط ہیں، یہ لوگ سنّت کے خلاف کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ نیز یہ لوگ قرآن کے "عام" کو حدیث سے "خاص" کرنے کے قائل ہیں۔ کیونکہ حدیث قرآن حکیم کی تفسیر اور اس کی وضاحت ہے، لہٰذا اسی کو یہ حق حاصل ہے

اس رنگا رنگ دسترخوان سے امام احمد نے اپنے ذوق کی چیزیں چن لیں۔ ان کا رجحان شروع ہی سے سنت کی طرف رہا۔ لیکن ساتھ ہی فتاوئے صحابہ و کبار تابعین کے علم حاصل کرنے کا بھی خاص شوق تھا۔ وہ ان ہی چیزوں سے تخریج مسائل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحابہ و تابعین کے آثار سے ان کا شغف اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ انہیں تابعین میں شمار کیا جانے لگا، اگرچہ انہوں نے ان بزرگوں سے نہ ملاقات کی تھی، نہ ان کے دیدار سے شادکام ہوئے تھے۔

اگرچہ یہ دور فکری جنگ و پیکار کا تھا، اور امام احمد کے معاصرین میں سے ایک بڑا گروہ اس میں مبتلا تھا، لیکن اس زمانہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس سے نفرت کرتے تھے، اس لیے کہ اس طرح شکوک پیدا ہوتے تھے، اور فکر میں فساد نمایاں ہوتا تھا۔ چنانچہ امام مالکؒ، امام سفیان ثوریؒ، اور امام ابن المبارک وغیرہ ان لوگوں میں تھے جو جدل و مناظرہ کو سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان حضرات کی یہ پختہ رائے تھی کہ دین قویم کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ کوئی مومن اپنے دین کو ہدف جنگ و پیکار اور نشانۂ خصومات فکریہ بنائے۔ امام احمد نے یہی مسلک اختیار کیا۔ چنانچہ وہ بحث و جدل اور حریب عقائد برپا کرنے والوں سے سخت و شدید نفرت کرتے تھے۔

فِرَقِ اسلامیہ

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر بعض فرقوں کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم بہت ہی اختصار سے کام لے کر ان فرق مختلفہ کا ذکر کر دیں، تاکہ قارئین کو ان سے واقفیت حاصل ہو جائے۔ ان دنوں یہ فرقے مسلمانوں کے اندر اپنے ایسے افکار و خیالات کی اشاعت کر رہے تھے جو محدثین اور فقہاء کے منہاج سے بالکل مختلف تھے۔

اگرچہ ان فرقوں میں سے بعض کے سبب امام احمد کو ابتلا اور اذیت سے دوچار ہونا پڑا، لیکن ہم ان کا ذکر شائستگی کے ساتھ کریں گے۔ ان فرقوں کے ذکر کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان فرقوں کے افکار و خیالات کی روشنی میں ان نظریات پر امام احمد کی ان آراء کا مطالعہ کیا جا سکے، جنہیں ہم عقائد پر ان کی آراء کے سلسلے میں آئندہ ذکر کریں گے۔

امام صاحب کو جن فرقوں سے سابقہ پڑا ہے وہ پانچ ہیں:

(۱) شیعہ، (۲) خوارج، (۳) قدریہ، (۴) جہمیہ، (۵) مرجئہ۔

فرقۂ شیعہ اور اس کی ذیلی شاخیں شیعہ فرقہ کا شمار اسلام کے اولین فرقوں میں سے ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخر عہد میں یہ ظاہر ہوئے۔ حضرت علیؓ کے عہد میں انہوں نے زور پکڑا، پھر جیسے جیسے بنو امیہ کے ہاتھوں بنی ہاشم (اہل بیت) پر ظلم ہوتا رہا، ویسے ویسے ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔

عام طور پر شیعوں کا مسلک یہ ہے کہ حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے مسلمانوں ... شیعہ فرقہ مختلف ... فرقوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں

جو تقدیس علیؓ میں حدودِ دین سے تجاوز کر جاتے ہیں، اور بعض میانہ رو اور معتدل مزاج ہیں اور حدودِ دین سے تجاوز نہیں کرتے، یہ لوگ صحابہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے، نہ ان میں سے کسی کو گناہ گار قرار دیتے ہیں، ان معتدلین اور میانہ رو شیعوں میں زیدیہ فرقہ ممتاز ہے، یہ فرقہ زید بن علی زین العابدین کے پیروؤں پر مشتمل ہے۔ زیدیہ فرقہ کے لوگ شیخین یعنی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی صحت امامت کے قائل ہیں، فاضل کی موجودگی میں مفضول کی امامت بھی جائز خیال کرتے ہیں۔ یہ اس کے بھی قائل ہیں کہ ایک ہی وقت میں دو امام ہو سکتے ہیں، اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے رقبہ کا امام مانا جائے

زیدیہ کا اعتقاد یہ بھی ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب دائمی طور پر عذابِ جہنم میں مبتلا کیا جائے گا، اس لیے کہ وہ مومن اور کافر کی درمیانی منزل پر گامزن ہے ——— جیسا کہ معتزلہ کی رائے ہے۔

ہشام بن عبد الملک کے عہدِ خلافت میں زید قتل کر دیئے گئے، یہ واقعہ ۱۲۲ھ کا ہے۔

کیسانیہ | زیدیوں کے علاوہ شیعوں کے بعض دوسرے ایسے فرقے بھی ہیں جنہیں اسلام سے خارج نہیں سمجھا سکتا۔ اگرچہ ان کے عقائد میں بہت زیادہ غلو موجود ہے۔ مثلاً کیسانیہ فرقہ، یہ لوگ مختار بن عبید الثقفی کے اتباع تھے، مروانی حکومت کے آغاز میں یہ فرقہ ظاہر ہوا تھا، ان کا اعتقاد تھا کہ خلافت صرف اولادِ علیؓ کا حق ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ کو، پھر حضرت حسینؓ کو اس کے بعد محمد بن الحنفیہ کو خلیفہ مانتے تھے، یہ لوگ تناسخِ ارواح کے بھی قائل تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں،

(۱) ظاہر ——— اور

(۲) باطن

اور امام خاص طور پر علمِ باطن کا رمز آشنا ہوتا ہے۔

امامیہ اثنا عشریہ | شیعوں کے غالی فرقوں میں امامیہ اثنا عشریہ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ بارھواں امام سُرَّ مَن رَّای (ایک غار) میں غائب ہو گیا، یہ لوگ اب تک اس کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں، ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ امام اپنے وصف سے نہیں بلکہ منصوص ہوتا ہے، زیدیہ کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ اثنا عشری حضرات حسینؓ کے بعد محمد باقر کو، پھر جعفر کو امام مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ بارھویں امام تک پہنچ جاتے ہیں جو پوشیدہ ہو گئے، اور جن کی آمد کا انتظار کیا جا رہا ہے، موجودہ زمانہ میں ان لوگوں کو فارس (ایران) میں غیر معمولی اکثریت حاصل ہے۔

امامیہ اسماعیلیہ | شیعہ فرقوں میں ایک فرقہ امامیہ اسماعیلیہ کا بھی ہے۔ حضرات اثنا عشری کی طرح ان کا بھی یہ اعتقاد ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام کی تعیین نام کے اعتبار سے ہوئی، یہ لوگ بھی اثنا عشریوں کی طرح محمد باقر کے بعد جعفر کو امام مانتے ہیں۔ پھر جعفرؒ کے بعد ان کے بیٹے اسماعیل کو، ان کا عقیدہ ہے کہ امام کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوشیدہ کرے، اسی لیے انہیں "باطنیہ" بھی کہتے ہیں۔ یہی لوگ ایک مدت تک مصر پر حکومت کرتے رہے۔ تاریخ میں دولتِ فاطمیہ کے نام سے یہی خاندان مشہور ہے۔

سبئیہ | شیعوں کے وہ فرقے، جو اپنی بے اعتدالی کے باعث دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، ان میں فرقہ "سبئیہ" ممتاز ہے، یہ لوگ عبد اللہ ابن سبا کے پیروکار ہیں، یہ لوگ حضرت علیؓ کو خدا مانتے ہیں، چنانچہ اسی جرم میں ان میں سے کچھ لوگ نذرِ آتش بھی کر دیئے گئے۔

غرابیہ | انہی گمراہ، اور خارج از اسلام شیعہ فرقوں میں ایک فرقہ "غرابیہ" بھی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ نبوت کا منصب حضرت علیؓ کو تفویض ہوا تھا، لیکن جبریل سے غلطی ہو گئی، وہ وحی لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے، اس لیے کہ آں حضرتؐ اور علیؓ میں بہت زیادہ مشابہت تھی، جیسے ایک کوّے کو دوسرے کوّے سے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

خوارج اور ان کے ذیلی فرقے | اسلام کے سیاسی فرقوں میں ایک فرقہ خوارج کا بھی ہے۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شریک تھے۔ انہی نے حضرت علیؓ کو خود ہی (صفین میں) تحکیم قبول کرنے پر آمادہ کیا، اور جب انہوں نے تحکیم قبول کر لی تو یہ چیخنے لگے،

لاحکم الا للہ (حکمرانی صرف خدا کی ہے)

ان کا خیال تھا کہ تحکیم قبول کر کے علیؓ نے کفر کا ارتکاب کیا ہے، اور اب ان کے لیے ضروری تھا کہ اس کفر سے کنارہ کش ہو جائیں اور کفر کا ارتکاب کرنے کے سلسلہ میں توبہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی باتیں تسلیم نہ کیے جانے کے باعث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی۔ حضرت علیؓ نے ان سے معاندکیا، حتیٰ کہ ان کا زور توڑ دیا، لیکن انہوں نے حضرت علیؓ کو اپنی طرف اس درجہ متوجہ رکھا کہ وہ پوری طرح حضرت معاویہؓ کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ درحقیقت ان کے ضعف کا سبب یہی تھے پھر جب

اموی حکومت پورے طور پر قائم ہو گئی تو پھر یہ ابھرے، اور انہوں نے پے بہ پے خروج و بغاوت کی
ان کا یہ عقیدہ تھا کہ خلافت کے لیے کسی خاندان کی تخصیص ضروری نہیں ہے، بلکہ ہر عاقل و
مسلمان خلیفہ ہو سکتا ہے، البتہ بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی عصبیت وابستہ نہ ہو تاکہ
ضرورت ہو تو اسے مسند خلافت سے معزول کر دینا آسان ہو۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ گناہ کا مرتکب
کافر ہے۔

ازارقہ اور اباضیہ خوارج بھی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جو اپنے فکر و عمل کے اعتبار سے
اور اعتدال میں مشہور ہیں، خوارج کے بہت زیادہ غالی فرقوں میں ایک فر
"ازارقہ" ہے، یہ نافع بن ازرق کے متبعین ہیں۔ ان میں سے جو فرقہ مسلمانوں کی جماعت سے بہت ز
قریب ہے وہ "اباضیہ" ہے، یہ عبداللہ بن اباض کے پیروکار ہیں، ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان ک
مخالف کافر ہیں نہ مشرک، لیکن کفران نعمت کے مرتکب ضرور ہیں، اس لیے یہ لوگ اپنے مخالفین کا خو
حرام سمجھتے تھے۔ یہ عام مسلمانوں کی شہادت ... قبول کر لیتے ہیں، اباضیہ کی کافی تعداد مغرب
پائی جاتی ہے۔

اباضیہ اور ازارقہ میں بھی کئی ٹولیاں ہیں، انہی میں "نجدات" ہیں۔ یہ لوگ نجدہ بن عویمر حنفی کے
اتباع ہیں، جو قبیلۂ بنی حنیفہ کا ایک فرد تھا، خارجیوں کا ایک فرقہ "صفریہ" بھی ہے۔ یہ لوگ زیا
بن الاصفر کے پیرو ہیں۔ ایک دوسرا خارجی فرقہ عجاردہ کہلاتا ہے۔ اس کا رہنما عبدالکریم ابن عجرد تھ

یزیدیہ اور میمونیہ خوارج کے دہ فرقے جو اپنی بے راہ روی اور بے اعتدالی کے سبب اسلام
بالکل خارج ہیں، دو ہیں:۔

(۱) یزیدیہ

(۲) میمونیہ

ان میں سے یزیدیہ، یزید بن انیسہ کے متبع ہیں، ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ عنقریب خدائے تعالیٰ
عجم میں سے ایک نبی بھیجے گا جس پر اپنی کتاب نازل کرے گا جو شریعت محمدیہ کو منسوخ کر دے گی۔
میمونیہ وہ لوگ ہیں جو اپنا امام میمون عجردی کو مانتے ہیں، یہ لوگ بیٹے کی نواسیوں سے اور بھائی
بہنوں کی اولاد (یعنی لڑکیوں) سے نکاح جائز سمجھتے ...

شمار نہیں کیا ہے، انہی میمونیہ کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ یہ لوگ سورۂ یوسف کا انکار کرتے
ہیں، اور وہ اسے قرآن میں شامل نہیں سمجھتے۔

اعتقادی فرقے اب تک جن فرقوں کا ذکر تھا یہ زیادہ تر سیاسی قسم کے تھے، اب ہم ان فرقوں کا
ذکر مختصر طور پر کریں گے جو اپنی وضع و ہیئت کے اعتبار سے بجا طور پر اعتقادی
فرقے کہلائے جا سکتے ہیں، انہوں نے وہ مسائل پیدا کیے جن کا تعلق اعتقادیات سے ہے۔

مرجئہ ان فرقوں میں ایک فرقہ مرجئہ کا بھی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اصول دین کو سیاست سے بیوست
کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی فکر و دائے کے اعتبار سے یہ لوگ خوارج کا جواب ہیں، مثلاً
یہ سوال کہ معصیت کا ارتکاب کرنے والا دائمی طور پر جہنم میں رہے گا یا نہیں؟ اس کا جواب مرجئہ یہ
دیتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ اگر معصیت کا ارتکاب کیا جائے، تو وہ کچھ ضرر نہیں پہنچاتی جس طرح کفر
کے ساتھ اطاعت بیکار ہے
معتزلہ ہر اس شخص کو "مرجی" کہتے تھے جس کا یہ اعتقاد نہ ہو کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ابدی جہنمی ہے
اس لیے امام ابو حنیفہ کو بھی مرجئی کہا جانے لگا۔ شہرستانی نے اپنی کتاب میں امام ابو حنیفہ کو ان
"مرجئہ اہل السنۃ" میں شمار کیا ہے جو گنہگاروں کے لیے عفو الٰہی کی امید رکھتے ہیں، نہ ان لوگوں کے
لیے جو منکرات کو جائز اور مباح قرار دیتے ہیں۔

جبریہ یا جہمیہ جبریہ، یا جہمیہ فرقہ کا شمار بھی اعتقادی فرقوں میں ہوتا ہے، ان لوگوں کا عقیدہ ہے
کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں اس کے ارادہ کو دخل نہیں ہوتا، اصل فاعل خدائے
بزرگ و برتر ہے، ہر اس چیز کا جو کسی انسان کے ہاتھوں انجام پاتی ہے، خواہ وہ خیر ہو یا شر، انسان اپنے
افعال کے حدود میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک تنکا جسے ہوا جنبش دیتی رہتی ہے۔ اموی عہد میں
یہ لوگ جبری کہلانے لگے، کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے علانیہ اس عقیدہ کا اظہار کیا وہ جہم بن
صفوان تھا، اسی مناسبت سے اس فرقہ کو جہمیہ کہنے لگے، اور یہ جہم ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ کہا تھا
کہ قرآن مخلوق ہے، اسی لیے امام احمد خلق قرآن کا عقیدہ رکھنے والوں کو جہمیہ کا نام دیتے تھے، اس تح
... رکھنا چاہیے کہ معتزلہ جہم کے اس قول کے جو ارادۂ انسانی سے متعلق تھا، سخت اختلاف

قدریہ اعتقادی فرقوں میں سے ایک فرقہ "قدریہ" بھی ہے۔ ان کا قول تھا کہ انسان اختیاری طور پر اپنے افعال صادر کرتا ہے۔ یہی لوگ تاریخِ اسلامی میں معتزلہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ عباسیوں کے عہد میں انہوں نے بڑا مرتبہ اور طنطنہ حاصل کر لیا تھا اور فکرِ اسلامی پر ان کی اثر اندازی بہت بڑھ گئی تھی، اس لیے کہ یہی لوگ تھے جنہوں نے زنادقہ کے رد پر کمر باندھی۔

معتزلہ کے حسبِ ذیل پانچ اہم اصول ہیں:۔

(۱) توحید —— اس لفظ کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے واحد ہے، اور مخلوق میں سے کوئی بھی اس کی کسی صفت میں شریک نہیں ہے، اسی لیے یہ لوگ دیدارِ الٰہی کی نفی کرتے ہیں۔

(۲) عدل —— عدل اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی خصوصیت ہے، لہٰذا اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہوا کہ وہ مخلوق کو اس کے افعال کے صدور کا اختیار دے، تاکہ ثواب و عقاب کا اظہار اس کی طرف سے ہو سکے۔

(۳) وعد و وعید —— تاکہ نیکو[کار کو اچھ]ی جزا اور بدکار کو سزا دے، اور یہ کہ خدا گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو بخشائش نہیں کرتا۔

(۴) مرتکبِ کبیرہ نہ مومن ہے نہ کافر —— گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو یہ لوگ "فاسق مسلمان" کہتے ہیں، مومن نہیں تسلیم کرتے۔ ان کی نظر میں وہ دائمی طور پر عذابِ جہنم بھگتے گا۔

(۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر —— ان کا اعتقاد ہے کہ مسلمان کو نیک کام کا حکم دینا، اور بُرے کام سے روکنا فرض ہے، تاکہ دعوتِ اسلامیہ کی اشاعت اور گمراہوں کو راہِ راست دکھائی جا سکے۔ ہر شخص کو اپنی استطاعت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔ شمشیر زن کو تلوار سے، اور زبان آور کو زبان سے، اور خدائے تعالیٰ ہادی اور رہبر ہے۔

حِصہ دوم

احمدؒ کی فقہ و آراء

امام احمدؒ کے افکار و آراء

حضرت امام احمد بن حنبلؒ ان لوگوں میں نہیں تھے جو مختلف قوموں اور ملتوں، جماعتوں اور فرقوں کے حالات و مجادلات کی دراست پر اکتفا کرتے ہیں، نہ وہ ان لوگوں میں تھے جو صرف دراسات عقلیہ کو ــــ جنہیں کتاب و سنت سے استناد حاصل نہ ہو ــــ اپنا شعار بنا لیتے ہیں، بلکہ وہ اپنے مزاج اور سرشت کے لحاظ سے، ہر قسم ... سنت ناپسند کرتے تھے، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، اس لیے کہ جدل و پیکار اور ظنی دعاوی ... ہوتا ہے کہ حقائق فنا ہو جاتے ہیں اور اس لیے کہ انہوں نے علم حاصل کیا تھا طلب حقائق کے لیے، علوم منقول ــــ کتاب و سنت ــــ کی دراست کے لیے، نہ یہ کہ کسی طور بھی ہو، حریف سے معرکہ آرا ہوں اور اس پر غلبہ و تسلط حاصل کریں، جیسے تلواریں سونت کر سپاہ میدان جنگ میں کود پڑتی ہے، یہی وجہ تھی کہ امام احمد اس رائے پر قائم تھے کہ جس نے علوم دینیہ میں جدل و پیکار کو دخل دیا تو گویا اس نے اپنے دین کو خصومات کا ہدف اور طعن و اعتراض کا نشانہ بنا لیا، اور یہ ایسا بات نہیں تھا جس کی طرف امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ذرا بھی دھیان دیتے۔

اور جب کہ امام احمدؒ صرف دراست سنت نبوی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے، اسی عہد میں نئے نئے مباحث اور مسائل پیدا ہو رہے تھے، عقائد کے سلسلہ میں کلامی جدل و پیکار کا سلسلہ جاری تھا۔ خلافت، اور خلفائے سابقین کے بارے میں معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا صحابۂ کرام میں سے کسی کی باہم فضیلت دینے کا سوال زیر بحث تھا، امام احمد ان نزاعات سے بالکل الگ تھلگ تھے۔
اس لیے کہ وہ جانتے تھے ...

اور خیر کا پہلو اگر ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔

لیکن زمانہ کے ڈھنگ بھی نرالے ہیں، ماہ و سال کی گردش نے حالات ایسے پیدا کر دیئے کہ امام احمد اپنی سرگرمیاں صرف علم دینی تک محدود نہ رکھ سکے ــــ انہیں اضطراب فکر، اختلاف خیال، اور حرب عقائد کی معرکہ آرائیوں میں باول ناخواستہ حصہ لینا پڑا، ــــ خلق قرآن کی داستان گذشتہ اوراق میں بیان کی جا چکی ہے ــــ! پھر بھی امام صاحب نے جو کچھ کیا وہ یہ کہ سلف کا عقیدہ بغیر کسی نزاع و پیکار کے بیان کر دیا۔ اس بیان اور عقائد غیر سلفی کے بطلان جدلیات میں نہ الجھتے ہوئے واضح کیا اور یہ اعلان کرکے ہر مصیبت جھیلی کہ خلق قرآن کا عقیدہ بدعت ہے، اور یہ کہ اس پر انکار و و حزم دی ہے۔

امام احمدؒ جس طرح اپنی فقہ میں سلفی تھے اسی طرح عقائد میں بھی تمام تر سلفی تھے، فتنہ پسندی کی خاطر متشابہات کی پیروی نہیں کرتے تھے، جو کچھ قرآن اور سنت صحیحہ نبویہ سے ثابت تھا، وہی کہتے تھے ان کا قول تھا "جو کچھ ہمارے رب کے پاس سے آیا ہے اس پر ہم ایمان رکھتے ہیں ــــ!"

امام احمدؒ کا مسلک صحابہ کرام کے بارے میں

اکثر علمائے سنت کی طرح امام احمد کا مسلک بھی یہ تھا کہ وہ صحابہ کو ان کے درجہ میں رکھتے تھے، ان میں سے کسی پر طعن و جرح نہیں کرتے تھے، اس معاملہ میں ان کا مسلک وہ تھا جو حضرات تابعین کا تھا جنہوں نے دین کا علم انہی صحابہ سے حاصل کیا تھا، یہ سیاسی مناقشات میں حصہ لینے سے گریز کرتے تھے، حکام وقت سے ٹکراتے نہیں تھے، صرف حصول علم میں لگے رہتے تھے، عام اس سے کہ ان کے جاری کردہ احکام کے اسالیب سے وہ راضی ہوں یا ناراضامند۔ چنانچہ امام حسن بصری، اور ابن مسیّب وغیرہ ان تابعین میں تھے جو اموی حکومت سے خوش نہیں تھے، لیکن حلقۂ اطاعت سے باہر نہیں ہوئے۔ جماعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اپنی توجہات کا مرکز صرف علم اور عامۃ الناس کی ہدایت اور رہبری کو رکھا۔

حضرت امام بالکل اسی مسلک پر چلے۔ انہوں نے بطور خود سیاسیات میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا، انہوں نے خروج اور بغاوت کی نہ صرف کبھی حوصلہ افزائی کی، بلکہ اس کی مخالفت کی، لیکن صورت حال یہ تھی کہ صحابہ کی باہمی فضیلت کا چرچا بزم و انجمن کا موضوع بنا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ مامون نے بھی اپنی مجلس مناظرہ میں اس موضوع کو اپنا لیا، اس نے جملہ صحابۂ کرام پر تفضیل علیؓ کا اعلان کر دیا، اور اصرار کیا کہ

اپنے آپ کو گویا شیعہ جماعت میں شریک کر لیا، بلکہ عمل کے اعتبار سے بھی یہ کیا کہ اپنے بعد سے اپنا جانشین نامزد کیا وہ بیکے از اولادِ علیؓ تھا، لیکن مامون کی زندگی ہی میں اس کا انتقال ہوگیا، اب شاید وہ اپنے مسلک سے رجوع کر چکا تھا۔ اس مرتبہ اولادِ علیؓ میں سے کسی اور کو نامزد کرنے کے بجائے اس نے اپنے بھائی معتصم کو خلیفہ نامزد کیا۔

ان حالات میں امام احمد ——— جب کہ ان کی حیثیت امام فی الحدیث کی بھی تھی ——— خاموش نہیں رہ سکتے تھے، انہوں نے صحابۂ کرام کے مناقب و مراتب واشگاف طور پر بیان کیے، انہوں نے مختصر طور پر ولایتِ خلافت کا بھی بیان کیا، نیز وجوبِ طاعت پر بھی اپنے خیالاتِ گرامی کا اظہار کیا، انہوں نے خلفا کے خلاف بغاوت، شورش، اور خروج کے خلاف بھی اپنے خیالات ظاہر کیے۔ انہوں نے بغاوت اور خروج کے مضار و فتن بھی واضح طور پر بیان کیے اور بتائے۔

اب ہم عقائد کے سلسلہ میں امام احمد کے آراء اور سیاسی مسائل سے متعلق ان کے افکار کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

بعض عقائد سے متعلق امام احمدؒ کی رائے

مسائل نمایاں ہوئے جو اسلامی عقائد سے تعلق رکھتے تھے، جنہیں مسلمانوں میں پیدا ہونے والے نئے نئے فرقے پیدا کرتے، اور عوام میں ان کو پھیلاتے تھے۔ اور عامۂ مسلمین کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی مشکلات کا حل صرف فقہاء اور محدثین سے کراتے تھے، دوسرے لوگوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتے تھے، ان مسائل میں جو مسئلے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) ایمان کی حقیقت

(۲) مسئلہ تقدیر و افعالِ انسان و ارادۂ الٰہی۔

(۳) گناہ، اور ایمان پر اس کا اثر، نیز یہ کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب جنت میں داخل ہوگا یا دائمی طور پر عذابِ جہنم کا سزاوار قرار پائے گا۔

(۴) صفاتِ الٰہی

(۵) دیدارِ خداوندی ——— وغیرہ۔

یہ اور ان سے متعلقہ مسائل تھے [illegible]

ہم اختصار و ایجاز کے ساتھ امام صاحب کی رائے بیان کرتے ہیں۔

۱- ایمان

"ایمان کی حقیقت" ایسا مسئلہ ہے جو اپنے اندر متعدد اختلافی پہلو رکھتا ہے، اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ اس نے متعدد فرقے پیدا کر دیئے۔ جہمیہ کا خیال یہ ہے کہ ایمان معرفت کا نام ہے اگرچہ وہ عمل سے ہم آہنگ نہ ہو۔ انہوں نے یہ تصریح بھی نہیں کی ہے کہ معرفت کے ساتھ اذعان بھی واجب ہے، معتزلہ کا یہ خیال ہے کہ اعمال ایمان کا جزو ہیں، ان کے نزدیک جو شخص کبائر کا ارتکاب کرتا ہے، وہ مؤمن نہیں رہتا، اگرچہ وحدانیتِ خداوندی پر عقیدہ رکھتا ہو، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مانتا ہو، لیکن وہ کافر بھی نہیں ہوتا یعنی نہ پورا مومن نہ پورا کافر، بلکہ ان دونوں کے بین بین۔ خوارج کا خیال ہے کہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن نہیں رہتا کافر ہو جاتا ہے، اس لیے کہ عمل ایمان کا جزو ہے۔

ضروری تھا کہ فقہاء اور محدثین اپنے اپنے انداز میں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے، اور ظاہر ہے ان کی روش یہی ہو سکتی تھی کہ وہ عقلِ مجرد پر اعتماد کرنے کے بجائے کتاب و سنت پر بھروسہ کرتے، پھر بھی اس بارے میں ان کے آراء باہم ایک دوسرے سے کو زیادہ بعید نہیں ہیں تاہم کسی نہ کسی حد تک مخالف ضرور ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایمان غیر متزلزل اعتقاد کا نام ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس اعتقاد کی علامت صرف یہ ہے کہ آدمی خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت کا اقرار کرے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عمل ایمان کا حصہ نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک ایمان ایک ایسی مجرد حقیقت کا نام ہے، جو بجائے خود کامل ہوتی ہے، اور کمی زیادتی قبول نہیں کرتا، حضرت ابوبکرؓ کا ایمان بھی ویسا ہی ہے جیسا تمام مسلمانوں کا۔ حضرت ابوبکرؓ کو مسلمانوں پر جو فضیلت حاصل ہے وہ عمل کی بنا پر ہے (نہ کہ ایمان کی بنا پر) اور اس بنا پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو منجملہ دس لوگوں کے جنت کی بشارت دی تھی۔ اب اس کے بعد مسلمانوں کے اقدار کا باہمی تفاوت صرف عمل، اور تعمیلِ حکمِ الٰہی، اور اجتنابِ نواہی کی بنا پر رہ گیا۔

امام مالکؒ کے نزدیک ایمان نام ہے تصدیق و اذعان کا، لیکن ان کے نزدیک ایمان میں زیادتی ممکن ہے، اس لیے کہ قرآن میں بعض مسلمانوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان کا ایمان بڑھتا ہے۔ جس طرح امام مالکؒ کے نزدیک ایمان میں اضافہ ہو سکتا ہے اسی طرح کبھی وہ اس کی کمی کی صراحت بھی کر دیتے تھے، لیکن ایسا [illegible]

مسئلہ ایمان میں امام احمد کا مسلک

اب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مسلک دیکھیے، متعدد مواقع پر انہوں نے اس کا اظہار فرمایا ہے کہ ایمان نام ہے قول و عمل کا وہ گھٹ بھی سکتا ہے اور بڑھ بھی سکتا ہے، حافظ ابن الجوزی کی کتاب "المناقب" میں وارد ہوا ہے کہ امام احمد فرمایا کرتے تھے:-

"ایمان نام ہے قول و عمل کا، وہ گھٹ بھی سکتا ہے، اور بڑھ بھی سکتا ہے، نیکو کاری تمام تر ایمان ہی ہے، اور معاصی سے ایمان میں کمی ہو جاتی ہے۔"[1]

نیز وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے:-

"اہل السنت والجماعت مومن کی صفت یہ ہے کہ اس امر کی شہادت دے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، نیز یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، نیز دوسرے انبیاء اور رسل جو کچھ لائے ہیں ان کا اقرار کرے، اور جو کچھ اس کی زبان سے ظاہر ہو وہ اس کے قلب سے ہم آہنگ ہو، پس ایسے آدمی کے ایمان میں کوئی شک نہیں۔"[2]

ایک دوسرے موقع پر امام احمد [illegible] فرمایا:

"ایمان عبارت ہے قول و عمل سے، وہ کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی ہو سکتا ہے؛ زیادتی اس وقت ہوتی ہے جب کوئی نیک کام کیا جائے، اور کمی اس وقت ہوتی ہے جب کسی کار بد کا ارتکاب کیا جائے۔ ایسی صورت میں انسان ایمان سے خارج ہو کر صرف اسلام پر قائم رہتا ہے، پس اگر وہ توبہ کرے تو ایمان کی طرف اس کی بازگشت ہو جائے گی، آدمی اسلام سے صرف اس وقت خارج ہوتا ہے جب وہ خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ کسی اور کو شریک کرے، یا خدا کے فرض کیے ہوئے فرائض میں سے کسی فریضہ کی بجا آوری کو از روئے سرکشی بروئے عمل نہ لائے، لیکن اگر کسی فریضہ کو ترک غفلت اور سستی کے باعث اس نے کیا ہے نہ کہ سرکشی کی بنا پر، تو یہ خدا کی مرضی ہے کہ چاہے عذاب دے چاہے معاف کر دے۔"[3]

امام احمد کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حقائق تین ہیں:

[1] المناقب لابن الجوزی ص ۱۶۵ [2] ایضاً ص ۱۶۸

۱۔ ایمان،

۲۔ اسلام،

۳۔ کفر۔

اسلام ایمان اور کفر کے درمیان کی ایک چیز ہے، نیز یہ کہ ایمان کے ساتھ عصیان جمع نہیں ہو سکتا اور یہ کہ اگر کوئی شخص معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ مسلم تو رہتا ہے لیکن مومن نہیں رہتا، یہاں اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ امام احمد کی یہ بات کچھ معتزلہ کے خیالات سے لگا کھاتی ہے، لیکن فوراً ہی ہم دونوں میں تفاوت راہ بھی محسوس کر لیتے ہیں، اس لیے کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان گنہگار ہو کر مرے وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اور امام احمد، جو شخص گنہگار ہو کر مرے اس کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیتے ہیں کہ چاہے تو معاف کر دے، چاہے عذاب دے۔ اس لطیف فرق نے امام احمد اور معتزلہ کے مابین ایک حد فاصل قائم کر دی ہے، امام احمد کے اس عقیدہ کی بنیاد نصوص پر ہے، کسی اور چیز پر نہیں۔

۲۔ کبیرہ گناہوں کے مرتکب کا حکم

جس شخص سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہو اس کا حشر کیا ہو گا؟ اس بارے میں علماء کے مابین اختلاف فکر و نظر موجود ہے۔ خوارج اسے کافر قرار دیتے ہیں۔ امام حسن بصری اور دوسرے تابعین اسے منافق کہتے ہیں، معتزلہ کے نزدیک اسے مسلمان تو کہا جائے گا لیکن ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک، اور امام شافعی اسے مومن تو کہتے ہیں لیکن اس کا معاملہ خدا کو سونپ دیتے ہیں خواہ بخش دے، خواہ سزا دے۔

مرجئہ کہتے ہیں:

"ایمان کی موجودگی میں معصیت کوئی مضرت نہیں پہنچاتی، جس طرح کفر کے ساتھ عمل طاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا، اور خدا کی رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔"

اس طرح مرجئہ نے فاجروں اور گنہگاروں کے لیے معاصی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور شہرستانی کہتے ہیں کہ مرجئہ کا ایک فرقہ مسلک اہل سنت سے قریب ہے، جنہیں اس نے "مرجئہ اہل السنہ" کا نام دیا ہے۔ ان کی رائے اس معاملہ میں وہی ہے جو امام ابو حنیفہ، امام مالک، اور امام شافعی رحمہم اللہ کی ہے

ان بزرگوں کی رائے یہی تو ہے کہ بندۂ عاصی کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، چاہے عذاب دے چاہے بخش دے۔ من جاء امرہ ومفوض مصیرہ الی ربہ ان شاء عذبہ وان شاء عفا عنہ۔

امام احمد کا مسلک اس بارے میں وہی ہے جو مذکورۂ بالا ائمۂ کرام کا ہے۔ وہ ان کے راستے سے بال برابر بھی نہیں ہٹے ہیں، اس مسئلہ میں ان سے نصوص کثیرہ وارد ہیں، چنانچہ وہ مومن کا وصف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کسی اہل قبلہ (مسلمان) کے کسی عمل کو پیش نظر رکھ کر ہم اس کے جنتی اور دوزخی ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ مرد صالح کے لیے بھلائی کی امید رکھیں اور گنہگار کے بارے میں خدا سے خائف رہیں اور اس کے لیے بھی رحمت الہٰی کی امید رکھیں، جو شخص خدا سے اس حالت میں ملے کہ اس سے گناہ (کبیرہ) سرزد ہوا ہو، لیکن وہ اس پر مصر نہ ہو اور توبہ کر چکا ہو تو بلاشبہ خدائے تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالے گا۔ کیونکہ وہ اپنے (گنہگار) بندوں کی توبہ قبول کر لیتا اور ان کی غلطیاں معا[illegible] اور جو شخص اس حالت میں اپنے رب سے ملے کہ اس دنیا میں اس پر حد [illegible] کی سزا پا چکا ہو تو اب اس کا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے، چاہے سزا دے، چاہے معاف کر دے۔"

دستور ایمان سے متعلق امام صاحب کا یہ قول بھی ہے کہ:

"اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا خواہ اس نے کبائر ہی کا ارتکاب کیوں نہ کیا ہو۔"

امام احمدؒ صرف یہی نہیں کہتے بلکہ معتزلہ کے اس عقیدہ پر کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوتا ہے۔ ان کو سخت سست بھی کہتے ہیں، فرماتے ہیں:

"معتزلہ اگر گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت آدم بھی کافر تھے، اور حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے اپنے والد (حضرت یعقوبؑ) سے جب غلط بیانی کی تو کفر کا ارتکاب کیا۔ معتزلہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ جس نے ایک حبہ کی بھی چوری کی تو اس کی بیوی پر طلاق پڑ گئی، اور اگر اس نے حج کیا تھا تو وہ رائیگاں گیا۔"

اس موقع پر امام احمد اور معتزلہ کی رائے کے مابین محاکمہ مقصود نہیں ہے، کیونکہ ہم ایک دوسری کتاب[1] میں اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں، یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کسی اہل قبلہ (مسلمان) کو گناہ و معصیت کے باعث خلود فی النار کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیتے تھے، چاہے معاف کر دے، اور اس کی رحمت کا تقاضا یہی ہے کہ معاف کر دے، اور اگر چاہے تو سزا دے دے!

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ امام احمد تارک صلوٰۃ کو کافر قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"اعمال میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے ترک پر کفر عائد ہوتا ہو، سوا ترک صلوٰۃ کے۔ جس نے نماز چھوڑی اُس نے کفر کا ارتکاب کیا اور اس کا قتل جائز ہے[2]۔"

بنظر بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی ہے، اس لیے کہ امام صاحب سے صرف نماز ہی کے بارے میں یہ فتویٰ مروی ہے، دوسرے کسی گناہ کے لیے نہیں، اور پھر اس پر کوئی دلیل بھی ان سے منقول نہیں ہے۔[3] لیکن اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نماز کا دائمی ترک سرکشی کا مترادف ہوتا ہے، اور جو ارکان دینیہ میں سے کسی ثابت شدہ رکن کا ترک از روئے جحود و سرکشی کرے وہ اجماع مسلمین کی رُو سے کافر ہے، کیونکہ اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کا انکار کیا۔

۳۔ مسئلۂ قدر اور افعال انسانی | امام احمد کا مسلک، قضا و قدر، اور خیر و شر پر ایمان مطلق سے اللہ تعالیٰ کے حکم اور تقدیر کے سامنے کامل سپردگی — یہ تھا

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب "ابو حنیفہ"۔ [2] المناقب صفحہ ۱۷۳

[3] مصنف کو شاید ان دلائل کی اطلاع نہیں ہو سکی ورنہ امام احمد کے یہ دلائل ان کی اپنی اور حنابلہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ حضرت امام کی اپنی تصنیف "کتاب الصلوٰۃ وما یلزم فیہا" میں ہے، وقد جاء فی الحدیث لاحظ فی الاسلام لمن ترک الصلوٰۃ (ایضاً) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الصلوٰۃ عمود الاسلام الست تعلم ان الفسطاط اذا سقط عمودہ سقط الفسطاط (یہ دونوں حدیثیں ہیں) "یعنی بے نماز کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ کا فرمان ہے "نماز اسلام کا ستون ہے"، اور یہ معلوم ہے کہ ستون گرنے سے خیمہ گر کر بیکار ہو جاتا ہے۔ بے نماز کے کفر اور اس کے

اس موقع پر امام احمد اور معتزلہ کی رائے کے مابین محاکمہ مقصود نہیں ہے، کیونکہ ہم ایک دوسری کتاب[1] میں اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں، یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کسی اہل قبلہ (مسلمان) کو گناہ و معصیت کے باعث خلود فی النار کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیتے تھے، چاہے معاف کر دے، اور اس کی رحمت کا تقاضا یہی ہے کہ معاف کر دے، اور اگر چاہے تو سزا دے دے!

لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ امام احمد تارک صلوٰۃ کو کافر قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

"اعمال میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے ترک پر کفر عائد ہوتا ہو، سوا ترک صلوٰۃ کے۔ جس نے نماز چھوڑی اس نے کفر کا ارتکاب کیا اور اس کا قتل جائز ہے"[2]

بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی ہے، اس لیے کہ امام صاحب سے صرف نماز ہی کے بارے میں یہ فتویٰ مروی ہے، دوسرے کسی گناہ کے لیے نہیں، اور پھر اس پر کوئی دلیل بھی ان سے منقول نہیں ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نماز کا دائمی ترک سرکشی کا مترادف ہوتا ہے، اور جو ارکان دینیہ میں سے کسی ثابت شدہ رکن کا ترک از روئے جحود و سرکشی کرے وہ اجماع مسلمین کی رو سے کافر ہے، کیونکہ اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کا انکار کیا۔

۳۔ مسئلۂ قدر اور افعال انسانی | امام احمد کا مسلک، قضا و قدر، اور خیر و شر پر ایمان مطلق سے اللہ تعالیٰ کے حکم اور تقدیر کے سامنے کامل سپردگی — یہ تھا

---

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب "ابو حنیفہ"۔ [2] المناقب صفحہ ۱۴۳

[3] مصنف کو شاید ان دلائل کی اطلاع نہیں ہو سکی ورنہ امام احمد کے یہ دلائل ان کی اپنی اور حنابلہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ حضرت امام کی اپنی تصنیف کتاب الصلوٰۃ وما یلزم فیہا میں ہے، وقد جاء فی الحدیث لاحظ فی الاسلام لمن ترک الصلوٰۃ (ایضاً) ان النبی صلی اللہ علیہ السلام قال الصلوٰۃ عمود الاسلام الست تعلم ان الفسطاط اذا سقط عمود و سقط الفسطاط (رشد یعنی حدیث میں آیا ہے کہ بے نماز کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ نماز اسلام کا ستون ہے"، اور یہ معلوم ہے کہ ستون گر جائے تو خیمہ گر کر بیکار ہو جاتا ہے۔ بے نمازی کے کفر کے لئے ... [illegible] ... ابن القیم و ابن رجب حنبلی کی کتاب

متعلق امام صاحب کے متعدد اقوال ملتے ہیں، ایمان مطلق سے مراد ایسا ایمان ہے جو دل کی گہرائیوں میں متمکن ہو، جس کا نتیجہ لازماً عمل کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ چنانچہ مناقب ابن الجوزی میں ان کا قول منقول ہے:-

"تابعین، ائمہ مسلمین اور فقہاء امصار میں سے ستر سے زیادہ نفوس کا اس امر پر اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس سنت پر انتقال ہوا وہ رضا بقضاء اللہ تھی، یعنی حکم خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ اللہ تعالیٰ کے اوامر کا بجا لانا، اس کے منہیات سے رک جانا، اور جو کچھ کرنا صرف خدا کے لیے کرنا، خدا کی قدرت، اور اس کے خیر و شر پر ایمان رکھنا، دین کے معاملہ میں جدل و پیکار اور خصومات سے الگ رہنا"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ امام احمد تقدیر پر ایمان رکھتے اور تمام امور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے سپرد کر دیتے تھے، اور کہ اس مسئلہ میں وہ جدل و پیکار کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ان کی حالت تو یہ تھی کہ دین کے تمام مسائل میں وہ جدل و پیکار کو ناپسند فرماتے تھے، اور اس مسئلہ میں تو خاص طور پر وہ دلیل بازی اور حجت کو ناپسند کرتے تھے، اس لیے [illegible] ذریعہ آدمی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ جتنا جتنا مناقشہ زیادہ ہو گا اتنی ہی پیچیدگی اور بعد بڑھے گی، جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"یہ مسئلہ سخت مشکل اور مقفل ہے، اس کی کنجی گم ہو چکی ہے۔ اس قفل کو وہی کھول سکتا ہے جو مخبر من اللہ ہو، اور صاحب دلیل و برہان ہو"[2]

جب امام ابو حنیفہؒ جیسے متکلم مناظر کی حیرانی کا یہ عالم ہے تو ظاہر ہے امام احمد اس میدان کے تھے ہی نہیں، وہ بالکل سلف صالحین کے طریقے کے سوا دوسری راہ کو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ اس کے ساتھ امام احمد یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ خدا کی قدرت اور ارادہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح امام احمد فرقہ قدریہ کے مسلک سے اختلاف رکھتے تھے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اپنی ہی قدرت کے ماتحت کرتا ہے۔ اس میں خدا کی قدرت کو کچھ دخل نہیں ہوتا، کیونکہ خدائے تعالیٰ معصیت اور گناہ کی

متعلق امام صاحب کے متعدد اقوال ملتے ہیں، ایمان مطلق سے مراد ایسا ایمان ہے جو دل کی گہرائیوں میں متمکن ہو، جس کا نتیجہ لازماً عمل کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ چنانچہ مناقب ابن الجوزی میں ان کا قول منقول ہے :-

"تابعین، ائمہ مسلمین اور فقہاء امصار میں سے ستر سے زیادہ نفوس کا اس امر پر اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو "سنت" پر انتقال ہوا وہ رضا بقضاء اللہ تھی یعنی حکم خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ اللہ تعالیٰ کے اوامر کا بجا لانا، اس کے منہیات سے رک جانا، اور جو کچھ کرنا صرف خدا کے لیے کرنا، خدا کی قدرت، اور اس کے خیر و شر پر ایمان رکھنا، دین کے معاملہ میں جدل و پیکار اور خصومات سے الگ رہنا[1]"

اس سے معلوم ہوا کہ امام احمد تقدیر پر ایمان رکھتے اور تمام امور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے سپرد کر دیتے تھے، اور کہ اس مسئلہ میں وہ جدل و پیکار کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ان کی حالت تو یہ تھی کہ دین کے تمام مسائل میں وہ جدل و پیکار کو نا[illegible]تے تھے، اور اس مسئلہ میں تو خاص طور پر وہ دلیل بازی اور بحث کو ناپسند کرتے تھے، اس۔ [illegible]ے ذریعہ آدمی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ جتنا جتنا مناقشہ زیادہ ہو گا اتنی ہی پیچیدگی اور تعقید بڑھے گی، جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"یہ مسئلہ سخت مشکل اور مقفل ہے، اس کی کنجی گم ہو چکی ہے۔ اس قفل کو وہی کھول سکتا ہے جو مخبر من اللہ ہو، اور صاحب دلیل و برہان ہو۔"

جب امام ابوحنیفہؒ جیسے متکلم مناظر کی حیرانی کا یہ عالم ہے تو ظاہر ہے امام احمد اس میدان کے تھے ہی نہیں، وہ بالکل سلف صالحین کے طریقے کے سوا دوسری راہ کو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ اس کے ساتھ امام احمد یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ خدا کی قدرت اور ارادہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح امام احمد فرقہ قدریہ کے مسلک سے اختلاف رکھتے تھے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اپنی ہی قدرت کے ماتحت کرتا ہے۔ اس میں خدا کی قدرت کو کچھ دخل نہیں ہوتا، کیونکہ خدائے تعالیٰ معصیت اور گناہ کی

[1] المناقب ص۱۴۶

کارفرمائی میں حصہ نہیں لے سکتا، اس لیے کہ وہ اس کا حکم نہیں دیتا، اور جس بات کا خدا ارادہ نہ کرتا ہو اس کا حکم بھی نہیں دے سکتا، اور نہ اس بات کا ارادہ کرتا ہے جس سے وہ منع کرتا ہو، کیونکہ قدریہ کے نزدیک امر اور ارادہ لازم و ملزوم ہیں، ان میں سے ایک اس وقت تک نہیں پایا جا سکتا جب تک دوسرا بھی موجود نہ ہو۔

امام احمد اس مسلک کے مخالف تھے، ان کا مسلک وہی تھا، جو جمہور مسلمین اور فقہاء کا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو عالم امکان میں واقع نہیں کرتا، جب تک اس کا ارادہ نہیں فرما لیتا، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ارادہ کی مرہون ہے۔ امام صاحب قدریہ کے مسلک کی مذمت فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کے صاحبزادے صالح نے دریافت کیا۔

"کیا کسی قدری کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے؟"

آپ نے فرمایا،

"قدری کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے کام سے اس وقت تک واقف نہیں ہوتا جب تک وہ اسے کر نہ لیں، لہٰذا کسی قدری کے پیچھے ہرگز نماز نہ پڑھنا۔"

امام احمد اگرچہ قدریہ کی مذمت کرتے تھے، ان کے مسلک کو ناپسند کرتے تھے، لیکن مجادلہ اور مناقشہ نہیں کرتے تھے، نہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ ان لوگوں کے افکار و خیالات کے خلاف عقلی دلیلیں قائم کرنے کی کوشش کریں، ان کا خیال تھا کہ جو بات قرآن و سنت سے ثابت ہو، اس پر کوئی دوسری دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور قدر اور اس کے خیر و شر پر ایمان لانا از روئے سنت واجب ہے، پس جو مسلک اس کے خلاف ہو وہ باطل ہے، ان کی رائے میں ان امور کی تفصیل پر غور و خوض کرنا بدعت ہے، (جس کا آغاز علماء کلام نے کیا) سوا اس صورت کے ان کے بارے میں سنت نبوی، اور قرآن کریم سے کچھ ثابت ہو، اسی لیے وہ فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے بعض شاگردوں کو تحریر بھی فرمایا تھا——!

"میں صاحب کلام نہیں ہوں، اور نہ علم کلام کو کوئی اہمیت دیتا ہوں، سوا اس چیز کے جو قرآن کریم، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے ثابت ہو، باقی اس کے علاوہ

علم کلام میں جو کچھ ہے وہ غیر محمود ہے[1]"

۴۔ صفاتِ الٰہی اور مسئلہ خلقِ قرآن

صفاتِ الٰہی کے بارے میں امام احمد کا مسلک یہ تھا کہ وہ تمام صفات جن کا قرآن اور حدیث میں ذکر آگیا ہے، غرض وہ تمام جواز روئے نص ثابت ہیں، اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے متصف مانتے، اور نصوصِ شرعیہ سے سر مُو تجاوز نہیں فرماتے تھے، چنانچہ وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ "سمیع" (سننے والا) ہے، "بصیر" (دیکھنے والا) ہے، "متکلم" (کلام کرنے والا) ہے، "قادر" (قدرت والا) "مرید" (ارادہ کرنے والا) ہے، "علیم" (جاننے والا) ہے، "خبیر" (باخبر) ہے، "حکیم" (حکمت والا) ہے، "عزیز" (سب پر غالب) ہے، اور اس کی سی کوئی اور چیز نہیں، چنانچہ ان کے صاحبزادے عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ احادیث صفات کے بارے میں انہوں نے فرمایا:

"یہ وہ حدیثیں ہیں جن کی ہم اسی طرح روایت کرتے ہیں جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں"

امام صاحب ان صفات کی کنہ اور حقیقت پر بحث و گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ان کی دُور از کار تاویل کو وہ خلافِ سنّد [illegible] کا خیال تھا کہ شک پیدا کرنے والی باتوں کی پیروی اور اصل فتنہ کی پیروی ایک طرح کی بدعت ہے۔

امام احمد کا یہ ایمان تھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ قدیم ہے اس سے پہلے کوئی نہیں تھا، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں۔ اور کلام بھی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔

کلامِ الٰہی کے صفت ہونے کے سلسلہ میں امام احمد کے پیش نظر خلقِ قرآن کا مسئلہ بھی تھا۔ یہ بات گذشتہ اوراق میں معلوم ہو چکی ہے کہ امام صاحب اس کے قائل نہیں تھے کہ "قرآن مخلوق" ہے، جس کی دعوت بنو عباس دے رہے تھے، اگر یہ بات وہ کرنا بھی مان لیتے تو ان پر مصائب کے پہاڑ نہ ٹوٹتے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں دراصل امام احمد کی رائے کیا تھی؟ کیا ان کا یہ خیال تھا کہ قرآن جو پڑھا جاتا ہے، یا جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے، یا پڑھنے والا جس کے الفاظ کی تلاوت کرتا ہے اپنی صفت کلام کے لحاظ سے قدیم ہے؟ یا وہ قرآن کو مخلوق اس لیے نہیں کہتے تھے کہ ایسا کہنا بدعت ہے؟

[1] المناقب ص۱۵۶

اس سلسلہ میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ مختلف نوعیت کی ہیں اور قبل اس کے کہ ہم ان پر گفتگو کریں، یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن اپنی تلاوت کے اعتبار سے حادث ہے، قدیم نہیں ہے، پس جو شخص کہتا ہے کہ قرآن اپنی قرأت کے اعتبار سے مخلوق یعنی حادث ہے تو کوئی شبہ نہیں اس کا یہ قول درست ہے، اس لیے کہ قرأت جو ہے یہ قاری کا وصف ہے نہ کہ خدائے تعالیٰ کا، اور قرأت کے معنی میں قرآن کا اطلاق خود قرآن کریم میں وارد ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

"وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا —" (۱۷-۷۸)

یہاں "قرآن الفجر" سے مراد وقتِ فجر کی قرأت وتلاوت ہے، اور یہ ایسی بدیہی اور کھلی ہوئی بات ہے کہ اس پر نظرِ دقیق اور بحثِ عمیق کی ضرورت ہی نہیں ہے؟

ابن قتیبہ کہتے ہیں:۔

"جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرأت غیر مخلوق ہے، وہ گویا یہ کہتا ہے کہ انسان کے اعمال غیر مخلوق ہیں[2]"

اور کوئی شخص یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ انسان کے اعمال غیر مخلوق ہیں، جب انسان خود ہی مخلوق ہے تو لامحالہ اس کے افعال بھی مخلوق ہیں، لہٰذا یہ ایسی بات ہوئی جو حکایت و روایت، اور غور و نظر کی مستحق ہی نہیں ہے۔

قرأتِ قرآن کو مخلوق کہنے کا غلو

اوپر کے بیان سے اندازہ ہو گا کہ امام صاحب کے زمانے میں محسوسات تک میں غلط روی اور فکر و نظر کی گمراہی کس حد تک پہنچ گئی تھی یعنی بعض لوگ، ہماری قرأت (جو انسانی فعل ہے) تک کو مخلوق کہنے سے رک گئے، اس غلط زعم میں کہ ایسا نطق "بدعت" ہے، اور حدیث کی رُو سے ہر بدعت گمراہی ہے!

خیال کیا جا سکتا ہے کہ جہاں قرأتِ قرآن کے سلسلہ میں اختلاف کی یہ صورت موجود ہو وہاں خود قرآن کریم کے بارے میں کیا صورت ہوگی؟

قرآن مجید کے متعلق دو نقطۂ نظر

قرآن مجید پر دو پہلوؤں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے، (۱) قرآن پر اس کے مصدر کی حیثیت سے غور و فکر! ——— اور وہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ صفتِ کلام سے متصف ہے، اور صفتِ کلام قدمِ ذات کے باعث قدیم ہے، کیونکہ خدائے تعالیٰ کو ان صفات سے متصف نہیں کیا جا سکتا جن سے فانی اور حادث چیزیں متصف کی جا سکتی ہیں تعالیٰ اللّٰہ عنہا علوًا کبیرًا۔

(۲) قرآن پر اس کے حروف کی حیثیت سے غور و فکر ——— وہ حروف جن سے یہ کلمات ترتیب پاتے ہیں اور وہ معانی جن پر یہ کلمات دلالت کرتے ہیں، اور وہ مفہوم جو ان عبارات سے حاصل ہوتا ہے۔

امام احمد کی رائے، اور اس کی تحقیق

سوال یہ ہے کہ اس بارے میں امام صاحب کی رائے کیا تھی؟ ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ امام احمد اس باب میں سکوت کو ترجیح دیتے تھے، اور ان مسائل پر غور و فکر کو بدعت قرار دیتے تھے، اور ان لوگوں کے موقف کو درست نہیں سمجھتے تھے جو ان میں حصہ لیا کرتے۔ ان کے متعدد اقوال بیان کیے جاتے ہیں، لیکن زیادہ مصرح وہ جواب ہے جو انہوں نے ... جب اس نے سوال کیا کہ:

"آپ قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

تو آپ نے فرمایا،

"وہ خدا کا کلام ہے"۔

کہا گیا

"کیا وہ مخلوق ہے؟"

ارشاد ہوا

"وہ خدا کا کلام ہے، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا"۔

پھر جب یہ کہا گیا

"خدا اپنی مخلوق میں سے کسی معنی میں بھی، کسی سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا"،

تو آپ نے کہا

"خدا کی مانند کوئی چیز نہیں ہے، وہ سمیع و بصیر ہے"!

امام احمد کے اس کلام سے پایا جاتا ہے کہ آپ اس بارے میں متوقف تھے۔

ابن قتیبہ کا اختلاف

لیکن ابن قتیبہ، جو امام احمد کے معاصر امام عبد الرحمٰن بن مہدی کے شاگرد ہیں، ان روایات کو نہیں مانتے، بلکہ امام احمد کے کلام سے جس توقف کو پیدا کیا جاتا ہے اس کی تحت الفاظ میں وہ تردید کرتے ہیں، انہیں اس سے انکار ہے کہ اس مسئلہ میں امام احمد نے سکوت کا مسلک اختیار کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ اہم امور و مسائل پر سکوت اختیار کرنے والے لوگ پسندیدہ نہیں قرار دیئے جا سکتے، اور امام احمد جیسا شخص تو ہرگز ایسا (کمزور) مسلک نہیں اختیار کر سکتا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:-

"اس فتنہ کے رونما ہونے کے بعد کوئی ایسی توجیہ نہیں پیش کی جا سکتی جو سکوت کو جائز قرار دے، یہ ہو سکتا ہے کہ فتنہ کے نمودار ہونے اور بات کے بڑھنے سے پہلے ایسے امور پر سکوت اختیار کر لیا جائے، لیکن کوئی بلند مرتبت شخص ایسے موقع پر ایک دینی مسئلہ میں سکوت نہیں اختیار کر سکتا جو اتنی شدت کے ساتھ پھیل چکا ہو، ایسے موقع پر اگر عقلاً خاموش بھی رہیں تو جہلاء خاموش نہیں رہ سکتے، ہو سکتا ہے کہ زبان خاموش رہے لیکن کیا دل بھی چپ رہ سکتا ہے؟ حالانکہ امام احمد اور ان کے معاصرین کے لیے پیش رو علماء کا اسوۂ عمل بھی موجود تھا جب جہم اور امام ابو حنیفہ نے قرآن کے بارے میں گفتگو کی تھی[1] لوگ جب اس مسئلہ کو لے کر علماء کے پاس پہنچے تو انہوں نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ یہ بدعت ہے، بلکہ انہوں نے شک کو یقین سے اور تاریکی کو روشنی سے بدلا، اور بالاتفاق اس رائے کا اظہار کیا کہ قرآن غیر مخلوق ہے یہی ان کا فتویٰ تھا جس پر انہوں نے دلائل و براہین قائم کیے اور اس کے لیے کتاب الٰہی سے شواہد کا استنباط کیا"۔

امام احمد سے ایک روایت یہ بھی کی جاتی ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں فرمایا،

"جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ جہمی ہے، اور جہمی کافر ہے، اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن غیر مخلوق ہے۔ وہ بھی بدعت کا ارتکاب کرتا ہے"!

لیکن ابن قتیبہ اس روایت کو بھی قبول نہیں کرتے، بلکہ اسے غرائبات میں شمار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

---

[1] امر محقق یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں فرمایا اور نہ ہی ان کے زمانے میں اس مسئلے نے ایسی شہرت پائی تھی۔ (مترجم)

"ابوعبداللہ (احمد بن حنبل) جیسا شخص بھلا ایسی بات کیونکر کہہ سکتا ہے، جبکہ یہ بات واضح ہے کہ حق دو پہلوؤں میں سے ایک کی طرف ہوتا ہے" (یعنی قرآن اگر مخلوق نہیں ہے تو غیر مخلوق ہے اور اگر غیر مخلوق نہیں ہے تو مخلوق ہے)۔

اور ایک دوسرا فریق کہتا ہے کہ امام احمد کا عقیدہ تھا کہ قرآن اپنے حروف، کلمات، عبارت اور معانی کے اعتبار سے غیر مخلوق ہے، امام احمد کے رسائل اور ان کی متعدد عبارات مرویہ سے یہی بات ثابت ہوتی ہے، انہی میں سے ایک وہ مکتوب ہے جو انہوں نے متوکل کو لکھا تھا جب اس نے مسئلہ خلق قرآن پر ان کی فیصلہ کن رائے طلب کی تھی۔

امام احمد کے اس مکتوب میں اور دوسرے جوابات میں جو انہوں نے مامون اور معتصم کے جواب میں لکھے تھے، اگر ہم جمع و تطبیق کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ پہلے پہل تو امام احمد نے سکوت سے کام لیا۔ ایک ایسے امر میں غور و خوض نامناسب سمجھا جس میں از روئے سنت غور و خوض ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس بارے میں اپنی را[illegible]، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انہوں نے سرے سے کوئی رائے ہی نہیں قائم کی تھی، لیکن اس سوال [illegible] ایک سیل بے پناہ کی صورت اختیار کرلی، اور انہوں نے آثار و اخبار صحابہ و تابعین کے تمام ممکن الحصول مصادر کی طرف مراجعت کی، تو بے تامل اپنی بے لاگ رائے ظاہر کردی، اگرچہ ان کے نزدیک ترجیحی مسلک یہی تھا کہ ایسے مسائل پر غور و خوض نہ کرنا ہی انسب ہے، اور قرآن کے بارے میں مجادلہ اور مناقشہ درست نہیں۔

امام احمد کا فیصلہ کن تاریخی مکتوب

"حلیہ" اور "تاریخ الذہبی" میں امام عبداللہ بن امام احمد کی روایت کے مطابق امام احمد کا وہ مکتوب درج ہے جو اس قضیہ کے سلسلہ میں انہوں نے متوکل کو لکھا تھا۔

(ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں)

عبیداللہ بن یحییٰ نے میرے والد (احمد بن حنبل) سے ایک تحریر میں تخاطب کرتے ہوئے عرض کیا کہ "امیر المؤمنین (متوکل) نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ سے قرآن کے بارے میں پوچھوں، امتحان کی غرض سے نہیں بلکہ تحقیق حق کے لیے"! اس کے جواب میں میرے والد (احمد) نے عبیداللہ بن یحییٰ کو حسب ذیل

خط املا کرایا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

ابوالحسن، خدا تمام امور میں تمہارا انجام بخیر کرے، امیر المؤمنین نے جو کچھ دریافت کیا ہے اس کے جواب میں مجھے جو کچھ معلوم ہے لکھتا ہوں، اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ امیر المؤمنین کو توفیق نیک بخشے۔ لوگ باطل پر غور و خوض کرنے کے عادی ہوگئے تھے، ان میں اختلاف شدید پھوٹ پڑا تھا۔ یہاں تک کہ خلافت امیر المؤمنین کے ہاتھ آئی، اور خدا نے امیر المؤمنین کے ذریعہ بدعتوں کو دور کیا، اور لوگوں پر یہ بات منکشف کردی کہ وہ کیسی تنگنائے میں پھنسے ہوئے تھے، امیر المؤمنین نے اس صورت حال کو ختم کردیا، اور مسلمانوں کو ایک اچھا موقع حاصل ہوگیا، اور وہ امیر المؤمنین کے لیے دعا کرنے لگے کہ خدا ان کی نیت کی برکت میں اضافہ کرے، اور جس موقف پر وہ قائم ہیں اس میں ان کی دستگیری اور اعانت کرے۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعض حصوں کو بعض دوسرے حصوں سے نہ ٹکراؤ۔ اس طرح تمہارے قلوب میں شک و شبہ پیدا ہوگا۔ اور عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر بیٹھی تھی، ان میں سے ایک نے کہا:

"کیا خدا نے ایسا نہیں کہا ہے؟"

دوسرے نے کہا

"کیا خدا نے ایسا نہیں فرمایا ہے؟"

یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش مبارک تک پہنچی، آپ باہر تشریف لائے، آپ نے سخت غصے کی حالت میں فرمایا "کیا تم اس پر مامور کیے گئے ہو کہ کتاب اللہ کے بعض حصوں کو بعض دوسرے حصوں سے خواہ مخواہ ٹکراؤ؟ اس طرح کی باتیں کرکے تم سے پہلی امتیں گمراہ ہوئیں، اس چیز پر عمل کرو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اور پھر اسی پر عمل کرو۔ ان چیزوں پر غور کرو جن سے تم روکے گئے ہو، اور پھر ان سے باز رہو۔"

ابن طاؤس نے اپنے بیٹے سے جب ان سے ایک بدعتی بات کررہا تھا فرمایا۔

[illegible]

نہ آئے"!

پھر فرمایا — "اور زیادہ شدت کے ساتھ، اور زیادہ شدت کے ساتھ —!"

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (یاد رکھو خلق اور امر صرف خدا ہی کے لیے ہیں)، اس طرح، خدا نے پہلے "خلق" کی خبر دی، پھر "امر" کا ذکر فرمایا، گویا "امر" خلق سے الگ کوئی اور چیز ہے۔ نیز خدائے تعالیٰ فرماتا ہے

"اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ، عَلَّمَہُ الْبَیَانَ (خدائے رحمٰن وہ ہے جس نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا، اور اسے بیان کی تعلیم دی) گویا خدا اس طرح اس بات کی خبر دیتا ہے کہ قرآن اس کے "علم" کا ایک حصہ ہے، (اسی طرح دوسری متعدد آیات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن علم خداوندی میں سے ہے)۔ اس کے علاوہ اسلاف میں سے متعدد بزرگوں سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے قرآن خدا کا کلام ہے، غیر مخلوق ہے۔ یہی میرا مسلک ہے، میں کلامی نہیں ہوں، اور نہ ایسے مسائل میں علم کلام کو کوئی اہمیت دیتا ہوں، میری نظر میں اہمیت جو کچھ ہے وہ صرف [illegible] میں وارد ہو، یا حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ و تابعین سے ثابت [illegible] کے علاوہ جو کچھ ہے وہ غیر محمود ہے[2]"

اس مکتوب کو نقل کرنے کے بعد حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ امام احمد کے اس مکتوب کے راوی ثقہ ہیں میں خدا کو گواہ لے کے کہتا ہوں کہ یہ خط وہی ہے جو امام احمد نے اپنے بیٹے کو املا کرایا، اس کے علاوہ ان کے جو دوسرے رسائل اور مکاتیب ہیں وہ البتہ ایک حد تک مشکوک ہیں، لیکن یہ وہ رسالہ ہے جس کی سند صحیح اور اس کی نسبت یکسر درست ہے۔ یہ اس وقت املا کرایا گیا جب امام احمد دور ابتلا سے گزر چکے تھے، بڑھاپا طاری ہو چکا تھا، یعنی وہ اپنے علم کی حد کمال کو پہنچ چکے تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ان کی وہ رائے تھی جس پر وہ قائم اور مستقل تھے۔

---

[1] امام احمد رحمۃ اللہ علیہ "خلق" اور "امر" میں تفریق کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن خدا کا امر ہے، "خلق" نہیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ قرآن مخلوق نہیں ہے۔ حنیف

[2] [illegible]

سلف صالح کی پیروی

ان تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس قضیہ میں غوض و تعمق کو امام احمد مستحسن نہیں سمجھتے تھے، انہوں نے فکر و تعمق سے کام لیا بھی تو اس وقت جب وہ مجبور ہو گئے، تاکہ لوگوں کو اس فتنہ میں مبتلا ہونے سے روکیں، جس کی طرف معاملات دین میں جھگڑنے والے لوگ انہیں بلا رہے تھے —!

دوسری بات اس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ امام احمد قرآن کو غیر مخلوق سمجھتے تھے، ان کا یہ عقیدہ سلف صالح کے مسلک سے بالکل مطابق تھا، وہ اس بات کو فرما چکے تھے، لہٰذا امام احمد نے اس عقیدہ کا اظہار کر کے کسی طرح کی بدعت کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ اس سلسلہ میں بھی بعض تابعین ہی کے پیرو کار ہیں لیکن اپنی اس رائے کو یوں مدلل اور مبرہن کرتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور خدا کا کلام غیر مخلوق ہے قرآن "امر" ہے، اور "امر" غیر مخلوق ہے، قرآن خدائے سبحانہٗ و تعالیٰ کا "علم" ہے اور علم الٰہی غیر مخلوق ہے، یہ تمام باتیں انہوں نے کتاب الٰہی، احادیث نبویؐ، اخبار صحابہ اور آثار تابعین کے نصوص سے اخذ کی تھیں نہ کہ صرف عقل سے، اور نہ ایسی سطحی نظر سے جس کا مبنی مستند نقل نہ ہو۔

ہاں خود امام احمد نے اپنی رائے کی تشکیل میں اگرچہ عقل کو دخل نہیں دیا، لیکن ان کے بعد ایسے علماء ضرور پیدا ہوئے جنہوں نے ان کی فکر اور عقیدہ کی عقلی توجیہ کی اور اسی بنیاد پر عمارت کھڑی کر لی، ان علماء میں امام ابن قتیبہ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے اس بحث میں قرآن اور قرآن کی قرأت میں فرق کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ قرآن جو پڑھا جاتا ہے، یہ کلام الٰہی ہے اور قرأت، یہ پڑھنے والے کی آواز ہے جو سنی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ (۹-۶)

(اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دے دو، یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے، پھر اسے اس کے مامن میں پہنچا دو!)

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

"قرآن کو اپنی خوش الحانی سے سنوارو"

اسی طرح ایک مرتبہ ابو موسیٰ اشعری قرآن کی تلاوت کر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

آپ کے پیسے میں اور زیادہ خوش الحانی سے قرأت کرنے کی کوشش کرتا!

پس جب قرأت انسان کی آواز ہے، تو وہ مخلوق ہوئی جیسے انسان خود مخلوق ہے!

اور قرأت ہی کی طرح روشنائی کا حال ہے جس سے مصاحف لکھے جاتے ہیں، ظاہر ہے روشنائی کلام الٰہی نہیں ہے، اگرچہ اس سے لکھی ہوئی چیز کلام اللہ ہی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے،

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (اے محمد کہہ دیجیے، اگر سمندر کلمات الٰہی کے لیے روشنائی بن جائیں تو کلمات الٰہی کے اتمام تک پہنچنے سے پہلے یہ سمندر خشک ہو جائیں گے)

اس طرح خود خدائے تبارک وتعالیٰ نے اس روشنائی میں جس سے کلمات الٰہی لکھے جاتے ہیں اور کلماتِ الٰہی کے مابین تفرقی کر دی ہے[1]

اہل علم کے تین طبقے جب صورت یہ ہے کہ کلام خدا کے صفات میں سے ایک صفت ہے تو اس کے الفاظ، معانی اور عبارات سب کے سب گویا صفات خداوندی ہی میں شمار کیے جائیں گے، صفات الٰہی کے سلسلہ میں علماء کے تین گروہ ہیں۔

۱- پہلا گروہ وہ ہے جو [illegible] ہے کہ خدا صفات معانی کی صفت سے متصف ہے جیسے قدرت، ارادہ، علم، کلام، سمع، بصر۔ اس [illegible] خیال میں صفاتِ الٰہی کو اس کی ذات کی طرح قدیم مان لیا جائے تو تعدد ما کا تعدد لازم آئے گا۔ یہ رائے معتزلہ کی ہے۔ اور ان کے نزدیک قرآن خدا کا کلام اس معنی میں ہے کہ اسے خدا نے پیدا کیا اور اسے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل بنایا ہے، لوگ عربوں کو اس بات سے عاجز کر دیا کہ وہ قرآن جیسا کلام بنا کر لا سکیں۔ کیونکہ دیہیا کہ معتزلہ کا خیال ہے، اس میں بیان وزبان کی ایسی خصوصیات ہیں جو عربوں کی طاقت سے باہر ہیں۔ (یعنی حسب رائے معتزلہ عربوں سے قرآن کے مقابلہ کی طاقت سلب کر لی گئی)۔

۲- دوسرا گروہ وہ ہے جو صفات کو ذات عالی کے لیے ثابت کرتا ہے، لیکن وہ یہ بھی مانتا ہے کہ قدرت الٰہی سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ مخلوق ہیں۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ متکلم ہے، لیکن وہ الفاظ اور معانی کو پیدا کرتا ہے، اس اعتبار سے قرآن مخلوق ہوا جس طرح دوسری تمام چیزیں قدرت الٰہی کے ساتھ مخلوق ہیں۔

---

[1] مجموعۃ الرسائل والمسائل لابن تیمیہ ص۲۱-۲۲

۳- تیسرا گروہ سلفی و اہلحدیث کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے، خدا ان سے اس طور پر متصف ہے کہ یہ صفات اس کی ذات عالی کے لیے نعت و وصف کی حیثیت رکھتی ہیں پس وہ قدرت، ارادہ، علم، سمع، بصر اور کلام وغیرہ کی صفات سے متصف ہے، جو صفات اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں، ان کو وہ مخلوق نہیں کہتے۔ بنابریں قرآن بھی ان کے نزدیک مخلوق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہے، چنانچہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:-

"سلف کا قول ہے، خدائے تعالیٰ جب چاہے کلام کر سکتا ہے اور کلام کمال کی صفت ہے اور متکلم غیر متکلم سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔ خدا جب چاہتا ہے عربی میں کلام کرتا ہے جیسا کہ اس نے قرآن میں کیا۔ اور جو کچھ فرماتا ہے وہ اس کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اس سے منفصل نہیں ہوتا پس وہ حروف جو خدا کے اسماء حسنیٰ اور اس کی نازل کردہ کتابوں کی بنا ہیں کیونکر مخلوق ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے کلام کیا ہے۔"[1]

اب بنیادی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت اور صفت سے جو کچھ صادر ہوتا ہے آیا اسے مخلوق کہا جائے گا؟ اور اس پر مخلوق ہونے کا اطلاق ہو سکے گا؟ یا اسے غیر مخلوق کہا جائے گا؟ اور مخلوق کا اطلاق اس پر نہیں کیا جائے گا؟ اکابر سلف کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو مخلوق نہیں کہتے۔[2]

اس دلیل کی بنا پر جب قرآن غیر مخلوق ٹھیرا تو اب یہ سوال ابھرتا ہے کہ آیا وہ خدا کی طرح قدیم ہے؟ کیونکہ یہ تو مانا جا چکا ہے کہ وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؟ یہاں ابن تیمیہ اس کا اقرار کرتے ہیں کہ امام احمد کے نزدیک قرآن قدیم نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر اس چیز کو جو ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہو قدیم نہیں مانتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ سے جو کچھ کرتا ہے وہ اگرچہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، لیکن ہے وہ حادث، اس مسئلہ میں وہ فلسفیوں کے نقش قدم کی پیروی نہیں کرتے جو عقلی مفروضات پر اپنے افکار و خیالات کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔

ابن تیمیہ اس بات کی بھی نفی کرتے ہیں کہ امام احمد کا اور سلف کا مذہب قرآن کو قدیم ماننا تھا، وہ کہتے ہیں:-

---

[1] الرسائل والمسائل لابن تیمیہ ج ۳ ص ۵۹

[2] مصنف کی یہ تنقیح مبہم اور مرد قمی کے خلاف ہے، معتزلہ اور ائمہ سلف کا اختلاف اس میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ صادر ہوتا ہے اسے مخلوق کہا جائے یا نہ، بلکہ بنائے اختلاف صفات الٰہیہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ قیام و انفصال اور اس سے انفصال ہے جیسا کہ خود مصنف نے امام ابن تیمیہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے، معتزلہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایسے صفات سے متصف نہیں جو اس کی ذات سے قائم ہوں۔ مثلاً یہی صفت کلام ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ صفت اس کے ساتھ قائم نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے منفصل ہے۔ کسی محل دیگر میں اس کو اللہ تعالیٰ پیدا کر دیتا ہے، بنابریں قرآن بھی کلام کا ایک منفرد جزئی حیثیت سے مخلوق ٹھیرا، لیکن امام احمد وغیرہ ائمہ سلف کا متفقہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صفت کلام قائم اور متصل ہے، اس سے منفصل نہیں، حق تعالیٰ اسے صفت کلام کو الگ ماننے سے صفات کمال سے اس کی تعطیل لازم آتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ائمہ سلف کے نزدیک قرآن کو مخلوق کہنا بالواسطہ و بالالتزام اللہ تعالیٰ کو صفات کمال سے عاری ماننا ہے ... محمد حسن و معتزلہ کے اس نزاع کو لفظی ...

"سلف کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کلام الٰہی غیر مخلوق ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن کو سلف قدیم العین قرار دیتے تھے۔ اس کے بعد بعض کہتے ہیں کہ کلام ایک شئی واحد (کلام نفسی) ہے، جو مختلف قالب اختیار کر لیتی ہے، وہی کبھی "امر" ہو جاتی ہے کبھی "نہی" وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی وہ عربی میں ہو تو قرآن، عبرانی میں ہو تو تورات، سریانی میں ہو تو انجیل، حقیقت ایک ہی ہے۔ لیکن یہ قول عقل اور شرع کے خلاف ہے۔"[1]

ابن تیمیہ نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ کلام الٰہی کے قدیم ہونے اور اس کی تلاوت کے غیر قدیم ہونے میں کسی طرح کی منافات نہیں ہے۔[2]

مذکورہ تصریحات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ امام احمد اور ان کے مسلک پر چلنے والے لوگ جس عقیدہ کے حامل تھے، وہ یہ تھا کہ قرآن غیر مخلوق ہے، لیکن وہ اسے قدیم بھی نہیں کہتے تھے۔

شیخ محمد عبدہٗ کی رائے

شیخ محمد عبدہٗ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء سے کلام کیا اور قرآن کو کلام الٰہی سے تعبیر کیا، پس مصدر کلام کا جہاں تک تعلق ہے، وہ تو قدیم ہے، لیکن کلام مسموع کا جہاں تک ... حادث ہے، پس وہ آیتیں جنہیں کوئی قاری پڑھتا ہے، حادث ہیں اور تلاوت سے ... ہو جاتی ہیں، پس جو شخص قرآن مقروء کے قدم کا قائل ہے وہ اعتقاد کے لحاظ سے گمراہ ہے، اور بعض ائمہ کا قرآن کو مخلوق کہنے سے انکار کرنا صرف

---

[1] الرسائل والمسائل، ص۱۵۶   [2] الرسائل والمسائل ص۱۰۶

[3] شیخ محمد عبدہٗ کی یہ رائے بھی الجھی ہوئی ہے جہاں تک امام احمد اور سلف کا مسلک ہے وہ یہی ہے کہ کلام مسموع اللہ تعالیٰ کا وصف ہے اور غیر مخلوق ہے البتہ قرأت و تلاوت (جو قاری کی صفت ہے) وہ بلاشبہ مخلوق ہے مجموعہ الرسائل والمسائل لابن تیمیہ میں ہے مرادھم (السلف) ان القرآن مسموع غیر مخلوق (ص۱۳۶)۔ باقی رہا حادث کا لفظ تو یہ مخلوق کو مستلزم نہیں ہے، بقول امام احمد و امام ابن تیمیہ، اللہ تعالیٰ نے قرآن پر لفظ "محدث" کا اطلاق کیا ہے لیکن بطور مخلوق نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ اس کا نزول جدید حادث ہے۔ (مجموعہ الرسائل والمسائل ص۲۵۱)   حنیف بھوجیانی

[4] شیخ محمد عبدہٗ مصری کی یہ رائے امام احمدؒ اور سلف کے مسلک سے ناواقفیت پر مبنی ہے، تعجب اس پر ہے کہ مولانا ... نے اسے کیسے باور کر لیا جبکہ ان کے سامنے جو کتاب موجود ہے — یعنی مجموعۃ الرسائل والمسائل للامام ابن تیمیہؒ — اس میں ...

ادب کا نتیجہ تھا۔"

محمد عبدہٗ کی رائے کا آخری حصہ بلاشبہ درست ہے، حقیقت یہ ہے کہ امام احمد نے کبھی یہ بات نہیں کہی کہ قرآن کی قرأت "قدیم" ہے یا "غیر مخلوق" ہے، نہ کبھی یہ فرمایا کہ قرآن قدیم ہے، انہوں نے جو کچھ فرمایا، وہ یہ تھا کہ قرآن "غیر مخلوق" ہے، اس سے بعض علماء نے یہ نتیجہ نکالا کہ خدا کے قائم بالذات ہونے کی صورت میں جو چیز صادر ہوا سے وہ مخلوق نہیں مانتے۔ اور امام احمد کی طرف اس عقیدہ کی نسبت کہ قرآن قدیم ہے۔ یہ مجہول روایات کی بنا پر چوتھی صدی ہجری کی اُپج ہے، چنانچہ ذہبی نے امام احمد کی طرف اس نسبت کی صحت سے انکار کیا ہے۔

یہ تھا خلق قرآن کا مسئلہ، جو (جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے) صفات کے مسئلہ پر مبنی ہے۔

صفات الٰہیہ کے بارے میں امام احمد کی جو رائے تھی، اس میں نہ تاویل کی گنجائش ہے نہ تشبیہ کی، وہ خدائے تعالیٰ کو ان تمام صفات سے متصف مانتے تھے، جن کا ذکر قرآن کریم میں یا احادیث صحیحہ میں آیا ہے، مثلاً سمع، بصر، علم، کلام، حیاۃ، وغیرہ، وہ ان صفات کی کیفیت سے بحث نہیں کرتے تھے لیکن اس بات پر سختی سے قائم تھے کہ خدا کی کسی صفت میں کوئی حادث شریک نہیں ہو سکتا، جیسا کہ

ہم سلف کے مسلک کا واشگاف طور پر اعلان ہے، مذہب الشافعی وفقہاء الامصار ان القرآن کلام اللہ غیر مخلوق ومن قال مخلوق فھو کافر والقرآن حملہ جبریل مسموعا من اللہ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم سمعہ من جبریل والصحابۃ سمعوہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو الذی نتلوہ بالسنتنا وفیما بین الدفتین وما فی صدورنا مسموعا ومکتوبا ومحفوظا وکل حرف منہ کالباء کلام اللہ غیر مخلوق ومن قال مخلوقا فھو کافر (ص ۱۱۲ ج ۳ خلاصہ)

ترجمہ یہ ہے "قرآن مسموع اور محفوظ کو مخلوق کہنا کفر ہے، قرآن کریم کو حضرت جبریل نے خود اللہ تعالیٰ سے سنا ہے، ہر حرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مخلوق نہیں۔" سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کو مخلوق کہنے والوں کے متعلق سلف صالح کا یہ سخت رویہ کیا صرف ادب و تعظیم کے نقطۂ نظر سے ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ معتزلہ اور محدثین کا اس مسئلہ میں بھی اختلاف بعض دیگر مختلف فیہ مسائل کی طرح جوہری ہے، صرف نزاع لفظی نہیں — جیسا کہ آج کل مصری اہل قلم شیخ محمد عبدہٗ کی تقلید میں لکھ رہے ہیں — تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں، صحیح بخاری کی کتاب الرد علی الجہمیہ، امام بخاری کی خلق افعال العباد، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم کی تصانیف کے ابحاث متعلقہ صفات باری جل اسمہٗ۔   (حنیف بھوجیانی عفا اللہ عنہ)

خدا خود فرماتا ہے "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" (خدا کے مانند کوئی چیز نہیں، وہ سمیع و بصیر ہے)۔

امام احمد کی یہ رائے مختلف اور متنوع آراء کے ہجوم میں ایک معتدل اور درمیانی رائے کی حیثیت رکھتی ہے۔

۵۔ قیامت کے دن خدا کا دیدار

یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جو امام احمد کے زمانہ میں ابھرے۔ معتزلہ قیامت کے دن خدا کے دیدار کے منکر ہیں، اس لیے کہ رویت کا تقاضا جسمیت ہے، یعنی دیکھی وہی چیز جاتی ہے جو مجسم ہو، اور اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا جسم رکھتا ہے تو فانی اور حادث چیزوں سے خدا کی مشابہت لازم آجائے گی؛ اور اپنے بارے میں خدا فرما چکا ہے "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ"۔ قرآن کی جن آیتوں مثلاً "وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ" (کئی منہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کا دیدار حاصل کر کے تروتازہ ہوں گے) وغیرہ سے رویتِ الٰہی ثابت ہوتی ہے، معتزلہ ان کی تاویل کرتے ہیں۔

مامون نے اپنی زندگی کے آخری دور میں یہ کوشش کی تھی کہ لوگوں کو خلقِ قرآن کا عقیدہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا جائے، لیکن عدمِ رویت کے سلسلہ میں اس نے کسی قسم کی سختی نہیں کی، اگرچہ اس کی رائے یہی تھی، کیونکہ وہ معتزلی تھا، اور معتزلہ کا مسلک یہی تھا، لیکن جب واثق سریر آرائے خلافت ہوا تو اس نے خلقِ قرآن کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ [illegible] عقیدہ بھی زبردستی لوگوں کے سر منڈھنا چاہا، اور یہ صورت اس وقت تک قائم رہی، جب [illegible] خلافت متوکل کے ہاتھ میں نہیں آگئی، تب جاکر یہ مصیبت دور ہوئی اور یہ دورِ ابتلا ختم ہوا۔

امام احمد ان لوگوں میں تھے جو نصوص پر آنکھ بند کر کے ایمان لاتے ہیں اور کسی طرح کی تاویل سے کام نہیں لیتے۔ وہ قیامت کے دن دیدارِ الٰہی کے عقیدے پر کامل ایمان رکھتے تھے، چنانچہ اپنے ایک رسالہ میں جہاں وہ اہل السنت والجماعت کا عقیدہ بیان کرتے ہیں، صاف اور واشگاف الفاظ میں قیامت کے دن رویتِ باری کے عقیدہ کو جزوِ ایمان قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"قیامت کے دن رویتِ باری پر ایمان لانا ضروری ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیثِ صحاح میں مروی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار کیا، یہ بات صحیح حدیث[1] سے ثابت ہے۔ اس کی روایت قتادہ نے عکرمہ سے، انہوں نے

[1] یہ بات درست نہیں۔ امام احمد کی طرف اس روایت کی نسبت بھی مشکوک ہے، بلکہ صحیح احادیث کی رو سے

عبداللہ بن عباس سے کی ہے۔ اس طرح کی حدیث حکم بن ابان نے عکرمہ سے، انہوں نے ابن عباس سے، نیز علی بن زید نے یوسف بن مہران سے، انہوں نے ابن عباس سے کی ہے اور ہمارے نزدیک یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اس پر بحث کرنا بدعت ہے، ہم اس کے ظاہر پر ایمان رکھتے ہیں اور کسی سے مناظرہ پسند نہیں کرتے۔"[1]

اس سے ثابت ہوا کہ امام احمد قیامت کے دن رویتِ الٰہی پر ایمان رکھتے تھے، اس لیے کہ یہ بات نصوص سے ثابت ہے۔ لیکن وہ اس کھکھیڑ میں نہیں پڑتے کہ یہ رویت کس طرح کی ہوگی؟ نہ یہ سوچتے ہیں کہ رویت کے لیے جسم کا ہونا ضروری ہے، بلکہ اس مسئلہ پر مناظرہ کرنا بھی وہ بدعت خیال کرتے ہیں، وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خدا کی رویت ہوگی اور اس طرح ہوگی کہ وہ فانی چیزوں سے مشابہ نہیں ہوگی، لیکن رویت کی حقیقت اور کیفیت یہ وہ مباحث ہیں جن پر غور و فکر غیر ضروری ہے۔ امام احمد کی یہ رائے درمیانی رائے ہے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو رویت کی مکمل نفی کرتے ہیں۔ یہ بہانہ بنا کر کہ اس کا ثبوت "آحاد" سے ہوتا ہے اور ان کے خیال عقائد کے مسائل آحاد سے ثابت نہیں ہو سکتے، اور ان لوگوں کے مقابلہ میں بھی جو رویت کو اشخاص و اشیاء کی رویت کی طرح مانتے ہیں، یہی لوگ حشویہ اور مجسمہ کہلاتے ہیں۔ امام احمد کی اس صائب رائے کو جمہور مسلمین نے تسلیم کر لیا ہے۔

ہاں، امام احمد نے اس بارے میں صرف قرآن سے استدلال نہیں کیا بلکہ حدیث پر اعتماد کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دیدارِ الٰہی کے مسئلے میں قرآن کی آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

"وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ" (۷۵-۲۳)

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۶-۱۰۳)

ہے (جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے)، معراج کی رات اللہ تعالیٰ کو آنحضرت کے دیکھنے کی نفی ثابت ہے۔ یہ بحث تفسیر ابن کثیر (سورہ النجم)، اور زاد المعاد (ج ۲) وغیرہ محققین کی کتابوں میں دیکھنی چاہیے۔ حنیف

ایسے موقع پر امام احمد حدیث سے مدد لیتے تھے، چنانچہ وہ دوسری آیت میں دیدار الٰہی کی نفی کو دنیا کے لیے قرار دیتے تھے نہ کہ عقبیٰ کے لیے، ابن قتیبہ نے بھی اپنی کتاب "اختلاف اللفظ"[1] میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔

"لاتدرکہ الابصار" کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خدا کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی طرح "لن ترانی" میں جو فرمایا ہے کہ "تم مجھے نہیں دیکھ سکتے" یہ بھی دنیا کے لیے ہے لیکن یوم حساب و جزا و قصاص کے دن وہ اپنی تجلی سے لوگوں کو شاد کام کرے گا، اور وہ اسے دیکھیں گے جس طرح چاندنی رات میں چاند کو دیکھتے ہیں، حدیث رسول کتاب اللہ کی مفسر اور شارح ہے۔ رؤیت کی حدیث کی صحت سے کوئی جاہل ہی انکار کر سکتا ہے۔ کیونکہ ثقہ راویوں کی یہ حدیثیں جہاتِ کثیرہ سے ثابت ہیں، پس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ

لاتدرکہ الابصار

اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تصریح میں کہ "تم اللہ کو قیامت کے دن دیکھو گے"، ایک اہل نظر کے لیے صرف وقت کا فرق ہے۔"

یہ ہیں امام احمد کے وہ افکار و آراء جن پر فکر و تعمق کرکے دقت کے علماء کلام نے چند در چند الجھنیں پیدا کر دیں، لیکن امام صاحب اپنے مسلک پر قائم رہے، وہ یہاں بھی اسی طرح جس طرح فقہیات میں ان کا انداز رہا وہ دو باتوں پر سختی سے قائم تھے۔

۱۔ نصوص کا التزام رکھتے تھے، نہ ان سے تجاوز کرتے تھے: تاویل، عقل مجرد کی دستگیری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے وہ سنت نبوی سے مدد حاصل کرتے تھے، اسی سے قرآن کی تفسیر کرتے تھے۔

۲۔ قرآن یا حدیث میں خدا کے جن صفات کا ذکر آیا ہے اُن پر ایمان رکھتے تھے، لیکن خالق اور مخلوق کے درمیان نفی مشابہت پر زور دیتے تھے، کیونکہ خدا فرماتا ہے لیس کمثلہ شیٔ۔

---

[1] الاختلاف فی اللفظ ص ۲۳۔

امام احمدؒ اور سیاسیات

درس و تدریس میں امام احمد کا مسلک یہ تھا کہ وہ حدیث و آثار کے تبع تھے۔ وہ اس مسلک سے بال برابر بھی نہ ہٹتے تھے صحابہ اور تابعین کرام کی کثرت رائے جس طرف دیکھتے تھے اسی کو پسند کرتے تھے، اس اعتبار سے وہ اثری تھے، اور یہی ان کا وہ موقف تھا جس پر اپنی تحقیقات میں وہ سختی سے عمل پیرا رہتے تھے۔

لیکن خلافت اور خلیفہ کے معاملہ میں، یعنی یہ کہ خلیفہ کیونکر منتخب ہو، اور کون منتخب ہو، ان کا مسلک ایک حقیقت پسند شخص کا مسلک تھا۔ وہ فتنہ کو ہوا دینے سے بچتے اور اس کی کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے، وہ امام متغلب تک کی اطاعت کو اگرچہ وہ ظالم اور ستمگر ہی کیوں نہ ہو، خروج اور بغاوت پر ترجیح دیتے تھے۔

سیاسی مسائل میں امام احمد، اور امام مالکؒ کا مسلک تقریباً یکساں تھا۔ دونوں منازل صحابہ کی ترتیب اور اختیار خلیفہ کے معاملہ میں متفق الرائے تھے، دونوں اس باب میں بھی متفق تھے کہ گو خلیفۂ وقت ظالم اور ستمگر ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے خلاف خروج اور بغاوت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ خروج و بغاوت کا فتنہ پھوٹ پڑنے کی صورت میں ظلم و سفاکی کی جو صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں وہ مستبد حاکم کے ظلم سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوتی ہیں۔

ان دونوں اماموں کے مابین جو کچھ فرق تھا وہ یہ تھا کہ امام مالکؒ وہ بزرگ تھے جنہوں نے خروج و بغاوت کی فتنہ طرازیاں، انقلاب و اضطراب احوال کی کارفرمائیاں، کشمکش اور پیکار باہمی کی ہولناکیاں پیش ... دیکھی تھیں ... ان کا دور ... فتنہ کا دور تھا، اس کے برعکس امام احمد کا معاملہ یہ تھا کہ اگرچہ

ان کا دور عہد فتن نہیں تھا، اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے امین و مامون کی پیکار باہمی کے ... فتنہ نہیں دیکھا تھا لیکن اسی سے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ فتنہ خیر پر نہیں شر پر ختم ہوا تھا، اسی فتنہ ... فارسی اثر و نفوذ کو بڑھایا تھا، اسی کے باعث نئے نئے گروہ اور فرقے میدان میں نمودار ہوئے ... اسی کی وجہ سے معاملات دین میں بدعت کا آغاز ہوا، اور اس کی فرماں روائی قائم ہو گئی، اس بدعت نوازی کا انہوں نے مقابلہ بھی کیا، کوڑے کھائے، قید و بند کی سختیاں سہیں، ایک طویل اور مسلسل ابتلا سے گزرے، اور ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں انتقام و نفرت، حسد اور غصہ کے جذبات پیدا ہوئے۔ اب متوقع تھا کہ امام احمد مستبد اور بدعت نواز حاکموں کے خلاف بغاوت اور خروج کے حامی بن جاتے، لیکن ایسا نہیں ہوا، اگرچہ ان کا ذاتی احساس اس ... دمساز ہوتا، لیکن انہوں نے اپنے لیے، اور اپنی وجہ سے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ خلافت اور خروج و بغاوت کے سلسلہ میں انہوں نے حدیث و سنت اور عمل سلف سے مدد لی۔ اجتماعی مصالح، اور ... مفاد کو پیش نظر رکھا، ذاتی اور مخصوص محسوسات کو نظر انداز کیا، خروج و بغاوت کو کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کیا، خواہ خلیفہ کی ستم رانیاں کس حد تک کیوں نہ پہنچ چکی ہوں، اگرچہ وہ ان کا قائل ہی کیوں ہو۔ گو اس نے ان پر عذاب و عتاب کے کوڑے ہی کیوں نہ برسائے ہوں۔

صحابہ کا احترام

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ صحابۂ کرام، صحابۂ کرام کی ترتیب درجات، صحابہ میں سے کسی کے خلاف سب و شتم، اختیار خلیفہ کا طریقہ، خروج و بغاوت، جہاد اور اسی طرح کے دوسرے معاملات و مسائل سے متعلق امام احمد کی رائے کیا تھی؛

صحابۂ کرام کے بارے میں عمومی رائے کا جہاں تک تعلق تھا، امام احمد ان کا بے حد اجلال و احترام پیش نہاد خاطر رکھتے تھے۔ چنانچہ ان سے مروی ہے کہ صحابہ میں سے کسی صحابی کے خلاف سب و شتم کرنے والے شخص کے اسلام کو وہ مشکوک سمجھتے تھے، بلکہ سرے سے دائرۂ اسلام ہی سے خارج قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے صاحبزادے عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ:

"میں نے اپنے والد (احمد بن حنبل) سے دریافت کیا۔

فرمایا: اس شخص کو جو ابوبکرؓ، عمرؓ کے خلاف سب وشتم کرے"۔

پھر میں نے دریافت کیا:

"اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی دوسرے صحابی کے خلاف اگر کوئی شخص سب وشتم کرتا ہو، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "میں اسے مسلمان ہی نہیں سمجھتا"۔[1]

صحابی کا مفہوم امام احمد کے نزدیک بہت وسیع تھا، وہ فرماتے ہیں:

"ہر وہ شخص جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف صحبت ایک سال، یا ایک مہینہ یا ایک دن یا ایک گھنٹہ بھی حاصل کیا، اس کا شمار اصحاب رسولؐ میں ہے، اس نے خواہ کتنی ہی ذرا سی دیر کے لیے یہ شرف کیوں نہ حاصل کیا ہو۔ خواہ آپؐ کی زبان مبارک سے ایک ہی لفظ کیوں نہ سنا ہو، گو آپؐ کے سراپائے جمال پر اس نے ایک ہی نظر کیوں نہ ڈالی ہو صحابہ کا یہ گروہ ان تمام لوگوں سے افضل ہے جنہوں نے آپؐ کی زیارت نہیں کی، گو وہ کتنے ہی اعمال حسنہ کے ساتھ خدا کے حضور میں کیوں نہ حاضر ہوں، اپنے شرف صحبت نبوی کے اعتبار سے یہ لوگ جمیع تابعین پر بھی فضیلت رکھتے ہیں، اگرچہ وہ کتنے ہی اعمال خیر کے حامل کیوں نہ ہوں۔ پس جس شخص نے ان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی کی تنقیص کی، یا کسی کے خلاف اپنے دل میں بغض رکھا، وہ بدعتی ہے"۔[2]

تصریحات بالا سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو شخص اپنے دل میں صحابۂ کرام کی محبت نہ رکھتا ہو، یا ان کے خلاف سب وشتم روا رکھتا ہو وہ امام احمد کے نزدیک بدعتی ہے، اور مبتدع ان کی نظر میں متہم فی الدین ہے۔

یہ تو صحابۂ کرام کے بارے میں امام صاحب کی عمومی رائے تھی، اب رہی صحابہ کی ترتیب منازل تو اس بارے میں بھی وہ سلف صحابہ و تابعین کے متبع تھے، امام احمد کے نزدیک صحابہ کی باہمی فضیلت ان کی ترتیب پر مبنی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں، پھر حضرت عمر بن الخطابؓ، پھر حضرت عثمان بن عفانؓ۔ ان تینوں کی ترتیب فضیلت میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ان کے بعد پانچ اصحاب شوریٰ کی باری آتی ہے یعنی حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ۔ یہ سب خلافت کے اہل تھے، اور ان میں سے ہر ایک امام تھا"۔

امام احمد کے اس قول پر ابن جوزی کی تعلیق یہ ہے:

"ابن عمرؓ کہتے ہیں: ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات گرامی میں ابوبکرؓ کو پھر عمرؓ کو، پھر عثمانؓ کو افضل مانا کرتے تھے، اور ان کے بعد کسی کا ذکر نہیں کرتے تھے"۔[1]

مذکورہ اصحاب شوریٰ کے بعد امام احمد بدری صحابہ کے مہاجر طبقہ کو، پھر بدری صحابہ کے انصار گروہ کو، پھر سبقت اسلام کے اعتبار سے درجہ بدرجہ صحابہ کو فضیلت دیتے تھے۔

یہ تصریح ہم نے اس لیے پیش کی کہ امام احمد کا انداز فکر معلوم ہو سکے اور اندازہ ہو سکے کہ آپ حدیث و اثر کو کس درجہ ملحوظ خاطر رکھتے اور کس سختی کے ساتھ اس کی پیروی کرتے تھے، اگرچہ اس تفضیل پر کوئی ثمرہ مترتب نہیں ہوتا، تاہم اس کے ایک تاریخی حقیقت ہونے سے تو انکار بہرحال نہیں کیا جا سکتا۔

خلفاء راشدین کے مابین فضیلت باہمی کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کی جو رائے ہے اُسے پیش نظر رکھیے تو امام احمد کا مسلک درمیانی اور معتدل نظر آئے گا۔ ایک روایت صحیحہ کے مطابق امام ابوحنیفہؒ، عثمانؓ پر علیؓ کو فضیلت دیتے ہیں، امام مالک، ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے بعد تمام صحابہ کو مساوی قرار دیتے ہیں، اس کے برعکس امام احمد اسلام کی تلوار علیؓ کو عام لوگوں میں شمار نہیں کرتے، بلکہ عثمانؓ کے بعد اصحاب شوریٰ میں شمار کرتے ہیں، پھر اس کے بعد سبقت اسلام کے اعتبار سے فضیلت کا معیار ترتیب دیتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ امام احمد، علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت شرعیہ تسلیم کرتے ہیں اور اس کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جو علیؓ کی خلافت کو نہیں مانتا وہ گدھے سے زیادہ گمراہ ہے"۔[2] حضرت علیؓ

[1] المناقب ص ۱۶۱

حدود الٰہی کو قائم کرتے تھے، صدقہ وصول کرتے اور اُسے تقسیم کرتے تھے بلاشبہ وہ خلیفۂ برحق تھے، اصحابِ رسول اللہ صلعم ان سے راضی اور خوشنود تھے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ ان کے ساتھ جہاد کرتے تھے، ان کی معیت میں شریکِ غزوات ہوتے تھے، ان کی امامت میں حج کرتے تھے، انہیں امیر المؤمنین کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔ اس پر راضی تھے۔ اس سے کبھی انہوں نے انکار نہیں کیا۔ ہم تو انہی کے پیرو کار ہیں[1]!"

حضرت علیؓ سے عقیدت

صرف یہی نہیں امام احمد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دفاع میں پوری استقامت کے ساتھ سینہ سپر نظر آتے ہیں۔ بلکہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص حضرت علیؓ یا ان کی خلافت پر زبانِ طعن دراز کرے۔ خلیفہ متوکل کے زمانہ میں حضرت علیؓ پر طعن وایراد کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا، کیونکہ وہ ناصبی تھا۔ یہ وہ لوگ تھے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عداوت رکھتے تھے، اور ان کے خلاف ناروا، اور نا سزا باتیں منہ سے نکالا کرتے تھے، امام احمد پوری پامردی کے ساتھ ان کے اقوال کا رد کیا کرتے تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور ان کے مناقب فاش وبرملا بیان فرمایا کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"منصب خلافت سے علیؓ کی جاہ وتمکین میں اضافہ نہیں ہوا، بلکہ علیؓ کی ذات سے منصب خلافت کو تزئین وآرائش حاصل ہوئی؟"

ایک اور موقع پر حضرت علیؓ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا،

"حضرت علیؓ اہل بیت میں سے ہیں، کسی دوسرے کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔؟"

اسی طرح مناقب علیؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

"صحاح کے اسناد کے اعتبار سے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی صحابی کے وہ فضائل نہیں ثابت ہوتے جو علی رضی اللہ عنہ کے ثابت ہوتے ہیں[1]؟"

امام احمد کا یہ اندازِ فکر واضح کرتا ہے کہ گو وہ علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے جان ودل سے معترف تھے، لیکن اسی شدت سے وہ ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمانؓ کے دفاع میں بھی ثابت قدم تھے صحیح حدیثوں میں علیؓ کے جو فضائل ہیں ایک طرف وہ ان کی روایت کرتے ہیں دوسری طرف صحابہؓ کی اس ترتیب درجات پر قائم تھے جو صحابہ نے مقرر کر دی تھی، نیز اس

تجاوز کرتے تھے، نہ سرِ مو انحراف، اس معاملہ میں ان کا وہی مسلک تھا جو ان کے شیخ امام شافعی کا تھا۔ امام شافعی حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب روایت کرتے تھے، ان سے بے انتہا محبت بھی کرتے تھے، لیکن تفضیل کا جب سوال آتا تھا، تو وہ حضرت ابوبکرؓ کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان کا قول ہے: "معاملہ ہمارے جذبات کے تابع نہیں ہے:"

مشاجرات صحابہ

حضرت علیؓ کی ذات سے اس اعتقاد، اور ان کی طرف سے ہر طرح کے دفاع کے باوجود وہ حضرت علیؓ کے مخالف صحابہ کے خلاف بھی کوئی لفظ سننا گوارا نہیں کرتے تھے، اگرچہ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ حضرت علیؓ ہی حق پر تھے، ایک مرتبہ ان سے حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے مناقشہ کے بارے میں دریافت کیا گیا، فرمایا:-

"میں ان حضرات کے بارے میں اچھی بات کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتا، اللہ تعالیٰ ان سب پر رحم فرمائے، معاویہؓ، عمرو بن العاصؓ، اور ابو موسیٰ اشعریؓ، یہ سب وہ بزرگ ہیں جن کا وصف اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ" (۴۸-۲۹)

ایک ہاشمی کے سوال کا جواب

امام احمد اسے بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ اس بارے میں جدل و پیکار کا مظاہرہ کیا جائے کہ مشاجرات صحابہ کے سلسلہ میں کون برسرِ حق تھا اور کون ناحق پر؟ ایک مرتبہ ایک ہاشمی نے آپ سے مشاجرات صحابہ کے سلسلہ میں پوچھا، آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص بنو ہاشم میں سے ہے تو اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"قرآن کی یہ آیت پڑھو:-

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۲-۱۴۱)

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام احمد، حضرت علیؓ کی جلالتِ شان کے پورے طور پر قائل تھے، لیکن حضرت امیر معاویہؓ پر طعن بھی نہیں کرتے تھے۔ گو کسی فقہی مسئلہ کے بیان کے وقت حضرت علیؓ کے برحق

اس لیے کہ انہوں نے ان واقعات کی روشنی میں حضرت علیؓ کو حضرت امیر معاویہ اور خارجیوں سے پیش آئے تھے بغاوت اور خروج کے احکام استنباط کیے تھے۔ اس پر امام احمد نے فرمایا :-

"علی رضی اللہ عنہ پہلے صحابی ہیں جنہیں خروج کے ابتلا سے دوچار ہونا پڑا!"

امام احمد اس کا اقرار کرتے ہیں کہ علیؓ کو معاویہؓ کے قتال سے احکام بغاۃ مرتب کرنے میں امام شافعیؒ مورد الزام قرار نہیں دیئے جاسکتے، اس لیے کہ ان احکام سے معاویہؓ کا باغی ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ حدیث سے ثابت ہے، عمار بن یاسر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

"تجھے ایک باغی جماعت قتل کرے گی"

اور یہ معلوم ہے کہ عمار کو قتل کرنے والی جماعت حضرت امیر معاویہؓ کی جماعت تھی، لہٰذا ان کا باغی ہونا آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اثر سے متعین ہو گیا ——!

لیکن اس اعتقاد کے باوجود، امام احمد یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت تھی، لہٰذا وہ اس ذکر ہی سے اعراض کرتے تھے، اور اس مناقشہ میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بس لیے کہ وہ ہمیشہ اس راستہ پر چلتے رہے جو صحابۂ کرام کا راستہ تھا، نہ اس سے منحرف ہوئے نہ تجاوز کیا۔

خلیفہ کا انتخاب؟

اب ہم یہ بتائیں گے کہ اختیار خلیفہ کے بارے میں امام احمد کی رائے کیا تھی؟ اس سلسلہ میں امام احمد کا کوئی واضح فیصلہ ہمارے سامنے نہیں ہے، نہ اس ہیئت انتخابی کی کوئی صراحت امام احمد کے الفاظ میں موجود ہے جو خلیفہ کو منتخب کرتی ہے، ہاں ان کی رائے یہ ضرور معلوم ہوتی ہے کہ خلیفہ عادل اپنے بعد کے لیے جو نظام بنائے وہ نظام درست متصور ہو گا، ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر لفظی تصریح کے نماز کی امامت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو نامزد کر کے گویا ان کی خلافت کے لیے اس حالت میں کہ آپ مریض تھے، اشارہ کر دیا، پھر حضرت ابوبکرؓ نے مرض الموت میں اپنے بعد کے لیے حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے سات آدمیوں میں سے ایک کو منتخب کرنے کی عامۂ مسلمین کو ہدایت کر دی، چونکہ امام احمد ہمیشہ مسلک صحابہ کا اتباع کرتے تھے پس ضروری تھا کہ وہ اسی طریقہ کو صالح طریقہ تصور کرتے۔ اس لیے کہ صحابہ کا طریقہ یہی ہے۔

[illegible]

کہ اسے قبول کریں یا رد کریں، کیونکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز مصلحت پر مبنی ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ عامۂ مسلمین میں تفرقہ اور انقسام برپا ہونے سے پہلے ایک ٹھوس اور معقول تجویز سامنے آجائے۔

دوسرے فقہا کی طرح امام احمد بھی اس طریقہ کے جواز کے قائل تھے، بلکہ اسے دوسرے طریقوں پر ترجیح دیتے تھے اس لیے کہ یہ صحابہ کا مسلک تھا، یہ بات بھی ذکر کر دینی چاہیے کہ اس کے سوا، دوسرے طریقوں کے جواز کے بھی وہ قائل تھے۔

ابن حزم الاندلسی بھی اس طریقہ کو مستحسن قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس کے جواز پر تمام فقہا متفق ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں :-

"اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام میت کے زمانہ میں عقد امامت کسی دوسرے شخص کے لیے، جائز اور درست ہے، بشرطیکہ اس نامزدگی سے اس کا مقصد اپنی موت کے وقت معاملات امت کی صلاح و فلاح ہو، حرص و ہوس نہ ہو!"

اس کے بعد صورتِ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں :-

"افضل اور اصح صورت یہ ہے کہ امام اپنی پسند کے مطابق کسی شخص کو اپنا جانشین مقرر کر دے، عام اس سے کہ اس کا یہ اقدام حالت صحت میں ہو یا علالت میں، یا موت کے وقت، اس لیے کہ نص اور اجماع کی رو سے ان میں سے کسی صورت پر بھی عمل کرنے کی ممانعت نہیں ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کیا، یا حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے ساتھ کیا، یا سلیمان بن عبدالملک نے عمر بن عبدالعزیزؒ کے ساتھ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس صورت کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے سوا دوسری صورتوں کو ناپسند قرار دیتے ہیں!"

پھر آگے چل کر اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"اگر امام کا اس حالت میں انتقال ہو جائے کہ وہ اپنا جانشین معین نہ کر سکے تو پھر مناسب ہے کہ وہ شخص جو امامت کا مستحق ہو سامنے آئے اور اپنی ذات کے لیے سمع و طاعت کی لوگوں سے بیعت لے، جیسا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل عثمانؓ کے بعد کیا تھا، یا ابن زبیرؓ نے اپنی امامت کی طرف لوگوں کو دعوت دی تھی"

کے سلسلہ میں اس طریقہ کو ترجیح دیتے تھے جو حضرت ابوبکرؓ کا مسلک تھا کہ ہوا و ہوس سے کام نہ لینے والے خلیفہ کو اپنا جانشین نامزد کر دینا چاہیے بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر لوگ خلیفۂ متغلب کی اطاعت کرنے لگیں اور اس سے راضی ہوں تو وہ اس کی خلافت بھی جائز قرار دیتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کا مسلک وہی تھا جو ان کے شیخ امام شافعیؒ کا تھا، اور امامت مفضول کے بارے میں وہ جس مسلک پر قائم تھے وہ امام مالکؒ کا مسلک تھا!

چنانچہ اپنے ایک رسالہ میں وہ اس مسئلہ پر بحث و گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

" امام وقت اور خلیفۂ قائم، خواہ وہ فاسق و فاجر ہو یا نیکو کار اور پرہیزگار، اس کی اطاعت واجب ہے۔ وہ جب مسندِ خلافت پر اس طرح متمکن ہوا ہو کہ لوگ اس کی امامت پر جمع ہو گئے ہوں اور اس سے راضی ہوں، یا بزور شمشیر وہ خلیفہ بن بیٹھا ہو اور لوگ اسے امیر المومنین کہنے لگے ہوں، کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان ائمہ اور خلفاء پر طعن کرے یا اس بارے میں منازعت کرے۔ ان کی خدمت میں صدقات کا پیش کرنا جائز اور نافذ ہے۔ ان کے یا ان کے نامزد کیے ہوئے شخص کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے، جس نے ان کے پیچھے نماز پڑھ کر دوہرائی وہ بدعتی ہے، تارک آثار ہے، مخالف سنت ہے، جمعہ کی نماز میں پھر کوئی فضیلت نہیں رہ جاتی۔ اگر وہ امام کے پیچھے نہ پڑھی جائے، خواہ وہ فاسق و فاجر ہو یا نیکوکار، سنت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھو اور یقین رکھو کہ وہ ہو گئی۔ تمہارے دل میں کسی طرح کا شک نہیں گزرنا چاہیے، اور جس نے امام مسلمین کے خلاف خروج کیا، — جس پر لوگ جمع ہو گئے ہوں، اور جس کی خلافت کو ماننے لگے ہوں، خواہ یہ اقرار بہ رضا و رغبت ہو یا بہ جبر و اکراہ — تو اس شخص نے مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کے خلاف کیا، اور اگر اس خروج کی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی، تو یہ شخص جاہلیت کی موت مرا۔"

امام احمد کا سلبی موقف

یہ ہیں امام احمد کے وہ الفاظ جو خود اپنی تشریح اور تفسیر ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد طاعت اور لزوم جماعت کی تلقین کیا کرتے تھے اور خروج و بغاوت سے منع فرمایا کرتے تھے۔ پھر والیوں اور امراء کو راہ عدل و انصاف پر لانے کی کیا صورت تھی؟ انہیں ظلم و جور سے کیونکر روکا جا سکتا تھا؟ اس معاملہ میں امام صاحب کا وہی مسلک تھا جو امام مالکؒ کا تھا۔ جو یہ تھا کہ برسر اقتدار لوگوں کو نصیحت کی جائے۔ اس طرح انہیں عدل و انصاف اور اقامتِ سنت پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان سے میل ملاپ رکھتے تھے، اور ان کی بارگاہ میں پند و نصیحت کیا کرتے تھے، وہ بغیر کسی کمزوری اور تامل کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل تھے۔ اس معاملہ میں کسی طرح کی مداہنت پسند نہیں کرتے تھے اور کوئی شبہ نہیں کسی حد تک یہ طریقہ کامیاب بھی رہا۔

لیکن امام احمد کا معاملہ دوسرا تھا، وہ خلفاء اور امراء سے میل جول نہیں رکھتے تھے، نہ یہ ثابت ہے کہ انہوں نے امراء اور حکام کو ظلم سے باز رہنے، اور سنت قائم کرنے کی دعوت دی ہو۔ ان کا موقف سراسر سلبی تھا، وہ حکام و امراء سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، نہ انہیں پند و نصیحت کرنے کے خوگر تھے، وہ اس باب میں حسن بصری کی رائے پر عامل تھے، ان کا قول تھا کہ

" اگر رعیت کی اصلاح ہو جائے تو راعی لامحالہ اصلاح یافتہ ہو جائے گا۔ حاکم قوم کے رجحانات کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر قوم راہ راست پر گامزن ہو، اقامت سنت پر عامل ہو، دینی احکام پر شدت اور سختی کے ساتھ قائم ہو تو قدرتاً حاکم بھی صالح بن جانے پر مجبور ہوں گے۔"

یہی وجہ تھی کہ امام احمد کی جد و جہد اور سعی و کوشش کا مرکز صرف یہ تھا کہ سنت نبوی کا احیا ہو، وہ لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کرتے تھے، ان کے اقوال و اعمال اور گفتار و رفتار کا محور صرف یہی ایک بات تھی۔

خلافت اور قریش

امام احمد نے اس بات کی کہیں تصریح نہیں کی ہے کہ خلافت عرب کے کسی خاص گھرانے یا کسی خاص قبیلہ سے وابستہ ہے، بلکہ ان کے مجموع کلام سے جو بات ثابت ہوتی ہے یہ ہے کہ کسی طور پر بھی لوگ اگر کسی شخص کے ہاتھ پر سمع و طاعت کی بیعت کر لیں تو وہ خلیفہ ہے، خواہ وہ غیر عرب ہو یا نہ ہو، قریش سے تعلق رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، اس کی اطاعت بہر حال واجب ہے۔ اس کی سربراہی میں جہاد کرنا بھی واجب ہے، عید اور جمعہ کی نماز بھی اس کی اقتدا میں پڑھنا

واجب ہے، اس کی زیر سرپرستی تنفیذ حدود بھی واجب ہے، یہی وجہ ہے کہ احمد امامت مفضول تک کو جائز اور واجب الطاعت قرار دیتے ہیں۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسا گھرانا ہے جو از روئے سنت مزیت اور فضیلت کے لیے مخصوص ہو؟ ظاہر ہے یہ حدیث ان سے پوشیدہ نہیں تھی۔

قدموا قریشا ولا تقدموھا "قریش کو آگے بڑھاؤ خود ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو"

اور اس حدیث میں "تقدم" سے مراد خاص طور پر خلافت ہے، چنانچہ روایت ہے کہ ابراہیم حربی نے جو امام احمد کے شاگردوں میں سے تھے، ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا

"تقدم سے مراد کیا ہے؟"

اس کے جواب میں امام احمد نے ارشاد فرمایا۔

"خلافت ۔۔۔!"

اور جب امام سنت ۔۔۔ احمد بن حنبل ۔۔۔ اس حدیث سے واقف تھے تو بلاشبہ وہ اس پر عامل بھی تھے، چنانچہ ان کی یہ رائے تھی کہ خلافت کے معاملہ میں قریش دوسروں پر ترجیح رکھتے ہیں، کیونکہ لوگوں کو اس معاملہ میں ان پر تقدم حاصل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، اور یہ نہی عام ہے، لیکن امامت مفضول کو وہ اس لیے جائز قرار دیتے تھے کہ اس طرح فتنوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، نیز اس مسلک سے ان صحابۂ کرام کی پیروی بھی مقصود تھی جنہوں نے معاویہ کی امامت قبول کر لی تھی، اس طرح وہ سنت اور عمل کو جمع کرتے تھے، ۔۔۔۔ جزاہ اللہ خیراً!

لہ اس روایت کی ایک سند مرسل ہے دوسری ضعیف، بحیثیت مجموعی اس کا ثبوت مشکوک ہے دیکھو فیض القدیر شرح

امام احمد، محدث اور فقیہ کی حیثیت سے

ابن جریر الطبری نے اس بات سے انکار کیا کہ امام احمد فقیہ تھے، اور ابن قتیبہ نے انہیں محدثین میں شمار کیا ہے، فقہا میں نہیں، بہت سے لوگوں نے اسی طرح کی یا اس سے ملتی جلتی باتیں کہی ہیں لیکن اگر امام احمد کے دراسات پر ایک گہری نظر ڈالی جائے اور مسائل مختلفہ کے سلسلہ میں ان کے جو اقوال و فتاویٰ موجود ہیں، انہیں پیش نظر رکھ کر ہم بہ آسانی یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ امام احمد بہت بڑے فقیہ تھے البتہ ان کی فقہ حدیث و اثر پر مبنی تھی،

اس امر کے علاوہ کہ بہت سے علماء نے امام صاحب کو فقیہ قرار دیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک ایسا فقہی مجموعہ موجود ہے جس کی نسبت ان کی طرف ہے، اس میں سند کے ساتھ روایات مختلفہ و متحدہ موجود ہیں جو ان سے حکایت کی گئی، اور علماء نے انہیں سند قبول عطا کی ہے، اگرچہ ان میں سے بعض نے اسے گرد و غبار سے ڈھانپنے کی کوشش کی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس سعی میں کامیاب نہیں ہو سکے، اور چشم حقیقت بین ان تہ در تہ غبار انگیزیوں کے باوجود بہر حال حقیقت کا جلوہ دیکھ ہی لیتی ہے۔

امام احمد اور کتابت فقہ قابل غور بات یہ ہے کہ جب علماء عصر نے امام احمد کی فقہ کو سند قبول عطا کر دی، پھر اس غبار انگیزی کا سبب کیا ہو سکتا ہے کہ امام صاحب کی طرف اس فقہ کی نسبت صحیح ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شروع شروع میں امام احمد اپنے شاگردوں، اور سامعین کو اس بات سے منع کرتے تھے کہ [illegible]

حدیث کے علاوہ کسی اور چیز کا لکھنا لوگوں کی اپج ہے، اس لیے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ صفحۂ قرطاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام آدمیوں کے کلام کا جامع ہو؛ اس رائے کی اساس و بنیاد یہ تھی کہ امام احمد کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں دوسری چیزیں زیر کتابت لا کر لوگ علم حدیث اور آثار نبوی سے بے پروا نہ ہو جائیں، کیونکہ جب فقہاء کی آراء مدون ہوں گی اور ان کے فتوے اور فیصلے پڑھائے جائیں گے، اور استخراج مسائل کے سلسلے میں ان کی فکر و رائے لکھی جائے گی، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ علم حدیث سے بے پروائی برتیں گے، روایات و آثار کی پھر ان کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہ رہ جائے گی۔ گویا بعد میں جو کچھ رونما ہوا وہ اس سے خائف تھے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک بہت بڑا گروہ ایسا پیدا ہو گیا جو فروع مسائل میں ائمۂ فقہ کے افکار و آراء پر بھروسہ کرتے اور انہی کا درس دیتے تھے، بجائے اس کے کہ وہ حدیث و اثر کی روایت کرتے، اور اس کی پیروی کرتے، وہ اپنے اماموں اور ان کے شاگردوں و جانشینوں کی فکر و رائے کی روایت کرنے لگے۔

پھر ایک بات اور بھی یاد رکھنی چاہیے، وہ یہ کہ فقہاء اپنی تخریجات فقہی میں باہم مختلف الآراء ہیں پس اگر اختلافِ فکر و نظر کا یہ سارا مجموعہ مدون و مرتب کر لیا جائے تو لوگ چکر میں پڑ جائیں گے۔

ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

کیونکہ امام احمد کی نظر میں علم فقہ دین ہی کا ایک حصہ ہے، اور یہ بات اللہ کے دین کے شایانِ شان نہیں کہ وہ متفرق اقوال اور متصادم افکار کا مجموعہ ہو۔

یہ وجہ تھی کہ امام احمد اس بات کے سخت مخالف تھے کہ فروع فقہی کے سلسلہ میں جو بات ان کے منہ سے سنی جائے لکھ لی جائے، اسی طرح وہ اس قسم کی دوسری کتابوں کے درس و مطالعہ سے بھی منع فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا گیا کہ اہل حدیث کی ایک جماعت کتب شافعی زیر تحریر لا رہی ہے اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد ہوا:۔

"میں تو اسے درست اور مناسب نہیں سمجھتا۔"

اسی طرح ابو ثور کی کتابوں کے بارے میں آپ سے دریافت کیا گیا تو فرمایا،

البتہ امام احمد موطا امام مالک لکھنے کو جائز سمجھتے تھے، کیونکہ دراصل وہ حدیث کی کتاب ہے، اگرچہ اس میں فقہ بھی موجود ہے۔

وہ اسے بھی ناپسند کرتے تھے کہ جو فتاوے ان سے منقول ہوں ان کی زبانی نقل کی جائے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ امام احمد تک یہ بات پہنچی کہ ان کے شرکائے حلقۂ درس میں سے ایک آدمی خراسان میں ان کا نام لے لے کر روایت کیا کرتا ہے۔ یہ سن کر وہ چیخ پڑے، اور اپنے شاگردوں کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"گواہ رہنا، میں ان تمام باتوں سے رجوع کر چکا ہوں۔"[1]

نقل و روایت کی اجازت

مذکورۂ بالا واقعات جن میں فتاوی کی روایت اور کتابت سے امام احمد نے منع کیا ہے، اور حدیث کی روایت پر اکتفا کرنے کی تلقین کی ہے، اپنی جگہ پر صحیح اور درست ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے نقل اور روایت کی اجازت بھی دی ہے، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کبھی کبھی انہوں نے اپنے کسی لکھے ہوئے مسئلہ کی طرف رجوع کیا ہے اور اسے قبول بھی فرمایا ہے۔

ان دونوں باتوں میں تطبیق یوں دی جا سکتی ہے کہ اپنے صدر حیات میں تو امام احمد اس بات کے مخالف تھے کہ حدیث کے علاوہ ان سے کچھ اور نقل کیا جائے، اس لیے کہ اپنے لیے یہ بات وہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ ان کے دیئے ہوئے فتوے پھیلائے جائیں، کیونکہ ان کی رائے میں فقیہ کے لیے اتنا ایک طرح کا ابتلا تھا، وہ ایسے معاملہ میں حکم صادر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جہاں اسے کوئی نص صریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ملتی، نہ اصحاب رسول سے کوئی روایت ملتی ہے لہٰذا بغیر نص کے وہ فتویٰ دیتا ہے، اور یہ بات بغیر شدید ترین ضرورت کے امام احمد کے نزدیک جائز اور مباح نہیں تھی، اور جو بات ضرورت سے مجبور ہو کر کی جائے اسے پھیلانے اور نشر کرنے کی کوئی حاجت نہیں، یہ ایک ایسا ابتلا ہے جس میں توسع ناجائز ہے، البتہ فتویٰ اگر حدیث اور اثر پر مبنی ہو تو وہ واجب الاتباع ہے اور اس کا نشر و تشہیر دراصل حدیث نبوی کا پھیلانا اور نشر کرنا ہے، یہ تھا وہ نقطۂ نظر جس کے ماتحت آغاز میں امام احمد فتویٰ اور تحدیث کی اجازت نہیں دیتے تھے، لیکن بعد میں

[illegible]

حالات نے انہیں مجبور کردیا کہ اپنے فتاویٰ کی کتابت اور نقل کی اجازت دے دیں، نہ صرف نقل وکتابت کی بلکہ نشر کی بھی، چنانچہ امام صاحب کے ایک شاگرد عبدالملک بن عبدالحمید المیمونی المتوفی ۲۷۴ھ کہتے ہیں :-

"میں نے ابو عبداللہ (احمد بن حنبل) سے ان مسائل کے بارے میں دریافت کیا جنہیں ہم نے قلمبند کر لیا تھا، انہوں نے فرمایا

"ابوالحسن یہ تم کیا لکھتے ہو؟ اگر تمہارا پاس خاطر نہ ہوتا تو ہرگز میں تمہیں یہ چیزیں لکھنے کی اجازت نہ دیتا۔ میرے لیے حدیث رسولؐ سب سے زیادہ محبوب چیز ہے"!

یہ سن کر میں نے عرض کیا

"آپ سے یہ چیزیں نقل کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ ہمہ وقت آپؐ سے وابستہ رہتے اور احادیث لکھتے تھے۔ بعدہٗ ان صحابہ کے شاگرد بھی روایات کو قید کتابت میں لایا کرتے تھے۔

امام احمد نے پوچھا "وہ لکھنے والے کون تھے"؟

میں نے کہا "ابوہریرہ، نیز عبداللہ بن عمر بھی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے"!

امام احمد نے کہا "یہ لوگ تو حدیث لکھا کرتے تھے (دوسری کوئی شے نہیں)۔

میں نے عرض کیا "اور یہ مسائل بھی تو حدیث ہی ہیں اور حدیث ہی سے ماخوذ"[1]

اس بات سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے۔

۱ـــ امام احمد یہ بات ناپسند کرتے تھے کہ مسائل ان کی جانب منسوب کر کے نقل کیے جائیں لیکن دوسروں کے پاس خاطر سے لکھنے سے روکنے سے ہچکچاتے بھی تھے، لہٰذا جو کچھ ان سے نقل کیا گیا وہ ان کی اسی چشم پوشی کے باعث ـــ!

۲ـــ امام احمد کے اس شاگرد نے بالآخر اس باب میں اپنے استاذ کی خوشنودی حاصل کر لی اور ان کی ناپسندیدگی دور کردی، یا کم از کم اس میں کمی کردی!

[1] "المنہج الاحمد فی تراجم اصحاب الامام احمد" دار الکتب مصریہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جس کا نمبر تاریخ ـــ ۲۲۴۳ ہے۔ جزو اول ص ۲۰۰

"المنہج" میں یہ بھی مرقوم ہے کہ:-

"اسحٰق ابن منصور الکوسج المروزی المتوفی ۲۵۱ھ نے امام احمد کے کچھ مسائل نقل کیے، لیکن ان تمام مسائل سے امام صاحب نے رجوع کر لیا، پھر اسحٰق نے ان مسائل کو ایک تھیلے میں رکھا، اور اپنی پیٹھ پر رکھ لیا، اور بغداد کی طرف پا پیادہ چل پڑے اور وہاں پہنچ کر وہ تمام مسائل از سرِ نو امام احمد کی خدمت میں پیش کیے، پھر دوبارہ امام احمد نے ان کی توثیق کی اور اپنے شاگرد کی ورع واحتیاط خوب بھائی"[1]

اجازت کی وجہ

ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب ہر چیز سے پہلے اپنے آپ کو محدث ہی سمجھتے تھے، اور یہ کہ ان کے تمام فتاویٰ حدیث و آثار ہی پر مبنی ہوتے تھے لیکن جب ایسے مسائل آپ کے سامنے آئے جن کے تصفیہ میں اثر و خبر سے کوئی مدد نہ مل سکی تو اپنے اجتہاد اور رائے سے فتویٰ دینے پر مجبور ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اس خیال پر جمے رہے کہ یہ فتویٰ ضرورت کی بنا پر دیا گیا ہے، اسے یہیں تک محدود رہنا چاہیے، لہٰذا نہ یہ مناسب ہے کہ اس پر قیاس کی عمارت تعمیر کی جائے، نہ یہ مناسب ہے کہ اسے پھیلایا اور نشر کیا جائے لیکن آپ کے شاگرد نقل و کتابت پر ہمیشہ اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ بالآخر وہ اس پر رضامند ہو گئے کہ ان کے فتاویٰ قید کتابت میں لے آئے جائیں، اور انہیں لوگوں میں پھیلایا اور نشر کیا جائے، اور لوگوں کے لیے بھی یہ بہتر اور موجب فلاح ہے کہ ان میں وہ فتاویٰ رواج پائیں جو حدیث واثر سے ماخوذ ہوں، ایسے فتاویٰ ان فروع فقہیہ سے بدرجہا بہتر ہیں جن کا حدیث و آثار سے استناد کمزور ہے، نیز یہ کہ آپ کے شاگردوں کا حدیث میں وہ پایہ نہیں جو خود حضرت امام کا ہے۔

واضح رہے کہ امام صاحب کا اپنے فتاویٰ کے جمع و نقل سے روکنے پر اگرچہ بڑی طویل بحثیں کی گئیں اور بڑی بڑی جلدیں اس پر لکھی گئی ہیں جس کی وجہ سے اس پر کچھ غبار سا نظر آتا ہے، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے، اور یہ غبار بھی جو کچھ نظر آتا ہے، یہ بھی صرف امام احمد کے مرویات فقہیہ کی حد تک ہے، اور اس کے متعلق بھی یہ نگاہ میں رہے کہ یہ فقہی مجموعہ جو ان کی طرف منسوب ہے کئی نسلوں سے ایک گراں مایہ ورثہ کی طرح منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، یہ درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے

[1] "المنہج الاحمد فی تراجم اصحاب الامام احمد"!

۳۔ علمائے مذہب حنبلی کے علمی اور اصولی کارنامے

مذہب حنبلی کے اکابر رجال نے اپنے مذہب کی گراں بہا اور جلیل القدر خدمات، طالبانِ فن کے لیے انجام دی ہیں، اور اس کے افہام و تفہیم کے سلسلہ میں قابلِ تشکر کام کیا ہے، انہوں نے امام احمدؒ کے مرویات جمع کیے، اور اس پر بہت زیادہ توجہ کی، روایاتِ مختلفہ کے مابین ترجیح کا کام اور ان پر تخریج کا سلسلہ قائم کیا۔ اقوالِ مختلفہ کے مابین قوت و صحت کے اعتبار سے ترتیب قائم کی، پھر انہوں نے ضوابطِ عامہ وضع کیے، جن سے متفرق فروع کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، پھران جلیل القدر حنبلی علماء نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انہوں نے علم اصول پر بھی غور و خوض کیا، اور وہ اصول منضبط کیے جن پر فقہ حنبلی کی بنیاد و اساس قائم ہے (اور ان تمام باتوں کو گزشتہ صفحات میں ہم شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں)۔

"وجہ" کی اصطلاح امام احمدؒ کے مذہب سے متعلق ایسے احکام جن کے بارے میں امام موصوف کی کوئی نص موجود نہیں ہے، ان کے لیے علماء نے "وجہ" کی اصطلاح وضع کی ہے، یہ علماء مذہب امام احمدؒ کے ایسے فتاوی اور اقوال کو تین قسموں پر منقسم کرتے ہیں:

(۱) روایات ——— یہ پہلی قسم میں داخل ہیں، یہ وہ اقوال ہیں جو امام احمدؒ کی جانب منسوب ہیں، عام اس سے کہ یہ روایات آپس میں متفق ہوں یا مختلف، اور جو حکم اختلاف روایت کی صورت میں، صریحی عبارت کی صورت میں امام صاحبؒ سے منقول ہو، وہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔

(۲) تنبیہات ——— یہ وہ اقوال ہیں جو بہ عبارت صریحہ امام صاحب کی طرف منسوب نہیں ہیں، بلکہ امام صاحب کی عبارت سے اشارۃً مفہوم ہوتے ہیں، یا ان کے کلام سے متبادر ہوتے ہیں

جیسے سیاق حدیث کسی حکم پر دال ہوتا ہے، اور اس کی حیثیت بھی حکم منصوص علیہ کی ہوتی ہے، لیکن اس کا شمار دلالت النص یا اشارۃ النص میں ہوتا ہے، صراحۃ النص میں نہیں۔

(۳) اَوْجُہ ——— یہ امام صاحب کے اقوالِ منصوصہ نہیں ہیں، یعنی امام صاحب نے صراحۃً نہیں کہے، نہ انہیں اشارۃً فرمایا، بلکہ یہ مجتہدین اور مخرّجین کے اقوال ہیں، مذہب حنابلہ میں ان کی بھی اہمیت ہے، اور افتاء میں انہیں اصولی طور پر صحیح مانا جاتا ہے

علامہ ابن تیمیہ اصول کے مسودہ میں فرماتے ہیں:

"اَوْجُہ" (وجہ کی جمع) امام صاحب کے شاگردوں اور علمائے مذہب حنبلی میں سے اصحاب تخریج کے اقوال ہیں، یہ امام احمدؒ کے کلام، ایما، دلیل، تعلیل، یا سیاقِ کلام سے ماخوذ ہوتے ہیں، اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر یہ "اوجہ" ان لوگوں کے اقوال مانے جائیں گے جنہوں نے ان کی تخریج کی یا قیاس کیا[1]"

قیاس کی وسعت ان تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہب حنبلی میں مخرّجین کے اقوال یعنی "اوجہ" اگرچہ امام احمدؒ کے اقوال نہیں ہیں، لیکن تخریجاً وہ حنبلی مذہب کے مسائل سمجھے جاتے ہیں، گو یہ "منقول" کی قبیل سے نہیں ہوتے، اور نقل و تخریج کے مابین جو فرق ہے وہ ہم بتا چکے ہیں۔

علمائے مذہب حنبلی نے، امام صاحب کے مسائل پر قیاس کو درست مانا ہے، اگرچہ یہ قیاس کسی منصوص علیہ حکم پر کیوں نہ ہو، اور نتیجۃً یہ مخالف منصوص ہی ہو[2] گویا یہ علماء قیاس و استخراج کو احکام منصوص علیہ کے سلسلہ میں بھی جائز اور درست سمجھتے ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہب حنبلی میں تخریج کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اور یہ تخریج صرف ان احکام تک محدود نہیں ہے جن کے بارے میں امام صاحب کی رائے منقول موجود نہیں ہے، بلکہ ان مسائل تک پر حاوی ہے جن کے بارے میں امام صاحب کی رائے ماثورہ بھی موجود ہے، اور اس تخریج کے لیے یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ وہ رائے ماثورہ کے موافق ہو، اس کے مخالف بھی جا سکتی ہے

[1] ملاحظہ ہو المدخل الی مذہب الامام احمد بن حنبل ص ۵۵

[2]

البتہ اس مخالفت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اصول مذہب حنبلی کے تابع اور اس کے قواعد کے موافق، نیز امام صاحب نے استدلال کے جو مناہج وضع کیے ہیں، ان سے مطابقت رکھتی ہو۔

فقہی اقوال کی کثرت کا اچھا پہلو

مذہب حنبلی میں فقہی اقوال کی بہت زیادہ کثرت ہے، اور اس طرح بحث و کلام کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے بعض آراء امام صاحب سے ایسی بھی منقول ہیں جو باہم مختلف ہیں، اسی طرح مسائل مختلفہ میں بہت سے اقوال ان کی جانب منسوب ہیں، نیز ایسے اقوال بھی بکثرت ہیں جو ایما اور اشارات پر مبنی ہیں، اور امام صاحب کے اصحاب نے، اور ان کے بعد آنے والے علماء نے انہیں امام صاحب کے اقوال، احوال، اور افعال سمجھ لیا، اسی طرح امام صاحب کے اصحاب، اور ان کے بعد آنے والے علماء کے "اوجہ" بھی ان گنت ہیں، غرض اس طرح اقوال و اوجہ کا ایک بہت بڑا دفتر تیار ہو گیا، عام اس سے کہ یہ اقوال و اوجہ امام صاحب کی طرف منسوب ہوں، یا ان کے اقوال پر ان کی تخریج کی گئی ہو، اور اس طرح انہیں امام صاحب سے نسبت کا درجہ حاصل ہو گیا ہو، یا یہ امام صاحب کے اصحاب مجتہدین کے "اوجہ" ہوں۔ مگر مذہب حنبلی کے مجتہدین کی ہمت داد کے قابل ہے کہ انہوں نے بڑی محنت سے ان کثرت اقوال و اوجہ میں بلحاظ قوت سنت و صحت روایت موازنہ کیا۔ ضعیف کو صحیح سے پرکھا۔ قوت و ضعف دلیل سے انہیں جانچا۔ پھر اس کے بعد تصحیحات اور ترجیحات کی باری متاخرین کے عہد میں آتی ہے، اس سلسلہ میں علاء الدین القدسی کہتے ہیں:

"جاننا چاہیے، مذہب حنبلی میں ترجیح و تصحیح کا مرجع امام صاحب کے اصحاب ہیں، لہٰذا مذہب کے مسائل کے بارے میں معرفت کا انحصار انہی کے اقوال پر ہوگا"

اس کے بعد علاء الدین القدسی نے مصححین اور مرجحین کے نام گنائے ہیں اور ان کی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، اور بتایا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کی تصحیح رد کر دے، یا ان کی ترجیح کے علاوہ کسی دوسرے کی ترجیح اختیار کرے۔

لیکن القدسی کی یہ بات بلاشبہ متاخرین کی طرف سے پیدا کی ہوئی خواہ مخواہ کی تنگی ہے۔ متقدمین میں اس تنگی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا، چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ ایسی کسی تقلید کے قائل نہیں ہیں جس کی سند کتاب الٰہی، سنت رسولؐ، اور آثار سلف صالح سے نہ ملتی ہو، چنانچہ وہ

فرماتے ہیں:

"جو شخص امام احمد کے اصول و نصوص سے واقف ہے، وہ عام مسائل میں ان کے مذہب کے ترجیحی پہلو کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔"

نجم الدین الطوفی نے بھی اس باب میں علامہ ابن تیمیہؒ کی پیروی کی ہے، انہوں نے اپنی کتاب "شرح مختصر الروضہ" میں اس مسئلہ پر بحث[1] کی ہے، اور نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ کسی مذہب میں بھی ترجیح اور تصحیح کا دروازہ بند کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے، اور مذہب حنبلی میں تو ایسا کرنا قطعاً غلط اور نامناسب ہے۔

تصحیح، ترجیح، تخریج

امام احمدؒ کے اقوال کے سلسلہ میں متقدمین نے تصحیح و ترجیح کی جو روش اختیار کی تھی، اور متاخرین نے اس دروازہ کو جس طرح بند کر دیا تھا، اس سے تمام علماء متاخرین کو اتفاق نہ تھا، انہوں نے ان تصحیحات تک اپنے آپ کو مقید نہیں رکھا، بلکہ اپنے لیے تصحیح، تخریج اور ترجیح کا حق محفوظ رکھا اور اسے استعمال کیا۔

امت پر امام ابن تیمیہؒ کا احسان!

یہی وہ وسیع مشرب تھا جس نے مذہب حنبلی کو پروان چڑھایا اور اس میں نمو کی صلاحیت پیدا کی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے تلامذہ نے تو اس دروازہ کو اور زیادہ وسعت کے ساتھ کھول دیا، انہوں نے صرف ترجیح، تصحیح، اور تخریج پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اجتہاد مطلق کا دروازہ بھی خوب کھول دیا، اگرچہ امام احمدؒ کے مذہب ـــ حنبلی مذہب ـــ سے اپنا انتساب قائم رکھا، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے تلامذہ نے نہ صرف ترجیح و تصحیح و تخریج سے کام لیا، بلکہ مطلقاً اجتہاد بھی کیا، اپنے اوپر جو پابندی عائد رکھی وہ صرف یہ تھی کہ دلیل کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، اور ان اصولوں کی پابندی قائم رہے جن کی پابندی خود امام احمدؒ نے بھی اپنے اوپر عائد کر رکھی تھی، اور جنہیں استنباط و اجتہاد میں وہ ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے اور اس اولین سرچشمۂ ہدایت سے سیراب ہوئے جس سے امام احمدؒ نے سیرابی حاصل کی۔ اس طرح علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے تلامذہ ایسے نتائج تک پہنچے جنہیں فقہ کی دنیا میں بالکل جدید قرار دیا جا سکتا ہے، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ہاں تو اس طرح کی

[1] یہ پوری بحث کتاب المدخل ص ۱۸۸۔۱۸۹، مصنفہ علامہ ابن بدران دمشقی میں ہے۔ (مصنف بوحیانی)

مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً انہوں نے فتویٰ دیا کہ تین طلاقیں اگر ایک مجلس میں، تین مرتبہ دی جائیں تو وہ حکم میں ایک طلاق کے ہیں، انہوں نے یہ فتویٰ بھی دیا کہ طلاق معلق کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ وہ ایک بے معنی اور بے نتیجہ لفظ ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے فتویٰ دیا کہ غصہ کی حالت میں جو طلاق دی جائے وہ واقع نہیں ہوتی، اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے تلامذہ بہت سے مسائل میں مذاہب اربعہ سے منفرد ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے جلیل القدر شاگردوں نے تاریکی کے دور میں اجتہادِ مطلق کا پرچم بلند رکھا۔ تقلیدِ مطلق کے زمانہ میں وسعتِ نظر اور وسعتِ رائے کا معیار قائم رکھا، اس راستہ میں ان کی حیثیت مقدمۃ الجیش کی ہے، انہوں نے اس طرح دنیائے اسلام کو بہت سی نئی اور اچھی چیزیں دیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حریتِ فکر اور آزادانہ تحقیق کے داعی، حدیث و اثر کے اس مذہب میں ہی کیوں ہیں؟

اس کا جواب بالکل سادہ اور آسان ہے، حنبلی مذہب کی نفسیات ہی ایسی ہیں کہ اس سے براہِ راست کتاب و سنت و آثارِ صحابہ سے استفادہ کا جذبہ ابھرتا ہے۔ حضرت امام احمدؒ کا اندازِ تحقیق و افتاء و طرزِ استدلال و استنباط ایسا ہے کہ ان کی اتباع کرنے والا بھی اولین اہمیت ظواہر کتاب و سنت و آثار صحابہ ہی کو دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے، جس طرح امام احمدؒ قیاس کو پچھلے درجے میں رکھتے ہیں اسی طرح ان کے متبعین بھی ہر قسم کے قیاسوں — گو وہ ان کے امام ہی کے کیوں نہ ہوں — کو شدید ضرورت ہی کے موقع پر استعمال میں لاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب و سنت کی عظمت جیسی چاہیے ویسی ہی ان کے دل میں جاگزیں رہی کہ ادھر ان کا ذکر آیا اور ادھر گردنِ تسلیم خم ہوئی۔ بخلاف دوسرے مذاہب — حنفیہ وغیرہ — کے، کہ ان مذاہب والے جب اپنے اپنے امام کے مسلک کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں ایک معتد بہ حصہ قیاسات، استحسانات وغیرہ کا پاتے ہیں، اور تخریج در تخریج کی قسم کی تفریعات کی کثرت اس پر

استدلال کی حیثیت تابع کی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ حریتِ فکر ان میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔

دیکھیے، "اجتہادِ مطلق" کی طرف دعوت کا اعلان زیادہ تر علمائے حنابلہ ہی کرتے نظر آئیں گے، دوسرے درجے پر مالکی بھی ہیں، اگرچہ ان کی دعوت "اجتہادِ مقید" میں منحصر ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ ان دونوں مسلکوں کی بنیاد فتاویٔ صحابہ، اور ان ہی کے مناہج استدلال پر ہے۔ گو مالکیوں کے ہاں عملاً "رائے" کی کثرت ہے لیکن "اجتہاد" کی طرف دعوت اگر بہت ہی کم اور نادر ہے تو حنفی اور شافعی مذہبوں میں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو گا کہ تقلید اور اس پر جمے رہنے کی طرف دعوت ان ہی دونوں مذاہب کے مقلدین کا کام رہا ہے۔

علمائے حنابلہ کی گرامی قدر خدمات — علمائے حنابلہ نے اپنے مذہب کی بڑی گراں بہا خدمات انجام دیں اور اس کی نشوونما میں غیر معمولی حصہ لیا جب تفریعات میں کثرت ہوئی اور مسائل میں اضافہ ہوا تو انہوں نے اس کے لیے کلیات و ضوابط وضع کر لیے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ متاخرین فقہاء نے جب متفرق فروع و جزئیات دیکھے جو مختلف ابواب میں بکھرے ہوئے تھے تو انہوں نے متشابہ احکام، مختلف ابواب میں بکھرے ہوئے پائے تو ان تمام اشباہ و نظائر کو جمع کیا اور متعدد و متحد الفکر مسائل کے لیے علیحدہ علیحدہ عنوان کے قاعدے اور کلیات بنا دیئے۔ تاکہ پڑھنے والے کو آسانی ہو، اور تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ مسائل پر اس کو اطلاع ہو جائے۔ اس طریقے سے مذہب حنبلی کے فروع کی معرفت دشوار نہ رہی۔

سہولت اور آسانی سے قطع نظر اس طرح ایک واضح صورت سامنے آگئی، چنانچہ قواعد و ضوابط سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں نجم الدین الطوفی کی "القواعد الکبریٰ" اور "القواعد الصغریٰ" نیز حافظ ابن رجبؒ اور علاؤالدین علی بن عباس البعلی الحنبلی معروف بہ ابن اللحام، متوفی ۸۰۳ھ کی کتابیں اس فن پر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حافظ ابن رجبؒ کی معرکہ آرا کتاب — قواعد کی ان کتابوں میں سے حافظ ابن رجبؒ کی کتاب طبع ہو چکی ہے۔ صاحب کشف الظنون اس کے بارے

"یہ بڑی مفید کتاب ہے، یہ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابن رجبؒ نے علامہ ابن تیمیہ شیخ الاسلام کے متفرق قاعدوں کو صرف جمع کر دیا ہے، خود ان کی اپنی اختراع نہیں لیکن بات اس طرح نہیں ہے، خدا ان (ابن رجبؒ) پر رحم کرے، وہ ان بزرگ سے بہت اونچے تھے لے"

حافظ ابن رجبؒ نے یہ قواعد مجتہدانہ شان سے اور اس انداز سے لکھے ہیں کہ مسائل کی طرف مراجعت اصول کے ماتحت کی جاسکے، اور تاکہ وہ سب ایک لڑی میں پرو دئے جاسکیں، چنانچہ وہ کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

امابعد

"یہ قواعد مہمہ اور فوائد جمہ ایک فقیہ کے لیے مذہب کے اصول فراہم کرتے ہیں، اور فقہ کے جو مآخذ اس کی نظروں سے پوشیدہ ہیں انہیں واضح اور نمایاں کرتے ہیں، اور بہت سے بکھرے ہوئے مسائل کو ایک لڑی میں پرو دیتے ہیں"

اس کتاب میں علامہ ابن رجبؒ نے فروع کو اصل فقہی کی طرف ضابطہ اور قاعدہ کے ساتھ لوٹایا ہے، اور فروع کو منظم اور مجتمع کیا ہے، ضروری قاعدے بتائے ہیں، پھر ان کے مختلف پہلو واضح کیے ہیں، پھر تفریعات کا ذکر کیا ہے۔ خلافیات کے ذکر میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے، مشہور اور غیر مشہور کی تصریح بھی کی ہے، صحیح اور غیر صحیح کا بیان بھی اس میں موجود ہے، قواعد کے ذکر میں بھی اگر کوئی قاعدہ متفق علیہ نہیں ہے تو اختلاف کو بھی ذکر کر دیا ہے۔

اس طرح اس کتاب میں فقہی نظریات و تفریعات کا ایک گنج گراں مایہ نظر آتا ہے، اور مذہب حنبلی کے بارے میں تمام ضروری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، فروع اور جزئیات کے تمام پہلو نظر کے سامنے آجاتے ہیں، جملہ اہم تفصیلات، لاطائل مباحث سے قطع نظر کرتے ہوئے پیش نگاہ ہو جاتی ہیں، یوں سمجھیے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد انسان کے علم و نظر کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔

لے ابن نجیم حنفی نے بھی قواعد فقہ حنفی پر "الاشباہ والنظائر" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے لیکن غالباً وہ ابن رجب وغیرہ کی کتابیں سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، کیونکہ ابن رجبؒ کا زمانہ ابن نجیم سے متقدم ہے۔ ابن رجب کی وفات ۷۹۵ھ کی ہے جبکہ ابن نجیم کا زمانہ ۹۶۹ھ کا ہے۔ (حاشیہ از مصنف) واللہ اعلم۔

اہل دانش و بینش کا بیان ہے کہ یہ کتاب عجائبات دہر میں سے ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے، اس میں جامع نظریات وضع کیے گئے ہیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی کوئی ایسا مجموعہ جزئیات نہیں ہے جس کے قواعد غیر مربوط ہوں، اور جس کا ضابطۂ فکری غیر منضبط ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک جامع ضابطہ کی حامل ہے، اور فقہ حنبلی تو وہ فقہ ہے جو آثار سلف پر قائم ہے عام اس سے کہ وہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں، یا اکابر سلف سے ماخوذ اقضیہ اور فتاویٰ ہوں، کیونکہ فقہ حنبلی میں جو فتوے دیئے گئے ہیں وہ وقائع پر مبنی ہیں، مفروضات پر نہیں، اس میں جو مسائل جمع کیے گئے ہیں وہ صرف قیاسی نہیں ہیں جو علت مطردہ کے حامل ہوں۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہونا یہ چاہیے تھا کہ فقہ حنبلی ایسے منتشر جزئیات سے عبارت ہو جو باہم غیر مربوط ہوں، لیکن واقعہ یہ نہیں، بلکہ ان مظاہر خاصہ کے باوجود یہ فقہ اس خصوصیت کی حامل بھی ہے کہ اس کے قواعد مرتب اور اس کے مسائل ضوابط کے ساتھ منضبط ہیں۔ یہ ضابطے بر اعتبار سے جامع و مانع ہیں، ان میں صرف فروع ہی نہیں، ایسے احکام بھی ہیں جو مستقیم ہیں، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس فقہ میں ایسے فتاویٰ نہیں ہیں جو خیالات و آرا پر مبنی ہوں، بلکہ وہ مناہج و مسالک ثابتہ پر مبنی ہیں، جو مضبوط عناصر کے ساتھ وابستگی اور گہرا ربط رکھتے ہیں۔

اور جب فقہ حنبلی ان قواعد و ضوابط کی حامل ہے تو لازمی تھا کہ حنفی، مالکی اور شافعی فقہ میں بھی قواعد فقہیہ موجود ہوتے، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ فقہ اسلامی کے تمام مذاہب میں یہ قواعد و ضوابط موجود ہیں، مذہب مالکی میں ابن جزی کے "قواعد" اور قرافی کی "الفروق" مذہب شافعی میں عز بن عبدالسلام کے "قواعد"، مذہب حنفی میں ابن نجیم کے "اشباہ و نظائر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں قواعد سے متعلق یہ کتابیں فروع سے متعلق ربط قواعد کی قوت کے سلسلہ میں، نیز ضبط احکام اور فہم عناصر مشترکہ اور جمع اشباہ و نظائر کے اعتبار سے مختلف اور متفاوت درجات کی حامل ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے فقہی مذہب کی خصوصاً اور فقہ اسلامی کی عموماً یہ کتابیں لکھ کر بڑی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔

حنابلہ نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہونے دیا

یہ ہیں وہ حالات جو اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ فقہائے حنابلہ نے اپنی صلاحیت و استعداد صحیح

استعمال کرکے، موقف اجتہاد میں وسعت دی، فقہی نشو و نمو میں اضافہ کیا، اپنے اصولوں کی تشریح اپنے دلائل واضح اور اپنی صحت اجتہاد ثابت کرکے انہوں نے افق اجتہاد کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور کشادہ کیا، اس کے بعد انہوں نے متفرقات کو جمع کیا، مسائل منضبط کیے، اور اس طرح سبیل معرفت اور طریق تخریج کو آسان بنا دیا، اور غیر منصوص علیہ مسائل کے سلسلہ میں استنباط احکام کے کارِ دشوار کو سہل کر دیا۔

فقہائے حنابلہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہر دور میں انہوں نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا اور دوسرے مذاہب سے اس میدان میں وہ ہمیشہ آگے رہے، انہوں نے اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونے دیا، جب کہ دوسرے فقہا، حرف اپنے مسلک سے چمٹے رہنے ہی پر فخر کرتے تھے، انہوں نے اگر کتاب و سنت کے نصوص کو اپنے ائمہ کے اقوال کے مخالف پایا تو ان میں تاویل کرنا گوارا کر لیا، لیکن اقوال ائمہ سے روگردانی نہیں کی۔ غرض کہ علمائے حنابلہ نے نہ تو شریعت کی وسعت کو تنگ کیا اور نہ ہی عقل پر تالے لگائے۔ ان میں مجتہدین عموماً موجود رہے، گو ہر دور میں نہیں، اور جب مجتہدین سے ان کا کوئی زمانہ خالی نظر آتا بھی ہے تو اس کی وجہ ہمت کی پستی ہے، دعوت الی التقلید اور جمود نہیں۔

مذہب حنبلی میں علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ جیسے اکابر رجال پیدا ہوتے رہے جنہوں نے صحیح معنی میں تجدید شریعت کا فریضہ انجام دیا، تجدید سے مراد وہ مفہوم نہیں ہے جو اس لفظ سے عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دین سے بغاوت کر دی جائے اور شریعت سے آزاد ہونے کے طریقے تلاش کیے جائیں، بلکہ یہ ہے کہ اسلام کو اس کی اصلی صورت میں جلوہ گر کیا جائے، اور زندگی کے عناصر سے اس کو غذا پہنچائی جائے، اور زندگی کے واقعات و حقائق کو سامنے رکھا جائے، تشکیل فکر انتقاد اور استنباع کو ترویج حدیث سے مالا مال کیا جائے، تجدید یہ ہے کہ محدثین کی مجرد خود سے تقلید کی جائے، نہ یہ کہ متبعین کی آنکھ بند کرکے پیروی کی جائے، بلکہ تجدید کے معنی یہ ہیں کہ قدیم کو بایں طور زندہ کیا جائے کہ وہ وقائع زندگی کی جلوہ نمائی کا مظہر بن جائے، تقلید فاسد ہو کے تانے بانے سے جو جمود اختیار کرتی ہے، تجدید اس جمود کے ٹکڑے اڑا دیتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ عادات موروثہ کا نام دین نہیں ہے۔ علامہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے جلیل القدر شاگرد رشید علامہ ابن قیمؒ نے یہی کیا اور ثابت کیا ہے کہ اسلام میں مجدد ایسا ہی ہونا چاہیے۔

مذہب حنبلی کا فروغ و ذیوع

بلادِ اسلامیہ میں امام احمدؒ کے مذہب کو ماننے والوں کی تعداد کم ہی رہی ہے، یہاں تک کہ عہد ماضی میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہو، اگرچہ اس مذہب میں بڑے بڑے علماء بکثرت پیدا ہوتے رہے، ان کی قوت استنباط و استدلال کا ایک دنیا نے لوہا مانا، جس عہد میں ہمتوں کی پستی زیادہ نمایاں نظر آتی ہے اس دور میں بھی استنباط و استخراج مسائل کے سلسلہ میں علمائے حنابلہ کی حریت نفس ممتاز و درخشاں دکھائی دیتی ہے، لیکن بایں ہمہ یہ ماننا پڑے گا کہ ان تمام اوصاف و خصائص کے باوجود عوام میں اس مذہب کے ماننے والوں کی تعداد قلیل ہی رہی، چنانچہ ایسا کوئی زمانہ بھی نہیں جب ملت کے سواد اعظم کی حیثیت سے یہ روشناس ہوئے ہوں، سوا اس کے زمانۂ قریب میں انہوں نے نجد میں اور بعد ازاں حجاز میں اپنا ایک مقام پیدا کیا، لیکن بھی شروع دور میں نہیں، قرن آخر میں۔ اگرچہ ان میں بڑے صاحبان علم و فضل پیدا ہوئے لیکن عوامی اعتبار سے یہ محروم ہی رہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے کہا

(اشعار کا ترجمہ)

(۱) لوگ کہتے ہیں امام احمدؒ کا مذہب ماننے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور ہر قلیل (گروہ) حقیر ہوتا ہے۔

(۲) لیکن میں ان سے کہتا ہوں، ٹھہرو تم نے غلط کہا، تمہارا خیال باطل ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ بلند پایہ لوگ کم ہی ہوتے ہیں؟

قلت تعداد کیوں؟ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قلت تعداد کا سبب کیا ہے؟

فکر و نظر نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، چنانچہ علامہ ابن خلدون اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"امام احمد بن حنبلؒ کے مقلدین کی تعداد بہت کم ہے، اس لیے کہ مذہب حنبلی اجتہاد سے بُعد رکھتا ہے، ان کے مذہب کی اصل خبر و روایت کی معاضدت ہے، ان کی کافی تعداد شام و عراق اور نواحی بغداد میں موجود ہے، روایت حدیث اور حفظ سنت میں یہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ پر زیادہ ممتاز اور نمایاں ہیں!"

لیکن ابن خلدون کی یہ توجیہ کچھ جچتی نہیں، اس لیے کہ ان کے دعوے کی بنیاد غیر صحیح ہے، یہ بات کون مان سکتا ہے کہ حنبلی مذہب قلیل الاجتہاد ہے؟ گزشتہ اوراق میں یہ بات ہم بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ یہی وہ مذہب ہے جس نے عدم نص کی صورت میں استنباط کا دروازہ چوپٹ کھولے رکھا، یہی وہ علما ہیں جنہوں نے دنیا کے سامنے یہ حقیقت رکھی کہ اجتہادِ مطلق کا دروازہ کبھی نہیں بند ہو سکتا۔ اسی مذہب کے علماء ہیں جنہوں نے مصادر شرع سے اپنا ربط قائم رکھا، اور کتاب و سنت کے زیر سایہ استنباطِ مسائل کا کام جاری رکھا، اور کتاب و سنت کو پیش نظر رکھ کر مناسب اور موزوں احکاماتِ صالحہ وضع کیے، چنانچہ حکومتِ مصر نے جب احوال شخصیہ (پرسنل لا)، وقف، مواریث اور وصایا وغیرہ کے لیے ضابطے بنانے چاہے، تو اسے سب سے زیادہ مدد اسی مذہب سے ملی، چنانچہ اس نے حنبلی احکام کثرت سے اختیار کر لیے بلکہ ایسی چیزیں بھی اس مذہب میں پائیں جو معمول بہ حالات میں سراسر "جدید" نظر آئیں۔

اور اگر ذرا دیر کے لیے ہم ابن خلدون کے اس دعوے کو تسلیم بھی کر لیں کہ مذہب حنبلی میں اجتہاد کی گنجائش بہت قلیل ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ ان حقائق سے متناقض ہے جو اس سلسلہ میں ہم پیش کر چکے ہیں مگر یہ بات ماننے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں کہ عوام کسی فقہی مذہب کو اجتہاد کی قلت و کثرت کی بنا پر قبول کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ عوام اسی مذہب کو مانتے ہیں جس کا خوب پروپیگنڈا ہو جس کے حلقہ بگوش ارباب اقتدار و اختیار ہوں، گویا عوام انہی "بڑے" لوگوں کی پیروی کرتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ عوام کی نگاہ میں کسی مذہب کو مقبول یا نامقبول بنانے کے اسباب کچھ اور ہی ہیں، اور یہ اسباب کچھ اتفا[illegible]ت سے وابستہ ہوتے ہیں، کچھ معاشرہ کے حالات سے، اور

امام و مفتیوں کا ان سے ربط و تعلق بھی اس کی اشاعت یا عدم اشاعت کا سبب [illegible] اجتہاد کی قلت و کثرت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا، اس لیے کہ عوام نہ دلیل کو سمجھنے اور [illegible] کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ وہ کسی اجتہاد کی قوت اور ضعف سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ تو [illegible] لوگوں کی پیروی کرتے ہیں جنہیں ثقہ مانتے اور عقیدہ و عمل میں بھی سے ان کو برا سمجھتے ہیں۔

ابن خلدون کی رائے غلط ہے

ابن خلدون نے مذہب حنبلی کے قلت اتباع کا جو [illegible] بتایا ہے اسے رد کر دینے کے بعد بھی یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس مذہب کے ماننے والوں کی تعداد کم ہے، کیوں کم ہے اس میں بحث و گفتگو کرنی چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس گہر خیز مذہب کے ذیوع و اشاعت عام میں جو چیزیں رکاوٹ ثابت ہوئی ہیں ان میں ایک یہ بات بھی ہے کہ فقہ کے مذاہب اربعہ میں اس کا نمبر سب آخر میں آتا ہے، ایک اور سبب اس کی عدم اشاعت عام کا یہ ہے کہ امام احمدؒ اور ان [illegible] اتباع قرب سلطانی اور جاہ منصب سے دور بھاگتے تھے، نہ اس کی تمنا کرتے تھے، نہ اس [illegible] لیے سرگرداں رہتے تھے، نہ اپنے امام کی تقلید میں اسے پسند کرتے تھے، اس لیے کہ امام صاحب کا مسلک یہی تھا، اس کے برعکس اہل عراق کے درمیان مذہب حنفی اور اندلس مغرب اقص[illegible] میں مذہب مالکی کے نشر و اشاعت کا راز یہ ہے کہ ان کے علماء اور قضاۃ، مناصب سے گریز[illegible] نہیں رہے بلکہ ان پر فائز رہے، عوام کے درمیان مذہب حنبلی کے عدم فروغ کا ایک سبب یہ بھی ہے، گو اس مذہب کے علماء نے اجتہاد کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور اجتہاد کا فریضہ پورے خلوص نیت کے ساتھ انجام دیا۔

امام ابو حنیفہؒ کا جہاں تک تعلق ہے وہ قرب سلطان اور جاہ و منصب سے بیزار [illegible] انہیں منصب پیش کیا گیا، لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن ان کے شاگردوں [illegible] ان کی زندگی میں بھی، اور وفات کے بعد بھی منصب قضا (سرکاری عہدہ) قبول کیا، امام [illegible] نے، امام ابو حنیفہؒ کی عین حیات میں بصرہ کا منصب قضا قبول کر لیا، امام ابو یوسفؒ [illegible] امام محمدؒ ہارون رشید کے دور میں قضا کے عہدہ پر فائز رہے، امام ابو یوسفؒ دولت [illegible]

کے قاضی اول تھے، لیکن امام احمدؒ نے کبھی کوئی منصب قبول نہیں کیا، اسی طرح ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس وضعداری کو پابندی کے ساتھ نباہا اور کوئی سرکاری منصب ایک عرصۂ دراز تک نہیں قبول کیا۔

ابن عقیل حنبلی کہتے ہیں:

"اس مذہب (حنبلی) سے خود اس کے حاملین نے انصاف نہیں کیا کیونکہ جس نے بھی علم میں کمال حاصل کیا وہی زہد و ورع کو اختیار کرتے ہوئے علمی شغل ترک کر کے گوشہ نشین ہو گیا، بخلاف حنفیہ اور شافعیہ کے کہ وہ حصولِ علم کے بعد مناسب عہدوں پر فائز ہو گئے، اور اس طرح وہ عہدے ان کے درس و شغل علم اور شہرت کا سبب ہو گئے۔"[1]

ایک اور سبب عوام کے درمیان مذہب حنبلی کے عدم ذیوع و اشاعت کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ امام احمدؒ کو اپنی زندگی میں ان کے اور تبعین کو ان کی وفات کے بعد جس قسم کے حوادث و مصائب سے دوچار ہونا پڑا، انہوں نے ردعمل کے طور پر حنابلہ میں عام طور پر تعصب پیدا کر دیا۔ اور انہوں نے نہایت سخت قسم کے تعصب کا مظاہرہ شروع کر دیا، پھر عالم کے تعصب کو تو کسی نہ کسی حد تک دلیل کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے، لیکن عوام کا تعصب انہیں الفاظ کا پابند بنا دیتا ہے۔ وہ پھر مفہوم و مقاصد پر غور نہیں کرتے، الفاظ ہی پر قائم رہتے ہیں، جس طرح ہم دیکھتے ہیں، خوارج کا تعصب بھی الفاظ ہی پر قائم تھا، اور اس نے بھی قتل و غارت کی فضا پیدا کر دی تھی، اور وہ یعنی خارجی اس تعصب میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ مخالف عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں کا خون انہوں نے حلال سمجھ لیا۔

حنابلہ میں اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کا مخصوص فکر خواص سے عوام میں منتقل ہو گیا تعصب کی یہ فضا امام احمدؒ کے آخری دورِ حیات میں شروع ہو گئی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد، تو یہ بہت بڑھ گئی، بغداد اور عراق میں حضرات حنابلہ کے اس تعصب نے بڑی نازک صورت پیدا کر دی، مناقشہ اور پیکار کا موضوع خلق قرآن کا مسئلہ تھا، حنبلی عوام نے اس موضوع پر واقفیت کے بغیر جھگڑنا شروع کیا، نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جو شخص قرآن کے غیر مخلوق

[1] المناقب لابن الجوزی ص ۵۰۵ - المدخل ص ۴۰

ہونے کا قائل ہو، اس کی بات قابلِ قبول اور اگر کوئی شخص اس مسئلہ پر تردد کا اظہار کرے، گو کی غرض سے ہی کیوں نہ ہو، تو اس کی بات رد اور ناقابلِ قبول۔

علامہ ابن قتیبہ نے جو اس زمانہ میں موجود تھے، ایک رسالہ میں بتایا کہ یہ اختلاف طرح بڑھے، کیونکر انہوں نے نازک صورت اختیار کی؟ اور کس طرح ان لوگوں کے در مسئلہ نے تیزی اور شدت پیدا کی، جو اس کو جانتے تک نہ تھے۔ اور جو باتیں کرتے تھے دلیل و برہان سے خالی ہوتی تھیں، اور کیونکر محدثین جن میں علمائے حنابلہ پیش پیش تھے کی تکفیر کیا کرتے تھے اور ہر اس شخص پر بدعتی ہونے کا حکم لگا دیتے تھے جو قرآن کے بار ان کا ہم خیال نہ ہو۔

صفات کا نازک مسئلہ جب عوام حنابلہ میں جاری و ساری ہو گیا تو ان کے غلو سے گمراہ ہو گئے۔ مثلاً حشویہ، مشبہہ، مجسمہ وغیرہ۔ یہ کلامی خیالات رکھنے والے گروہ ا امام احمدؒ کی طرف ہی کرتے تھے۔ حالانکہ امام احمدؒ سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ عامۂ حنابلہ سب کے سب اسی طرح کی فاسد باتیں کیا کرتے تھے بہر حال یہ صورتِ حال پیدا اسی لیے ہوئی کہ عوام ان مسائل پر غور و خوض کرنے لگے جو ا مناسب نہ تھا۔

تاریخ کامل ابن اثیر کی شہادت فروعِ فقہیہ تک میں حنابلہ کے تشدد نے نازک صو کر دی، متعدد مواقع پر ان کے تشدد نے فتنہ و ف اختیار کر لیا، شافعیہ نے خاص طور پر ان کا مقابلہ کیا اور ان کے تشدد کی مقاومت کی، تشدد کا مرقع اس فتنہ میں نظر آتا ہے جو ۳۲۳ھ میں رونما ہوا تھا، اور جس کی تفصیل لابن اثیر میں اس طرح درج ہے:

"۳۲۳ھ میں حنابلہ کی قوت بڑھ گئی، ان کا اثر و اقتدار عوام و خواص پر قا ہو گیا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ جس کے پاس نبیذ دیکھتے تھے اسے چھین کر بہا دیتے تھ

[1] معلوم نہیں یہ کہاں تک درست ہے، حنابلہ کے مخالفین کی کتابوں میں ان امور کا انت طرف ملتا ہے ورنہ خود حنابلہ تو اسے زور سے تجسیم و تشبیہ کی تردید کرتے ہیں۔ حنیف ندوی جیانی

خاصا غلبہ حاصل کر لیا، لیکن اس مذہب کے اتباع عامہ کے اپنے تشدد اور تعصب نے وہاں اس کی رفتار ترقی روک دی، اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اس کے مقلدوں کی تعداد میں معتدبہ کمی ہو گئی۔

رہا مصر تو یہاں یہ مذہب ساتویں صدی ہجری میں پہنچا۔ سیوطیؒ اپنی کتاب حسن المحاضرہ میں حنابلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"حنابلہ دیار مصر میں بہت کم ہیں، مصر میں ان کا کوئی نشان ساتویں صدی ہجری سے پہلے نہیں ملتا، عراق سے باہر بھی چوتھی صدی ہجری سے پہلے یہ مذہب نہیں ظاہر ہوا، اس لئے کہ مصر پر عبیدیوں کی حکومت تھی، انہوں نے ائمہ مذاہب ثلاثہ کے پیروؤں کو قتل، جلاوطن اور تباہ کرنا شروع کیا اور مذہب رفض و شیعیت کو فروغ دیا، یہ کیفیت چھٹی صدی ہجری کے اواخر تک قائم رہی، اس کے بعد پھر دوسرے مذاہب کے لوگ آنے لگے۔ حنابلہ میں سے جو بزرگ سب سے پہلے پہنچے وہ عمدۃ الاحکام کے مصنف حافظ عبد الغنی مقدسی تھے"

سیوطیؒ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے حدود سے چوتھی صدی ہجری سے پہلے حنبلی مذہب نے قدم باہر نہیں نکالا تھا، پھر یہ مذہب جب مصر میں آیا تو یہاں دولت فاطمیہ کا عروج تھا، پھر ایوبی تخت حکومت پر متمکن ہوئے۔ ایوبی بادشاہ بڑے متعصب قسم کے شافعی تھے۔ انہوں نے دوسرے مذاہب سے پیکار کا سلسلہ شروع کر دیا، اور شافعی مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کو پنپنے کی اجازت نہیں دی، بجز اس صورت کے کہ وہ عوام کے دلوں میں جڑ پکڑ چکا ہو جیسے مالکی مذہب کہ اسے وہ برداشت کرنے پر مجبور ہو گئے، حنبلی مذہب کو یہ نفوذ نہیں حاصل تھا اور چوتھی صدی ہجری میں حنابلہ اور شوافع کے مابین بغداد میں معرکہ آرائیاں ہو چکی تھیں، لہٰذا اب مصر میں شافعی مذہب کے سامنے حنابلہ کا چراغ جلنا کسی طرح ممکن نہیں تھا، پھر یہ بات بھی تھی کہ مصر میں حنابلہ سے پہلے ان کے تشدد اور تعصب کی داستانیں پہنچ چکی تھیں۔

پھر جب دولت ایوبیہ زوال پذیر ہوئی تو حنبلی مذہب کو مصر میں پنپنے کا موقع ملا، خطط مقریزیہ میں ہے:

"حنبلی اور حنفی مذہب کے لیے مصر میں گنجائش اس وقت نکلی جب دولت ایوبیہ زوال پذیر ہونے لگی"۔

دوسرے ایام میں مذہب حنبلی جو پہنچا اور پھیلا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں کے ارباب اقتدار بھی اس کے حلقہ بگوش ہو گئے یا وہاں بڑی تعداد میں یہ پھیل گیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے اتباع ہمیشہ قلیل رہے۔ البتہ تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع میں اس مذہب کو بغداد میں پھیلنے اور ترقی کرنے کا خوب موقع ملا، لیکن بعد کی فتنہ جوئیوں اور جنگامہ آرائیوں نے وہاں بھی اسے شدت تعصب کے باعث زوال آشنا بنا دیا۔

علماء حنابلہ میں بہت سے لوگ دمشق میں پناہ گزیں ہو گئے، کچھ دوسرے دیار و امصار میں پہنچ گئے، ان لوگوں نے مذہب کو قائم کیا، اس کی خدمت کی، نقل و تفسیر، اور تخریج مسائل کا کام کیا۔

ماضی کی محرومی کی تلافی ہو گئی

ماضی میں یہ مذہب جلیل قلت اتباع کے باعث زیادہ پھیل نہ سکا لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عہد حاضر میں تلافی فرما دی۔ بلاد حجاز کی حکومت کا وہ سرکاری مذہب ہے، تمام قضایا اور عبادات کا فیصلہ اسی کے احکام کے مطابق ہوتا ہے، یہ خدا کی طرف سے گزشتہ محرومی کا بہت بڑا صلہ ہے، بلاد حجاز میں تمام معاملات و مسائل شریعت اسلامیہ کے مطابق نافذ ہوتے ہیں۔ شریعت کے فیصلے صرف خانگی اور ذاتی معاملات میں صادر نہیں ہوتے بلکہ حدود و قصاص کے معاملات میں بھی پورے طور پر شریعت پر عمل کیا جاتا ہے، وہاں شرعی حدود قائم ہیں اور شعائر اسلامی نمایاں ہیں، مالی معاملات سے متعلقہ مسائل بھی شریعت مطہرہ کی ماتحتی میں طے ہوتے ہیں اور یہ تمام احکام اس مذہب جلیل کی فقہ سے حاصل کیے جاتے ہیں، وہاں ربا، ہر صورت اور ہر شکل میں، خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر حرام ہے، اس میں نہ چالاکی کام آسکتی ہے نہ حکمت عملی، ظاہر و باطن ہر طرح سے ربا کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔

وہاں صدقات اسلامیہ حاصل کیے جاتے ہیں۔ مال کی زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے، خواہ وہ کھیتی باڑی کی ہو، یا جانوروں کی، یا تجارت کی، یا نقد روپے کی یہی وجہ ہے کہ وہاں کی شرعی حکومت مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہے اس کے ارکان مستحکم ہیں، ہر گوشہ اور گوشہ میں لوگ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ یہ سب سے بہتر شریعت اور نظام ہے جو خدا کی طرف سے لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے، کیفیت یہ ہے کہ لوگ جب مہذب اور متمدن ملکوں میں قدم رکھتے ہیں تو نہ ان کی جان محفوظ ہوتی ہے نہ مال، لیکن اس نظام شرعی کی بدولت صحرائے عرب میں حالت یہ ہے کہ اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے تو وہ اسے واپس مل جاتی ہے، ایک آدھ روز سے زیادہ وہ گم شدہ رہ ہی نہیں سکتی۔